

ہندستان کے مشہور  
اطباء

حکیم حافظ سید حبیب الرحمن

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi  
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ  
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ



# ہندوستان کے

## مشہور اطباء

حکیم حافظ سید حبیب الرحمن



ترقی اردو بیورونٹی دہلی

HINDUSTAN KE MASHHOOR ATIBBA  
By  
HAKIM SYED HABIBURREHMAN

132438

سنہ اشاعت اکتوبر، دسمبر — 1988 شاک 1910

© ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

پہلا ایڈیشن: 2000

قیمت: 18/ء

سلسلہ مطبوعات ترقی اردو بیورو 598

---

ناشر: ڈائریکٹر ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک 8 آر کے پورم نئی دہلی - 110066  
طابع: جے کے آفیسٹ پرنٹرز جامع مسجد دہلی.

# پیش لفظ

ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے ترقی اردو بیورو (بورڈ) قائم کیا گیا۔ اردو کے لیے کام کرنے والا یہ ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو دو دہائیوں سے مسلسل مختلف جہات میں اپنے خاص خاص منصوبوں کے ذریعہ سرگرم عمل ہے۔ اس ادارہ سے مختلف جدید اور مشرقی علوم پر مشتمل کتابیں خاصی تعداد میں سماجی ترقی، معاشی حصول، عصری تعلیمی اور معاشرہ کی دوسری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شائع کی گئی ہیں جن میں اردو کے کئی ادبی شاہکار، بنیادی متن، قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی وضاحتی فہرستیں، تکنیکی اور سائنسی علوم کی کتابیں، بچوں کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شامل ہیں۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مختصر عرصہ میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ترقی اردو بیورو نے اپنے منصوبوں میں کتابوں کی اشاعت کو خاص اہمیت دی ہے۔ کیوں کہ کتابیں علم کا سرچشمہ رہی ہیں اور بغیر علم کے انسانی تہذیب کے ارتقا کی تاریخ مکمل نہیں تصور کی جاتی۔ جدید معاشرے میں کتابوں کی اہمیت مسلم ہے۔ بیورو کے اشاعتی منصوبہ میں اردو انسائیکلو پیڈیا، ذولسانی اور اردو۔ اردو لغات بھی شامل ہیں۔

ہمارے قارئین کا خیال ہے کہ بیورو کی کتابوں کا معیار اعلیٰ پایے کا ہوتا ہے اور وہ ان کی ضرورتوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کر رہی ہیں۔ قارئین کی سہولتوں کا مزید خیال کر کے ہونے والے کتابوں کی قیمت بہت کم رکھی جاتی ہے تاکہ کتاب زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچے اور وہ اس بیش بہا علمی خزانہ سے زیادہ سے زیادہ مستفید اور مستفیض ہو سکیں۔

یہ کتاب بھی بیورو کے اشاعتی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے کہ آپ کے علمی ادبی ذوق کے تسکین کا باعث بنے گی اور آپ کی ضرورت کو پورا کرے گی۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم  
ڈائریکٹر ترقی اردو بیورو



# فہرستِ اطباء

- عرض مصنف
- 7
- 16 1. اشرف الحکماء و امام فن حکیم محمد شریف خاں۔
- 26 2. شاعرِ باکمال و بے مثل طبیب حکیم مومن خاں مومنین۔
- 48 3. حاذقِ طب و ماہرِ جنسیات حکیم محمود خاں۔
- 62 4. طبیب حاذق حکیم ابو علی محمد جعفر۔
- 71 5. تاجِ الاطباء و بانیِ ادارہ طب حکیم حاجی محمد عبدالعزیز۔
- 85 6. صوفی صاحبِ درویش و نیک اندیش حکیم سید برکات احمد ٹونگی۔
- 96 7. حاذقِ الملک مسیح الملک مسیحائے ہند حکیم حافظ محمد اجمل خاں۔
- 129 8. شاہی طبیب لقمان الحکماء حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا۔
- 142 9. تصوف و سلسلہ قادریہ کا نقیب حکیم حاجی قاضی سید کریم حسین۔
- 164 10. ممالکِ غیر میں طب یونانی کا نقیب شمسِ لاطبا، خانصاحب حکیم غلام جیلانی۔
- 173 11. اردو ادب بنگال کا تابندہ ستارہ شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن خاں۔
- 183 12. ماہرِ سرجن طبیب حکیم محمد ہادی رضا خاں ماہر۔
- 200 13. بانیِ طبّی درسگاہ علامہ حکیم احمد حسین عثمانی۔
- 209 14. شہنشاہِ تصنیفات نازش طب علامہ حکیم کبیر الدین۔
- 224 15. مجاہدینِ تحریکِ آزادی اور عظیم کانگریسی رہنما حکیم محمد اسحاق۔



- 246 16۔ پہلوان حکیم شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی۔
- 260 17۔ بھارت میں کاروان طب کاسپہ سالار ویدم شری حکیم حاجی عبدالحمید دہلی۔
- 271 18۔ اُردو کا بلند پایہ ادیب حکیم سید علی کوثر چاند پوری۔
- 283 19۔ طبی سیاست کے ترجمان حکیم شکیل احمد شمسٹی۔

## عرض مصنف

پتھروں کے ابتدائی زمانے میں عبادت گاہوں کے راہب جھاڑ پھونک کے پردے میں جڑی بوٹیاں بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ طب کی یہ ابتدائی صورت تھی۔ اس فن کو سب سے پہلے باقاعدہ اسقل بیوس نے اختیار کیا۔ اسقل بیوس حضرت ادریس علیہ السلام کے دور میں گزر رہے۔ اسقل بیوس کے بعد بے شمار دردمند انسانوں نے طب کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ یونانی طبیبوں کی تعداد کی ایک طویل فہرست ہے جو ایک طویل عرصے میں پھیلے پھولے اور بڑھے۔ وہ جواہر پرینے جو آسمان طب پر ماہ و انجم کی طرح چمکے۔ ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔  
فیثا نعوٹ۔ افلاطون۔ بقراط۔ ارسطو۔ لقمان۔ جالینوس۔

ظہور اسلام کے بعد طب نبوی سے اس فن شریف کی نشاۃ ثانیہ ہوئی۔ عرب کا مشہور طبیب حارث بن کلدہ تھا۔ رفتہ رفتہ طب کی کتب سریانی، عبرانی اور یونانی سے عربی زبان میں منتقل ہونی شروع ہو گئیں۔ اس فن کو خشووز واند سے پاک و صاف کیا گیا۔ بے شمار اضلاع ہوئے۔ طب یونانی کی درس گاہیں اور بیمارستان (اسپتال) کھلنے شروع ہو گئے۔ اس طرح طب یونان کا رواج عام ہو گیا۔ یہ سہرا ان اطباء حضرات کے سر جاتا ہے۔ بنجتیشوع۔ جبرئیل بن بنجتیشوع۔ حنین بن اسحاق۔ یوحنا بن مایوسہ۔ علی بن ابن طبری۔ جابر بن حیان۔ محمد بن زکریا رازی۔ ثابت بن قرة۔ ابوسہل مسیحی۔ ابوالقاسم زہراوی ابن الیشم۔ شیخ بوعلی سینا۔ ہر جانی۔ داؤد انطاکی۔

ہندوستان میں ویدک طریقہ علاج رائج تھا۔ مغلوں کی آمد کے ساتھ طب یونانی کا رواج بھی رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ گیلانی، حکیم علوی مان، حکیم محمد اکبر

ارزانی حکیم اعظم خان نے نہ صرف طب یونانی کو عروج پر پہنچایا۔ اپنے تجربات سے گراں قدر اضافے کئے بلکہ اپنے پیچھے بے شمار تصنیف و تالیف کا ذخیرہ بھی چھوڑا۔ فن طب یونانی کے لئے ان اطباء کی خدمات جلیل القدر اور ناقابل فراموش ہونے کی بنیادیں ہیں۔

عظیم شخصیتوں کی سوانح حیات اور ماضی کے حالات کے مطالعہ کا سب سے بڑا فائدہ انسان کو یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی فطرت اور طبیعت سے آگاہی حاصل کرتا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک ایسا وقت آجاتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے دور کی ہستیوں کو بلکہ خود اپنی ہستی کو بھی پرکھتا ہے اور اپنی قدر و قیمت کا تعین بھی کرنے لگ جاتا ہے۔

کیا قدرت نے عظیم شخصیتوں اور ہستیوں کے لئے کوئی الگ معیار اور ان کی تخلیق کے لئے کوئی الگ سانچہ بنا رکھا ہے؟ یا وہ پیدائشی طور پر عظیم ہوتی ہیں۔ یا کچھ ایسی خوبیاں اور خصوصیتیں ہیں جن کو انسان اپنا کر یا اختیار کر کے بڑا آدمی یا عظیم مرتبہ تک پہنچ سکتا ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو آٹھ ذہنوں میں ابھرتے رہتے ہیں۔ پھر سوال آتا ہے کہ آخر عظمت خود کیا شے ہے؟

عظمت وہ دولت ہے مہر قبہ نعمت ہے جو نہ تو دولت۔ نہ مایہ اور اقتدار کے پیمانے سے ناپی جاسکتی ہے اور نہ ہی جاہ و حشم کا نام عظمت ہے۔ عظمت تعداد یا کمیت کا نام نہیں بلکہ صرف کیفیت کا نام ہے۔ جو کسی انسان کے مزاج میں رچ بس جاتی ہے اور مختلف مواقع پر اس کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ جس طرح تھرمیٹر حرارت کے درجوں کا تعین کرتا ہے اسی طرح انسان کی روشنی کردار۔ گفتار سے اس کی شخصیت اور اس میں موجود عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تاریخ کے مطالعہ اور خاص کر اپنے اسلاف کے کارناموں کا مطالعہ کرنے سے ذہن و جسم انسانی نہ صرف اس سے اتنا متاثر ہوتا ہے بلکہ اس ماحول۔ حالات کے مطابق خود کو بنانے میں۔ ڈھالنے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کی گراں قدر۔ گراں مایہ ہستیاں اپنے اندر جس وصف کو جذب کرتی رہیں اور مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے اس کا اظہار کرتی رہیں

ہیں۔ وہ صرف تاریخ کے مطالعہ اور اس کے اثرات کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکتے ہیں۔ بڑے آدمیوں کے اوصاف کیا ہوتے ہیں۔ شجاعت۔ عدل۔ انصاف۔ سخاوت۔ شرافت۔ حسن اخلاق اور جذبہ فیض رسانی۔ ان ہی اوصاف سے کسی بھی بشر انسانی کی عظمت کی تکمیل ہوتی ہے۔ عظمت انفرادی ہو یا اجتماعی۔ میدان زندگی میں صرف وہی افراد اور قومیں عظمت حاصل کر سکتی ہیں جو اوصافِ حسنہ کو اپنے اندر جذب کرنے کا مادہ رکھتی ہیں۔ دوسرے معنوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صرف ان ہی اشخاص کو بقائے دوام حاصل ہوتا ہے جو اعلیٰ اخلاق اور پاک اوصاف کے مالک ہوتے ہیں۔ جو صرف اپنے لئے نہیں جیتتے بلکہ دوسروں کے لئے مرتے اور جیتتے ہیں۔ اور خلقِ خدا کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے ہیں۔

سزین ہند میں طب کی ایسی بے شمار صاحب کمال ہستیاں گزری ہیں جن سے صاحب نظر و شعور عقیدت کاملہ رکھتے ہیں اور ان کے کاموں کو نہ صرف درسیات میں بلکہ سبق آموز انداز میں بھی بیان کرتے رہتے ہیں۔ حقیقت میں اپنے اسلاف کے کارناموں سے کما حقہ واقفیت اور ان سے عقیدت و محبت کا اظہار ہی کسی قوم کے زندہ و تابندہ ہونے کا ثبوت ہوا کرتا ہے۔

”ہندوستان کے مشہور حکماء“ اسی سلسلے کی کڑی سے تاکہ آنے والی نسلیں اور موجودہ قوم بخوبی طور پر ان کے کمالات سے آگاہ ہو سکے۔ اور یہاں کے سماج میں اپنا امتیاز اور اعلیٰ معیار اور طرز زندگی قائم رکھ سکے۔

دنیا میں علوم و فنون کی یہ تاریخ ہے کہ جب جب یہ فن یا علم نسل در نسل ترقی کرتا ہے یا چلتا ہے تو وہ فن یا علم خاندانی اثرات سے ترقی کی منازل طے کرتا جاتا ہے اور اس خاندان کو اس فن یا پیشہ کی بنا پر اس سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح شہنشاہیت ہو یا کسی حیثیت کا ذاتی اقتدار۔ علم و ہنر ہو یا کسی طرح کا فن یہ کبھی ایک ہی فرد پر ختم ہو جاتا ہے اور کبھی پشت در پشت اور پڑھی در پڑھی چلتا ہے۔ فن طب میں بھی دنیا میں ایسے ہی واقعات پیش آئے ہیں کہ کبھی ایک فرد تک یہ فن محدود رہا۔ جیسے جالینوس، حکیم ذکریا رازی۔

حکیم بوعلی سینا وغیرہ وغیرہ اور کبھی نسلوں تک یہ فن چلتا رہا۔ جیسے خاندان قرہ خاندان استفلیوس خاندان بختیشوع اور خاندان حنین وغیرہ۔

اسی طرح ہندوستان میں جہاں دیگر شعبہ ہائے زندگی میں مختلف خاندان اور افراد نمایاں رہے ہیں وہیں فن طبابت میں خاندان شریفی۔ خاندان بقائی۔ اور خاندان عزیزی نمایاں حیثیت کے حامل رہے ہیں۔

## خاندان شریفی

ہندوستان کی تاریخ طب جب مکمل طور پر ترتیب دی جائے گی تو خاندان شریفی کے نمایاں تذکرے کے بغیر یہ تاریخ طب ادھوری اور غیر مکمل ہوگی۔ خاندان شریفی ہندوستان کا وہ مایہ ناز خاندان ہے جس نے ہندوستان میں فن طب کو جلا بخشی۔

خاندان شریفی کے آباء و اجداد ترکستان کے مشہور شہر کاشغر کے رہنے والے تھے۔ جب شہنشاہ بابر نے ۱۵۲۶ء میں ہندوستان پر حملہ کیا تو اس خاندان نے بھی بابر کی رفاقت کی اور شہنشاہ کے ساتھ تمام حملوں میں شریک رہا۔ اس خاندان کے بزرگ جو ہزار سواروں پر مشتمل فوج پر سردار تھے اور خواجہ عبید اللہ احرار کے نسب سے تھے جن کا سلسلہ نسب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ اور خواجہ عبید اللہ احرار کا خاندان کا شمار ائمہ دین میں کیا جاتا تھا۔

شہنشاہ بابر کی کامیابیوں کے بعد یہ خاندان یہیں مقیم ہو گیا اور سلطنت کے امور مجہد یا امور سلطنت میں حصہ لیتا رہا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد اس خاندان کے جانشینوں کی توجہ سیاست سے زیادہ مذہب کی جانب مبذول ہو گئی چنانچہ اس خاندان کے دو مشہور بزرگ خواجہ محمد ہاشم اور خواجہ محمد قاسم درویش گزرے ہیں۔

خواجہ محمد ہاشم اور خواجہ محمد قاسم حیدرآباد میں مقیم ہو گئے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے زہد و تقویٰ کا سندھ میں عام چرچا تھا اور صرف مسلمان

ہی ان دونوں بھائیوں کے حلقہ مریدین میں شامل نہ تھے بلکہ اپنی ہنود بھی ان کے جاہ و جلال و بزرگی کے بہت زیادہ معترف اور عقیدت مند تھے۔ ان کی نیکی۔ بے غرضی اور خاموش دعوت سینکڑوں کی اصلاح کا باعث ہوئی۔ خواجہ محمد باشم اور خواجہ محمد قاسم کے بعد ملا علی قاری نے اس خاندان میں خاصی شہرت حاصل کی۔ ملا علی قاری کی علمی۔ مذہبی ادبی و تاریخی قابلیت۔ ان کی تصنیفات و تالیفات سے ظاہر ہیں۔ جو آج بھی ارباب علم و دانش و مذہب کو فیضان پہنچا رہی ہیں۔

حکیم اجمل خان یا خاندان شریفی کے شجرہ نسب پر سب سے بڑی سند خود حکیم محمود خان اعظم کی ایک تحریر ہے جو خود ان کی اپنی ہی لکھی ہوئی ہے۔ لکھا ہے کہ :-

”مکتوف خاطر باد کتابیکہ در آں سلسلہ خاندانی درج بود سنگام تقسیم کتب خانہ جدی (حکیم محمد شریف خان) کہ بہ پیش پسران منقسم شدہ بود در حصہ عمومی صاحب کلرن حکیم محمد اشرف خان مرحوم رفتہ و از آں جا بمعرض تلف درآمد لہذا از ضبط تحریر حال ابتدائی خاندانی معذور ماندم۔“

بابر کی بڑی کامیابی یہ نہ تھی جو اسے میدان پانی پت میں ملی تھی بلکہ ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ اس کے حملے کے وقت جو ساتھی اور رفقاء ہندوستان آئے اور اپنی تہذیب اور اپنے علوم و تمدن کا سرمایہ بھی اپنے ساتھ لائے۔ ان ہی کے سرمایہ سے ہندوستان کی ایک جدید اور مشترک تہذیب کا نقشہ مکمل ہوا۔ اگرچہ اس خاندان نے سیاست اور مذہب میں خاص مقام حاصل کر لیا تھا لیکن ان کی اصل کارکردگی کا میدان عمل ابھی تک ان کے کارہائے نمایاں سے خالی تھا۔

اپنے خاندان کے سلسلہ نسب کے بارے میں خود حکیم اجمل خاں کے بقول ملا علی ہی اس دور میں خاندان شریفی کے مورث اعلیٰ تھے اور وہ اکبر اعظم کے عہد میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے تھے۔ اکبر اعظم ہی کے دور میں اس خاندان کا

تعلق دربار شاہی سے قائم ہوا چنانچہ اس کے بعد شاہ عالم کے زمانے تک ہر دور میں اس خاندان کا ایک نہ ایک فرد دربار شاہی سے وابستہ رہا۔ ملا علی قاری کے علم و فضل نے ان کے خاندان میں طب یونانی کے فضل و کمال کی راہ اختیار کی۔ ملا علی قاری اور ملا علی داؤد کے والد سلطان محمد ہرات کے رہنے والے تھے۔ انہی ملا علی قاری کے پوتے حکیم فاضل خان نے سب سے پہلے میدان طبابت میں قدم رکھا اور تھوڑے ہی عرصے میں وقار حاصل کر لیا۔ جن کے بعد اس خاندان میں ان کے لڑکے حکیم واصل خان اول ان کے لڑکے حکیم اجمل خان اول حکیم اجمل خان اول کے بھائی حکیم اکل خان اس سلسلے کی درمیانی کڑیاں ہیں حکیم اکل خان کے صاحبزادے حکیم شریف خان حکیم صادق علی خان حکیم محمود خان حکیم عبدالمجید خان اور حکیم واصل خان جیسے نامور اور قابل طبیب پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی خاندانی روایات کو زندہ رکھا اور یہ سب اپنے علم و فضل میں آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔

سب سے اہم بات ان بزرگوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی رہی کہ وہ ہمیشہ اپنے خاندانی روایات و دستور کو برقرار رکھنے کی سعی کرتے رہے۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنے آباؤ اجداد کے وطن ترکستان سے تعلق برقرار رکھنے کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔

اکبر کے زمانے میں یہ خاندان آگرہ آکر مقیم ہو گیا تھا۔ فاضل خان کے بڑے بیٹے حکیم محمد واصل خان اول عہد عالمگیری میں اکبر آباد (آگرہ سے) دہلی آئے اور اورنگ زیب کے آخری زمانے میں دربار کے عہد طبابت پر فائز ہوئے جہاں شہنشاہ عالمگیر نے خطاب اور منصب ہزاری کے علاوہ جاگیرات بھی عطا فرمائی تھیں۔

یہ تھا خاندان شریفی کا جاہ و جلال اور سلسلہ نسب۔

# شجرہ خاندان شریفی

حکیم شریف خان ①

حکیم اشرف خان | حکیم شرف الدین خان | حکیم حسین بخش خان | حکیم حسن بخش خان

حکیم امام الدین خان | حکیم صادق علی خان ②

حکیم غلام محمد خان | حکیم غلام محمود خان ③ | حکیم غلام ابراہیم تھانی خان

حکیم عبد المجید خان | حکیم واصل خان | حکیم حاکم اجمل خان ④

مسیح الملک | ثانی حکیم محمد احمد خان | حکیم حازق الملک ظفر علی خان | مسیح الملک حکیم جمیل خان ⑤

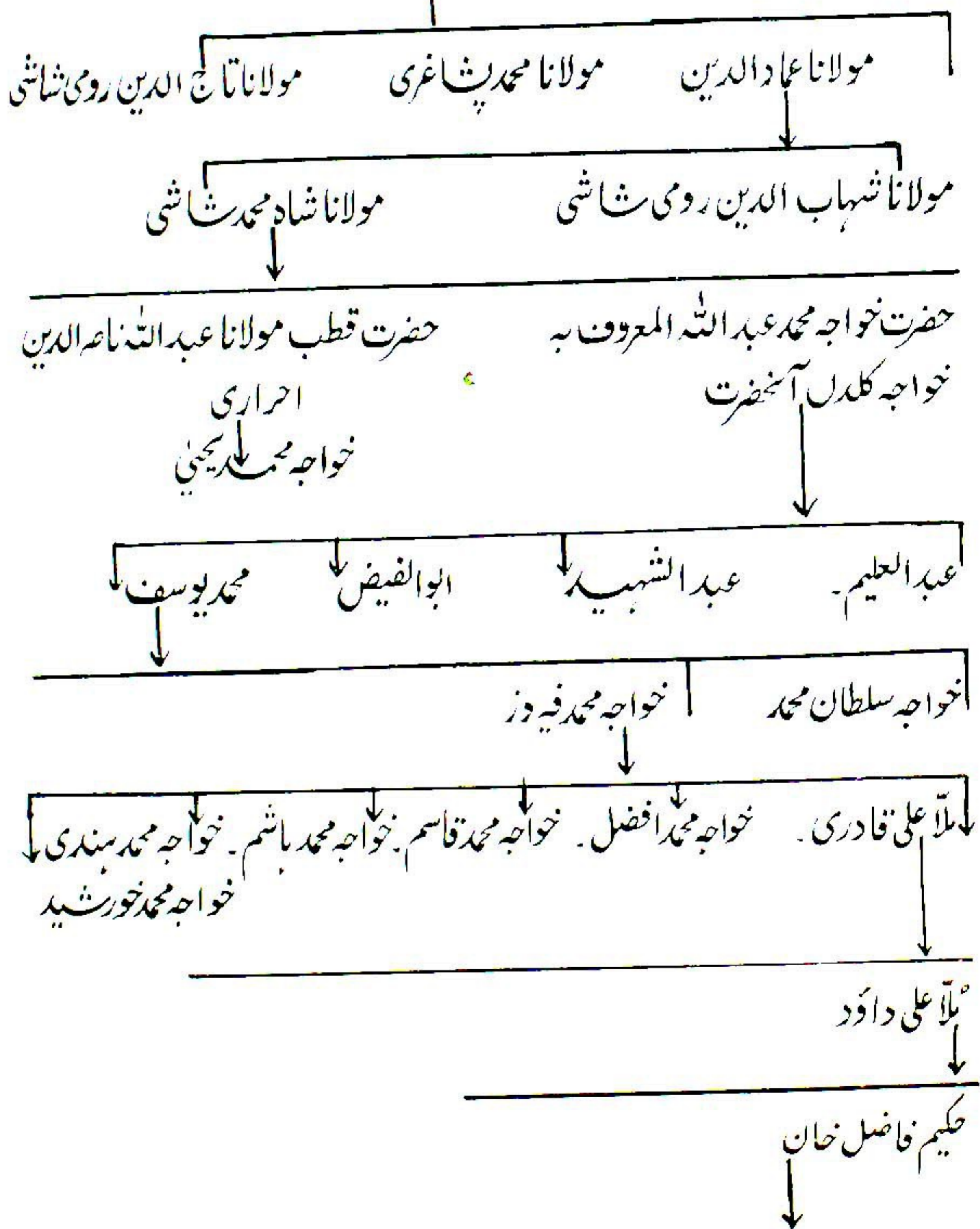
حکیم محمد نبی خان جمال سوید الاہور پاکستان ⑥ | حکیم احمد نبی خان فیض آباد پاکستان

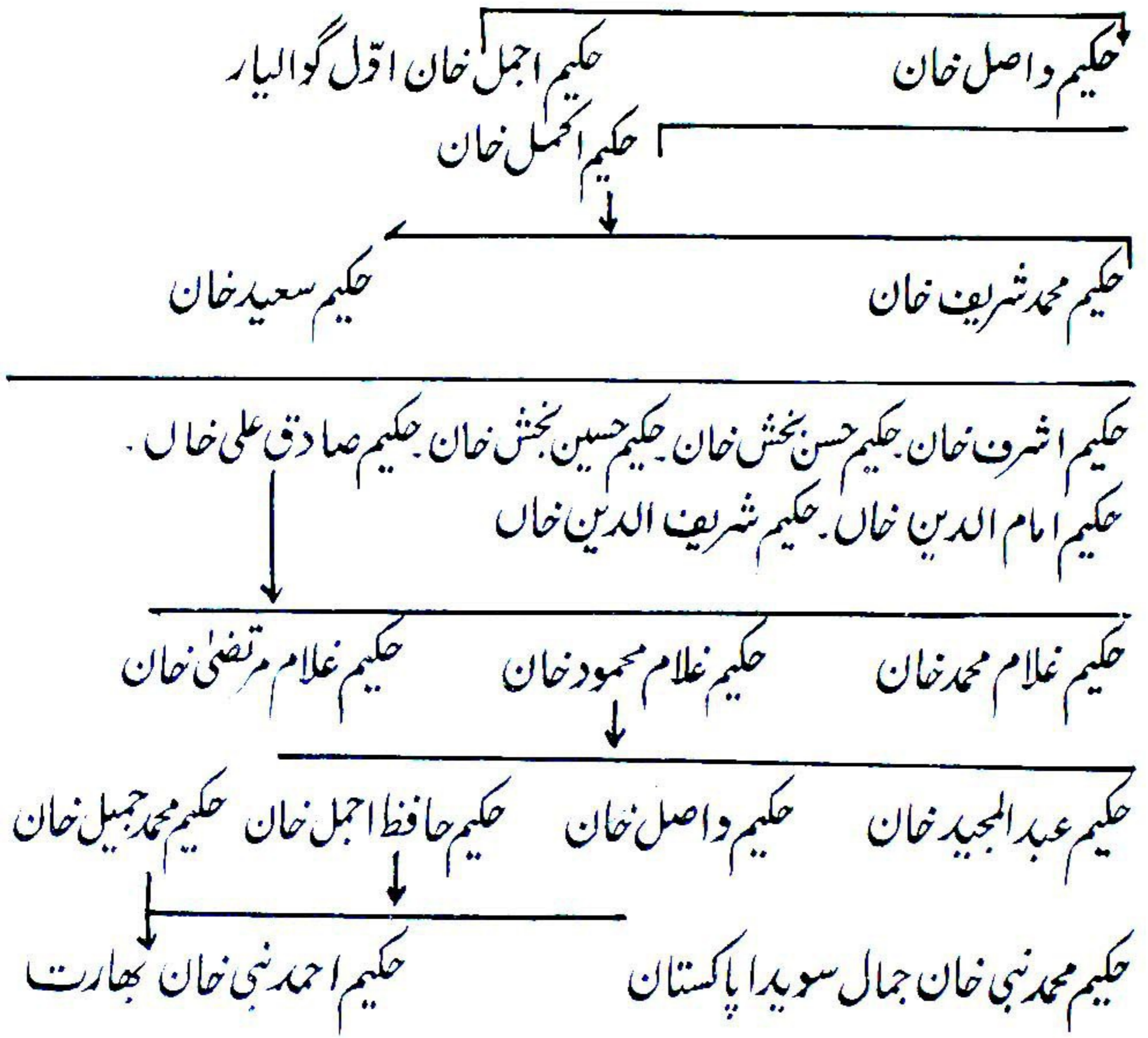


# شجره خاندان شرفی ۱

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

خواجہ محمد النامی ۱





# اشرف الحکماء و امام فن حکیم محمد شریف بھان

۱۱۳۸ھ مطابق ۱۷۱۳ء ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۷۹۸ء

خاندان شریفی کے اصل بانی حکیم فاضل خان تھے لیکن یہ خاندان اپنے اصل کمالات جوہر کی بنا پر حکیم شریف خان کے نام سے موسوم ہوا۔ جس طرح ادھکے طبّی خانوادے کے بانی حکیم یعقوب تھے لیکن خاندان حکیم محمد عبدالعزیز کے نام سے خاندان عزیزی موسوم ہوا۔

جس کی بنیادی وجہ ان اطباء کے کارہائے نمایاں تھے۔ حکیم محمد شریف خان اگرچہ حکیم فاضل خان کے بعد چوتھی پشت میں تشریف لائے لیکن گراں قدر طبی خدمات کی وجہ سے انہی کے نام سے ان کے خاندان نے ہندوستان گیر نہیں بلکہ عالمگیر شہرت حاصل کی۔ دہلی کا یہی وہ قابل فخر خاندان ہے جس نے مسلسل بہت سے نامی گرامی اور مایہ ناز اطباء پیدا کئے اور آج نو (۹) پشت کے بعد بھی طبابت کا سلسلہ جاری ہے۔

خاندان :-

تاریخی حیثیت سے حکیم محمد شریف خان کے آباء و اجداد شہنشاہ بابر کے ساتھ بسلسلہ فتوحات ہند۔ ابتدا میں بحیثیت پیر و مرشد کے وابستہ رہے تھے بعد میں جب نفی تعداد زیادہ ہو گئی تو کچھ نے فوج میں تعلیم حاصل کر کے شمولیت اختیار کر لی۔ چند فن طبابت سے وابستہ ہو گئے اور کچھ اپنے سابقہ طریقے پر



حکیم شریف خان یانی خاندان شریفی

جسے رہے۔

اس خاندان میں سب سے پہلے ملا علی داؤد کے فرزند جناب حکیم محمد فاضل خان صاحب نے فن طب میں مہارت اور شہرت حاصل کی۔ انھوں نے سلطنت سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ زندگی بھر اپنا آزادانہ مطب کر کے خلق اللہ کو فائدہ پہنچاتے رہے۔ ان کے اکلوتے بیٹے حکیم محمد واصل خان اول نے ان کے بعد خاندانی وقار کو بڑی آن بان سے قائم رکھا۔ اور اپنی وفات کے بعد دو فرزند چھوڑے۔ حکیم محمد اکمل خان اور حکیم محمد اجمل خان اول۔

حکیم محمد اکمل نے علاج و معالجہ میں بڑا نام پیدا کیا اور کمال فن کی وجہ سے دربار شاہی سے ان کو حاذق الملک کا خطاب عطا ہوا۔

حکیم محمد شریف خان انہی حاذق الملک حکیم محمد اکمل خان کے لائق و فائق بیٹے ہیں۔ جن کے نام پر طب یونانی کی تاریخ میں ان کا خاندان انہی کے نام سے موسوم ہوا۔

پیدائش :-

خاندان مغلیہ کے دورِ اخیر میں محمد شاہ کی حکومت کے ابتدائی دور یعنی ۱۱۳۸ھ مطابق ۱۷۲۵ء میں حکیم محمد شریف خان تولد ہوئے

تعلیم و تربیت :-

ابتدائی تعلیم و تربیت حسب دستور زمانہ گھر کے علمی، ادبی اور سب سے بڑھ کر مذہبی ماحول میں ہوئی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کی تکمیل کے لئے مشہور عالم شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے خاندان کے علماء کے سامنے زانوئے ادب میں سرخم کیا۔ فارسی و عربی نیز دیگر علوم و فنون مرّوجہ کے بعد طب کی تعلیم کے لئے اپنے لائق و فائق باپ کے علاوہ اپنے عاقل و فاضل چچا سے رجوع ہوئے یہی نہیں۔ حسب فرمائش والد بزرگوار کے مزید تعلیم طب کے لئے حکیم عابد سرہندی اور اپنے وقت کے مایہ ناز طبیب حکیم اچھے صاحب کے سامنے بھی سر تسلیم خم کیا۔

## خدمات :-

اس خاندان کی طبی حیثیت حکیم شریف خان کے زمانے میں بہت ممتاز ہو گئی تھی۔ اور حکیم شریف خان کا شمار بعہد محمد شاہ ایک فاضل و کامل طبیب اور ماہیہ ناز عالم کے ہو گیا تھا۔ یہ اپنے والد حکیم محمد اکمل خان کی بسند کے حقیقی جانشین ثابت ہوئے اور اپنی خداداد صلاحیت سے اس فن اور بسندِ والد کو بلند تر کیا۔ دربار شاہی میں اثر و رسوخ اپنے کمال فن اور معراجِ طب کی وجہ سے حاصل کر کے انشرف الحکماء کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ ساری حیات انھوں نے طب کی ترقی اور اصلاح کے لئے کوششیں کیں۔

حکیم محمود خان نے اپنی یادداشت میں خود اپنے قلم سے تحریر کیا ہے کہ ”ان کے جد امجد حکیم محمد شریف خان کو پانی پت اور ڈاسنہ کے علاقوں میں ۲۵ ہزار کی جاگیر ملی تھی۔“

حکیم شریف خان کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب خاندانِ تختِ مغلیہ میں گھن لگ چکا تھا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ سے فرنگی اقتدار نے سرزمین ہند پر اپنے نیچے گاڑنا شروع کر دیئے تھے اور پانچ تختِ دہلی پر اس وقت مرہٹوں کا غلبہ تھا۔ اور صرف کہنے کو حکومتِ مغلیہ کی سلطنت تھی۔ دربارِ دہلی پر مرہٹوں کی پکڑ اس وقت اتنی زیادہ تھی کہ حکیم محمد شریف خان کو پانی پت اور ڈاسنہ میں ۲۵ ہزار کی جو جاگیر شاہ عالم سے ملی تھی اس پر بادشاہ وقت کی مہر کے اندر ”مادھوراؤ سندھیا“ کا نام وکیلِ مطلق۔ مختار الملک۔ عمدۃ الامرا“ اور ”فدوی شاہ عالم بادشاہ نمازی“ کے عنوان سے درج ہے وہ ۲۷ سال جلوس یعنی ۱۷۸۶ء تحریر ہے۔

علاوہ تحریری تصنیفی۔ مذہبی طبی۔ اخلاقی کے فنی کمالات میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ زندہ جاوید یہ ہے کہ انھوں نے سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ دورانِ دہلی سے کام لیتے ہوئے طبِ یونانی کو بربادی سے بڑی حد تک محفوظ کر لیا۔ اور یہ خیال کر کے کہ اب شاہی دربار کی سرپرستی سے فنِ طب محروم ہو گیا ہے انھوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ اب کیا طریقہ کار ہو سکتا ہے کہ دربار شاہی

کی سہ پرستی کے سوا بھی طب یونانی کو کسی طرح باقی رکھا جاسکتا ہے۔  
 حکیم شہینہ خان اور ان کی طبی حیثیت کا ذکر سہ سید کی تصنیف آثار الصنادید  
 کے علاوہ کسی تاریخ میں مکمل و مفصل نہیں ملتا ہے۔ دیگر تصنیف فحوت الناظرین میں  
 دور مغلیہ کے حالات شروع تا آخر تک ملتے ہیں۔ لیکن حکیم شہینہ خان کے حالات  
 زیادہ تفصیل سے کہیں بھی نظر نواز نہیں ہوتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ  
 صاحب تاریخ ان سے اس قدر روشناس نہ ہوا ہو اور ان کو اس قابل نہ سمجھتا  
 ہو کہ ان کا ذکر نمایاں حیثیت سے کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور تاریخ داں اور  
 مصلح قوم سہ سید نے بھی حکیم شہینہ خان کی فنی خوبیوں طبی قابلیت کے ساتھ  
 طبیب عازق ہونے کا نو ذکر کیا ہے لیکن انھیں شاہی طبیب کی حیثیت سے نہیں  
 گردانا ہے۔

شاہ عالم ثانی نے ان کو جو سند توصیفی اور جاگہ عطا کی تھی بہت ممکن ہے کہ  
 شاہ عالم ثانی نے یہ سب حکیم محمد شہینہ خان کی علمی قابلیت اور حکیم محمد شہینہ خان  
 کا اپنی تصانیف و کتاب تحفہ عالم شاہی یا ”خواص الجوائد کا انتساب شاہ عالم ثانی  
 کے نام کی بنا رہی ہو۔ یعنی خطاب اور سند توصیف کا سبب عقیدت مصنف یا  
 انتساب کتاب بادشاہ وقت ہو۔

حکیم شہینہ خان اپنے وقت کے جید بزرگ، محدث، فقیہ، اور گمانہ فرکار  
 طبیب تھے۔ انھوں نے فن طب میں ایک نئی روح پھونکی اور فن طب کو ایک نئی  
 زندگی عطا کی۔

تاریخ میں اتنے بڑے حکیم کے حالات تفصیل سے کہیں نہیں ملتے ہیں سوائے  
 ایک دو تاریخ کی کتب کے۔ اس کی نمایاں وجہ تاریخ بتانے سے بھی قاصد ہے۔  
 سہ سید نے اپنی مشہور تصنیف تاریخی ”آثار الصنادید“ میں جو پہلی بار  
 ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں زیور طباعت سے مزیں ہوئی تھی، صرف ضمنی طور پر  
 حکیم صادق علی خان کے تذکرے میں ان کا ذکر خیر کیا ہے۔

”وہ اپنے عہد میں سرآمد حکماء اور سہ حلقہ اطباء تھے۔ آج تک ان کے  
 کمالات کا شہرہ گنبد دوار میں از بس بلند ہے۔ جالینوس اور اسطو کا غلط

اس کے سامنے ایسا ہے جیسا طوطی کی آواز نقار خانے میں اور فی الحقیقت اس روزگار کے اکثر اطباء نامی انہی کی نسبت شاگردی سے بہ مایہ اعتبار کار رکھتے ہیں۔ ص ۱۲

حکیم شریف خان نے ویدک کا بھی مطالعہ کیا تھا اور اس فن پر بھی متعدد کتا ہیں لکھی تھیں۔ انہوں نے بعض ویدک مرکبات و کشتہ جات کو طب یونانی میں شامل کیا اور بعض دیسی بوٹیوں کو بھی اس فن میں شامل کر دیا تھا۔

تصانیف :-

حکیم محمد شریف خان نے مختلف علوم و فنون کے ساتھ طب - مذہب - اور فن ویدک پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔

حکیم شریف خان نے فن طب کی مایہ ناز تصنیف "علاج الامراض" کی وجہ سے نہ صرف اپنے کو بلکہ اپنے لائق و فائق مصنف کو بھی ہمیشہ ہمیش کے لئے زندہ جاوید کر دیا۔ اور جو آج بھی اتنا وقفہ گزر جانے کے باوجود طب کی بنیادی کتاب شمار کی جاتی ہے۔ اور جس کو حکیم و اصل نہ ان اول نے تحریر کرنا شروع کیا تھا حکیم شریف خان نے تکمیل تک پہنچایا۔

ان کی طب کی تصانیف کی تعداد سات ہے جو اپنی حیثیت اور اہمیت میں مستحکم

ے  
طب کے علاوہ جہاں دیگر علوم میں ان کی تصانیف ملتی ہیں وہاں کلام مجیب کا ترجمہ انہوں نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کیا تھا۔ اردو میں اس کی حیثیت ان معنوں میں بہت زیادہ ہے کہ پہلی بار ان کے ذریعہ سے کلام پاک ایک ایسی زبان میں ترجمہ ہوا جو ملک کی ابھی ابتدائی زبان تھی اور ابھی یہ زبان باوجود مقبولیت کے ابھی اپنی ابتدائی منزل اور شکل میں تھی۔ لیکن حقیقت میں حکیم محمد شریف خان کی عظمت فن طب کی بنیادی کتب میں حواشی لکھنے کی بنا پر پوشیدہ ہے۔

انہوں نے قانون شرح اسباب اور نفسی پر حواشی بھی لکھے۔ ان حواشی سے ان کی وسعت نظر تحقیق اور اصابت رائے کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں انہوں نے



بعض نہایت دقیق اور مختلف فیہ مسائل کے متعلق نہایت خوبی کے ساتھ اظہار رائے کیا ہے۔

حکیم شریف خان نے تاریخ طب میں پہلی بار ایک ایسا جرات مندانہ قدم اٹھایا کہ تاریخ میں حکیم شریف خان کا نام زندہ جاوید ہو گیا۔

انہوں نے طب یونانی کو ہندی طب ویدک کے ساتھ مخلوط کیا اور اجراء میں حکیم واصل خان کے ذریعہ شروع کی جانے والی کتاب "علاج الامراض" میں نیز اپنے بلکہ اسلاف کے ساتھ دیگر معروف اطباء کے تجربات و معیولات کو مذکورہ کتاب میں یکجا کر دیا۔ اس کتاب میں تمام قدیمی طب کی کتب کے نسخے جو مستعمل رہ چکے ہیں ان کو اور بعض مفید و موثر ویدک نسخے بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ دستور دنیا ہے کہ جب کوئی قوم کسی دوسرے مقام پر منتقل ہوتی ہے تو اپنے ساتھ مقام اول سے تہذیب و تمدن تہذیب اور تاریخی اثرات لے جاتی ہے اور دوسروں کو اس سے متاثر کرتی ہے۔ اسی طرح دوسری جگہ جانے پر وہاں پر پہلے سے موجود تہذیب و تمدن جزا فیائی تاریخی سیاسی سماجی اثرات کو قبول کرتے ہیں اور ایک نئی تہذیب کا وجود آتا ہے جو دونوں کے لئے مفید ہوتا ہے۔

حکیم محمد شریف خان بھی اس سے نہ بچ سکے اور کشتہ سازی نیز دوسرے تجربات و معیولات کو طب یونانی کے ساتھ شامل کر کے ہندی تہذیب کو اپنایا۔ مذکورہ حکیم محمد شریف خان نے فن طب پر بیش بہا کتابیں تصنیف اور تالیف کیں۔ قرآن پاک کا اردو و فارسی میں ترجمہ کیا۔ انہی کے نام نامی و اسم گرامی کی نسبت سے خاندان شریفی کی ابتدا ہوئی۔ پھر نسل اپنی ذات میں ایک دور سمیٹے ہوئے آئی اور خدمتِ خلق و خدمتِ فن کے گہرے نقوش چھوڑتی ہوئی گزر گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک لمبے عرصے کے سکون و جمود کے بعد حکیم محمد شریف خان ایک مجتہدانہ دماغ لے کر پیدا ہوئے اور ان کا سب سے بڑا شرف یہی ہے کہ انہوں نے اس دورِ تعلیمِ اعلیٰ میں مسائل طب پر مجتہدانہ نظر ڈالی اور معاصر طباء کی رد و قبول کی پرواہ نہ کرتے ہوئے طب یونانی میں اصلاح و اضافہ کی نئی روح

پھونک دی۔

اس کے ساتھ ساتھ حکیم محمد شریف خاں کا مطب نہایت کامیاب مطب تھا شہرت دور دور تک جا پہنچی تھی نہ صرف ہندوستان سے بلکہ دور دراز ممالک جیسے ایران، افغانستان، بخارا اور حرمین شریفین تک سے مریض اور ان کے تیماردار آتے تھے۔

## وفات :-

۱۲۲۲ھ مطابق ۱۷۰۸ء میں بجر چوہاسی سال راہی ملکِ عدم ہوئے۔  
خواجہ بختیار کاکی کے مزار سے متصل مسجد کے جنوبی حصہ میں ان کو دفن کیا گیا۔  
عین اس وقت جب ان کو دفن کیا جا رہا تھا شاہ عبدالعزیز نے دخل الجنتہ بلد حساب سے سن وفات نکالا۔

حکیم غلام رضی خاں نے بھی اسی جملے سے سن وفات نکالا۔  
مختلف تاریخ دانوں نے مختلف اوقات میں ان کی وصال کی تاریخیں تحریر کی ہیں  
سیرت اجمل میں ۱۸۰۶ء تو بعضوں نے ۱۸۱۵ء سال وفات تحریر کیا ہے۔  
یہاں تک کہ قاموس المشاہیر کا مصنف تو ان کے وفات کی تاریخ ۱۲۲۱ھ قرار دیتا ہے۔

لیکن یہ سب غلط ہے۔ حقیقت میں شاہ عبدالعزیز دہلوی محدث کی تاریخ وفات کہی ہوئی موجود تھی تو دیگر تاریخیں قرین قیاس نہیں ہیں۔

## پسماندگان :-

جیسا کہ شجرہ نسب سے ظاہر ہے کہ ان کی اولادوں میں تمام کے تمام اطباء اور  
ایسے اطباء، کہ جن کے علم و فن کا چاروں جانب ڈنکا بجا پیدا ہوئے تھے۔  
ان کے چھ صاحبزادے تھے۔

۱، حکیم اشرف خاں (۲)، حکیم حسن بخش خاں (۳)، حکیم حسین بخش خاں (۴)،  
حکیم صادق علی خاں (۵)، حکیم امام الدین خاں (۶)، حکیم شرف الدین خاں۔

حکیم صادق خان حکیم شہ ایف خان کے بانشین ان کے انتقال کے بعد مقرر ہوئے۔

طبیب معرکے۔

حکیم شریف خان کے ذاتی تجربات و مشاہدات تو علاج الامراض میں درج ہیں ہی چند ایسے واقعات علاج ہوتے جو تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔

ایک بار محمد شاہ ثانی کو قبض کی شکایت ہوئی بادشاہ وقت نے کہا کہ ایسی دوا ہو جو غذا بھی ہو یعنی دوا کی بد مزگی کی بنا پر وہ دوا نہ کھانا چاہتے تھے حکیم شریف خان جو کہ باقاعدہ ابھی تک شاہی طبیب مقرر نہ ہوئے تھے بلکہ گئے اور ان سے حالات بتائے گئے اور بادشاہ وقت محمد شاہ ثانی کی نبض حکیم صاحب نے دیکھ کر مندرجہ ذیل نسخہ لکھا۔

سبب تازہ لے کر کاٹ کر دو حصوں میں بیچ نکال دیں اور قبض کشاد دوائیں اس مقام پر جہاں سے بیچ نکالے تھے بھری گئیں اور بھول گلاڑیا گیا تھوڑے وقفہ کے بعد جب یہ پھل صاف کر کے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا تو بادشاہ نے پھل سبب خیال کر کے کہا اب بادشاہ حکیم صاحب کا منتظر رہا کہ یہ اب دوا نما کوئی چیز دیں تب کوئی شے دیں۔

جب بادشاہ کو اجابت خوب کھل آئی تو بادشاہ نے حکیم صاحب سے فرمایا کہ اب دوا کی ضرورت نہیں ہے۔

حکیم شہ ایف خان نے عرض کیا کہ حضور دوا، تو کھلا دی گئی اور یہ دوا ہی کا اثر ہے کہ آپ کا مرض (تکلیف) ختم ہو گئی ہے۔

دراصل سبب سے بیچ نکال دینے کے بعد جو دست آور دوائیں بھری گئی تھیں اس کا اثر Osmosis (طابقہ عمل کے ذریعہ سارے سبب میں چلا گیا تھا۔

اسی طرح ایک بار پھر بادشاہ کو تکلیف ہوئی پرانی تمام شاہی طبیبوں نے کھانا منع کر دیا۔ ایسے موقع پر حکیم شہ ایف صاحب کو تکلیف دی گئی۔ اس کے قبل بھی بارہ مرتبہ حکیم صاحب کو متعدد موقعوں پر شاہی افراد کے علاج کے لئے بلوایا

جاچکا تھا۔  
حکیم شریف صاحب نے محمد شاہ عالم ثانی کی نبض دیکھی اور ایک حلوہ تیار  
کر کے دے دیا۔

گلقدن جس میں پانچ حروف ہیں  
گل کے دو حروف یعنی پھول دو حصہ اور قند کے ۳ حروف یعنی شکر ۳ حصہ  
جب حکیم صاحب نے یہ حلوہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تو بادشاہ نے کہا ہے  
حلوہ خیلے خوب است  
اور اپنے ہاتھ میں گلقدن کا برتن لے لیا اور لذت کی وجہ سے سارا حلوہ  
کھا گیا۔ جس سے خوب کھل کر اجابت ہوئی۔ اور مرض سے چھٹکارا مل گیا۔

# حکیم مومن خاں مومن

۱۸۰۱ء مطابق ۱۲۱۵ھ جون ۱۸۵۱ء مطابق جمعہ رمضان المبارک ۱۲۶۸ھ

شاعرِ باکمال و بے مثل طبیب

خاندان :-

مومن خاں مومن ۱۸۰۱ء مطابق ۱۲۱۵ھ میں چیلوں کے کوچے میں پیدا ہوئے تھے۔ جہاں ان کا آبائی مکان تھا۔ ان کے اجداد یعنی دادا حکیم نامدار خاں اور حکیم کامدار خاں کشمیر سے شاہ عالم کے زمانے میں چیلوں کے کوچہ دہلی میں رجوا کا برین کا مسکن اور مرکز تھا، آکر آباد ہو گئے تھے اور جنھیں اپنی طبی لیاقت کی بنیاد پر دربار میں شاہی طبیب کا درجہ مل گیا تھا اور دربار سے وابستہ ہونے پر ان کے دادا کو خاں صاحب کا خطاب ملا تھا۔ ان کے والد کا نام حکیم غلام نبی خاں تھا۔ یہ نسل کشمیری تھے۔ اور قوم کے پٹھان تھے۔ ان کی پہلی شادی خواجہ میر درد کے خاندان میں احمدی بیگم سے ہوئی تھی۔ دوسری شادی شاہ محمد نصیر کی دختر انجن النساء بیگم سے ہوئی تھی۔ جس کی بناء پر یہ قیاس کیا جائے گا کہ مومن خاں اہل سادات سے ہیں۔

صلہ خدمت کی بناء پر بادشاہ نے پرگنہ ناریوں کے چند مواضع جس میں موضع بلدہ بہ بھی تھا، بطور جاگیر عطا کیا تھا۔ پھر بعد میں یہ دونوں خاندان نامدار خانی اور کامدار خانی کے ناموں سے منسوب ہوئے۔ یہ زمانہ مغلوں کے آخری دور کا تھا۔ انگریزوں کے زمانے تک یہ جاگیریں مومن خاں کے خاندان والوں کے قبضہ میں رہیں۔ لیکن جب انگریزی سرکار نے جھڑکی ریاست نواب فیض طلب خان



حکیم مومین خان مومین

کو دی تو پرگنہ نارنواں بھی اس میں شامل تھا۔ رئیس مذکور نے ان کی جائداد ضبط کر کے  
ہزار روپیہ سالانہ پنشن وراثتاً حکیم نامدار خان مقرر کر دی جس میں سے حکیم مومن خاں  
مومن کو پانچ صد روپیہ ترکہ خاندانی ملنے لگا۔

## پیدائش :-

مومن کے والد حکیم غلام نبی خاں کوچہ چیلان کے اپنے آبائی مطب میں مطب  
کرتے تھے۔ چونکہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا مدرسہ بھی اسی محلہ میں تھا اور شاہ  
عبدالعزیز سے غلام نبی خاں کے قدیمی خاندانی مراسم تھے۔ شاہ صاحب کی رفاقت  
حکیم غلام نبی خاں کو خاصا مذہبی بنا دیا تھا جس کے اثرات مابعد مومن خاں پر بھی پڑے۔  
چنانچہ جب مومن پیدا ہوئے تو ان کے والد شاہ عبدالعزیز صاحب کو بلا  
الائے اور ان سے بچہ کے کان میں اذان دینے کو کہا۔ شاہ صاحب نے نہ صرف  
اذان دی بلکہ بچہ کا نام بھی مومن خاں رکھا۔ حالانکہ گھم کے دیگر لوگوں نے اس  
نام کو ناپسند کیا اور اپنی پسند کا نام حبیب اللہ خاں کشمیری رکھا لیکن نومولود  
نے شاہ صاحب کے نام سے نام پایا یعنی جب کامل طبیب ہو گئے۔ شعر و شاعری کا  
ذوق ہو گیا اور شعر موزوں کہنے لگے تو تخلص بھی مومن ہی رکھا اور ان کے استاد  
نیر دوستوں نے بھی یہ نام پسند کیا اور جب سب نے پسند کیا تو خدا نے بھی پسند  
کیا اور مقبول ہوا یہاں تک کہ یہ اپنے اعمال صالح کی بدولت واقعی حبیب اللہ  
ہوئے اور بہ شان مومن دنیا سے اٹھے۔

## تعلیم و تربیت :-

مومن کی تعلیم کا آغاز گھم سے ہوا پھر ابتدائی تعلیم شاہ صاحب کے مدرسہ میں  
شروع ہوئی جو ان کے محلہ کوچہ چیلان میں واقع تھا۔ اس کے بعد شاہ عبدالقادر  
کے مدرسے میں ان کی خدمت میں پہنچائے گئے اور یہیں عربی۔ فارسی۔ حدیث  
فقہ۔ منطق۔ معانی وغیرہ کی تکمیل ہوئی۔  
مومن کو بچپن سے ان بزرگوں سے بڑی محبت تھی۔ چنانچہ تعلیم حاصل کرنے

کے ساتھ ساتھ وہ ان کے وعظ بھی سنتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ ”ذہنِ خدا داد کا یہ عالم تھا کہ شاہ صاحب کا وعظ جو علاوہ علوم ظاہری کے نکاتِ باطنی سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔ بے فرق اپنے والد بزرگوار حکیم غلام نبی خان کے مطب میں بیٹھ کر ان کے سامنے دہرا دیتے تھے۔“ مزاً تو یہ تھا کہ مومن نکاتِ باطنی اور اسرارِ سینہ کو بھی اس طرح بیان کر دیتے تھے۔ جس کی جھلک حضرت شاہ صاحب کی تفسیرِ نا تمام میں موجود ہے۔

غرض کہ مومن کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں ان بزرگوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ انہوں نے ان کے سائے میں نہ صرف مختلف علوم سے واقفیت پیدا کی بلکہ روحانی فیض بھی حاصل کیا۔ اسی لئے مومن زندگی بھر حضرت شاہ صاحب کے احسان مند رہے۔ انہوں نے ہمیشہ شاہ صاحب کا نام عزت سے لیا ہے اور ان کی تعریفیں کرتے رہے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز کی وفات پر جو تاریخ انہوں نے کھی ہے اس کے اشعار سے یہ حقیقت پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ اس میں انہوں نے شاہ صاحب کو وحید الزماں اور یکتائے دور کہا ہے۔

انتخاب نسخہ دین مولوی عبدالعزیز  
جانب ملک عدم تشریف فرما کیوں ہوئے  
بے ستم اے چرخ تو کس کجبانے لے گیا  
جب اٹھائی نعش اک عالم تہہ و بالا ہوا  
کیا کس و ناکس پہ تھا صدمہ کیا جس وقت دفن  
مجلس در آفرین تعزیت میں میں بھی تھا

بے عدیل و بے نظیر و ہمیشہ  
آگیا تھا کیا کہیں مردوں کے ایماں میں خلل  
کیا کیا یہ ظلم تو نے بلیسوں پر اے اجل  
ٹوٹتا تھا خاک پر ہر قدسی گردوں محل  
ڈالتا تھا خاک سر پر ہر عزیز و بست نزل  
جب پڑھی تاریخ مومن نے آکر بے بدل

دست بے داد اجل سے بے سرو پا ہو گئے

فقر و دین فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

اس قطعہ کے اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کی شخصیت نے ان پر گہرے اثرات چھوڑے تھے۔ اسی لئے انہوں نے زندگی بھر ان کی شخصیت کو فقر و دین فضل و ہنر لطف و کرم اور علم و عمل کا بیج سمجھا۔ اس کی بدولت مومن میں بھی بعض ایسی خصوصیات پیدا ہوئیں جن کو ان کی زندگی کا بہت بڑا سرمایہ



سمجھنا چاہیے۔ شاہ عبدالغزیز اور شاہ عبدالقادر جیسے مینارہ علم و ادب سے نرانوں نے ادب طے کرنے اور کتب فیض حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے آبائی پیشے طبابت کی جانب متوجہ ہوئے۔ چونکہ مختلف اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی میں خاصی دستگاہ حاصل کر لی تھی۔ اس لئے جب انہوں نے طبابت کی جانب توجہ دی تو اس میں بھی بہت جلد کمال حاصل کر لیا۔

طبی تعلیم پر۔

چونکہ طب کے ماہر خود ان کے خاندان میں ان کے چچا حکیم غلام حیدر خان اور والد حکیم غلام نبی خان اپنے زمانے کے ماہر طب اور اعلیٰ طبیب تھے۔ انہی سے مومن نے طبابت سیکھی اور ان کے دو اٹھانے میں نسخہ نویسی یعنی مریض کو دیکھنا اور ان کے مرض کے مطابق نسخہ لکھنا سیکھا۔ مومن نے کچھ وقت اسی طرح گزارا اور بہت قلیل عرصہ میں خود ایک اعلیٰ اور ایک طبیب کامل کی حیثیت سے وہ بہت جلد مشہور ہو گئے۔

کریم الدین نے لکھا ہے کہ "حکیم اس پایہ کے کہ بوعلی سینا اگر تمام عمر قانون طبابت سیکھنے میں لگواتے پر ان کے سامنے نبض دیکھنے کا شعور نہ پائے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے طبیب حاذق سمجھے جاتے تھے اور ایک طبیب کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے بھی لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے علوم و فنون سے بھی ان کی گہری دلچسپی کا پتہ لگتا ہے۔

مومن خان کے چچا حکیم غلام حیدر خان اور والد حکیم غلام حسن خان کا مدنی خاندان سے تھے چونکہ دونوں اپنے زمانے کے مشہور و مدوون اور جید طبیب تھے ان کی قدر و منزلت بہت تھی اور اپنے وقت کے مانے ہوئے طبیب تھے۔ مرید نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

ارشاد تلامذہ حکیم شریف خان سے ہیں۔ مقامات کتب طب موافق زعم راقم کے جیسے ان کی خدمت میں کھل ہوئے ہیں۔ غالب یوں ہے کہ اس جزو زمان میں اور

کہیں نہ ہوتے ہوں۔ خدمت اساتذہ کرام مثل مولانا مخدوم مولوی عبدالغزیز صاحب دہلوی اور مولوی رفیع الدین صاحب اور مولوی عبدالقادر صاحب ارفع اللہ سے سالہا سال تک استفادہ کیا اور انواع فیوض حاصل کئے۔ شفا کے کامل ان کے دستِ حق پرست میں ودیعت ہے۔ راقم کو حضرت موصوف کی خدمت میں نسبت شاگردی حاصل ہے۔“

اور اسی طرح حکیم غلام حیدر خان کے بارے میں لکھا ہے کہ ”حکیم غلام حیدر خان موصوف بصفات کمال کتبِ طبیبہ میں مہارت۔ نام علاج و معالجے میں دستگاہ تمام رکھتے تھے۔ تحصیل فن طب حکیم شریف خان سے کی تھی۔ اب عرصہ چند سال کا ہے کہ اس جہان سے عالم باقی کی طرف روانہ ہوئے۔“

چونکہ حکیم کے معنی ہوتے ہیں تمام علوم پر قدرت رکھنے والا۔ خدا کی ذات کو چھوڑ کر دیگر کوئی ایسی طاقت نہیں ہے لیکن حکیم اپنی علمی قابلیت کی بنا پر تمامی علوم سے بہم واقفیت رکھتا ہے۔

دیگر علوم :-

حکیم مومن کو علم نجوم سے قدرتی مناسبت تھی۔ علم نجوم کے اہل کمال سے اس علم کو سیکھا اور مہارت بہم ایسی پہنچائی کہ احکام سنکر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ سال بھر میں ایک بار تقویم دیکھتے تھے۔ پھر برس دن تک تمام ستاروں کے مقام اور ان کی حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی۔ جب کوئی سوال پیش کرتا تو نہ زاپچہ کھینچتے اور نہ ہی تقویم دیکھتے۔ پوچھنے والے کہتے تم خاموش رہو۔ جو میں کہتا جاؤں اس کا جواب دیتے جاؤ پھر خٹک بائیں پوچھتے تھے اور مسائل اکثر ان کو تسلیم کرتے جاتے تھے۔

ان کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ واقعی نجوم کے بہت بڑے ماہر تھے ”واقعہ یہ ہے کہ ایک دن ایک غریب ہندو نہایت بے قرار اور پریشان آیا۔ حکیم مومن خان مومن کے بیس برس کے رفیق قدیم شیخ عبدالکریم اس وقت موجود تھے خان صاحب (حکیم صاحب)

نے اسے دیکھ کر کہا کہ ”تمہارا کچھ مال جاتا رہا ہے۔“ اس نے کہا، ”صاحب میں لٹ گیا۔“  
 کہا ”خاموش رہو، جو میں کہوں اسے سنتے جاؤ۔ جو غلط بات ہو اس کا انکار کر دینا۔  
 پھر پوچھا کہ زیور کی قسم سے تھا؟“

”صاحب ہاں، وہی عمر بھر کی کمائی تھی!“

کہا، ”تم نے لیا ہے یا تمہاری بیوی نے؟ کوئی غیر چرانے نہیں آیا ہے۔“  
 اس نے کہا، ”میرا مال تھا اور میری بیوی کے پہننے کا زیور تھا۔ ہم کیوں چرانے؟  
 ہنس کر فرمایا ”کہیں رکھ کر بھول گئے ہو گے۔ مال تمہیں باہر نہیں گیا۔“  
 اس نے کہا ”صاحب سارا گھر ڈھونڈ مارا۔ کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔ فرمایا پھر دیکھو،  
 وہ گیا اور سارے گھر میں اچھی طرح دیکھا۔ پھر آکر کہا صاحب میرا چھوٹا سا گھر ہے  
 ایک ایک کونہ دیکھ لیا کہیں پتہ نہیں لگتا۔ ناخان صاحب نے کہا اسی گھر میں ہے تم غلط  
 کہتے ہو۔“

کہا۔ آپ چل کر تلاشی لے لیجئے۔ میں تو ڈھونڈ چکا۔

فرمایا۔ یہیں سے بتانا ہوں۔ یہ کہہ کر سارا نقشہ بیان کرنا شروع کیا۔  
 وہ سب باتوں کو تسلیم کرتا جاتا تھا پھر کہا۔ اس گھر کے جنوب کے رخ ایک  
 کوٹھی ہے اور اس میں شمال کی جانب ایک لکڑی کا مچان ہے اس کے اوپر مال  
 موجود ہے جا کر لے لو۔ اس نے کہا مچان کو تو میں نے تین دفعہ چھان مارا ہے۔  
 وہاں نہیں ملا ہے۔ فرمایا۔ اسی کے ایک کونے میں پڑا ہے۔ عرض جب گیا اور روشنی  
 کر کے دیکھا تو ڈرتے اور اس میں سارا زیور جوں کا توں وہیں سے مل گیا۔

مختم جس اعلیٰ پائے کے تھے ویسے ہی حکیم مومن ناخان مومن ایک اچھے عامل بھی تھے  
 گندہ تعویذ بھی دیا کرتے تھے۔ سارے شہر میں دھوم تھی۔ مومن خان کی علم نجوم سے  
 واقفیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے جو انھوں نے دیباچہ تقویم سال ہزار دوسرے  
 و پنجاہ دوسرے کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس دیباچہ میں انھوں نے علم نجوم کے مختلف  
 پہلوؤں پر نہایت ہی عالمانہ سیر حاصل بحث کی ہے۔

نجوم کے ساتھ ساتھ علم رمل سے بھی پوری واقفیت رکھتے تھے۔ علم رمل میں ماہر  
 و کیتا ہونے کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل واقعہ سے اچھی طرح ہو جائے گا۔

حکیم مومن خان مومن کے شاگرد درشید رمل عرش گیا وہی جنھوں نے اپنے استاد پر حیات مومن تحریر کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ

”حکیم مومن خان مومن کا دربار لگا ہوا ہے۔ مختلف علوم و فنون کے شائق دامن طلب پھیلائے ہوئے ہیں کہ دیوار پر ایک چھپکلی نظر آتی ہے۔ خان صاحب راقم کو فرماتے ہیں۔ بھئی ذرا دیکھنا یہ چھپکلی دیوار سے کب بیٹے گی۔ وہ زور لگا کر کہتے ہیں۔ حضور یہ ابھی جاتی ہے۔ خان صاحب شطرنج کھیل رہے ہیں مگر مسکرائے جاتے ہیں اور دیوار کی طرف دیکھ کر حکم لگاتے ہیں۔ واہ جب تک پورب سے اس کا جوڑا نہ آجائے۔ کیونکر جائے گی۔ دیکھو اور پھر دیکھو۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد بالاخانے پر جہاں خان صاحب جلسہ جمائے بیٹھے ہیں۔ ریشمی کپڑوں کے دو گھنٹے ایک سوداگر آتا ہے خان صاحب کو ریشمی کپڑوں سے ازلی ذوق تھا اور کم از کم پانچ ماہ ریشمی ضرور پہنتے تھے۔“

سوداگر جوں ہی مزدور کے سر سے ایک گٹھ کپڑے کا پورب والے دروازہ سے داخل ہو کر کمے میں اتارتا ہے۔ گانٹھ سے ایک چھپکلی پل سے گرتی ہے اور دوڑ کر دیوار والی چھپکلی سے جا ملتی ہے۔ پھر دونوں چھپکیاں مل ملا کر ایک جانب کا راستہ لیتی ہیں۔

عرش گیا وہی صاحب عالم تھیجے میں حکیم مومن کا منہ دیکھتے ہیں وہ مسکرا کر فرماتے ہیں۔ ”میاں ہنوز دہلی دور است“۔ تم چاہتے ہو کہ شاعری کی طرح اس کو بھی حاصل کر لو تو یہ مذاق نہیں۔“

حکیم مومن نے ان علوم کے ساتھ ساتھ موسیقی کا فن بھی حاصل کیا تھا۔ نظیہ بی بی نے جو اس زمانے میں استاد تھا حکیم مومن کے انتقال پر بین اٹھا کر صرف اس لئے رکھ دی تھی کہ اب دلی میں اس کا کوئی قدر دان نہیں رہا۔

شطرنج کے کھیل کو بھی انھوں نے ایک علم اور فن کی طرح سیکھا تھا اور اس میں بھی بڑی مہارت حاصل کی تھی۔ آپ حیات میں مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ شطرنج سے بھی ان کو کمال مناسبت تھی۔ جب کھیلنے بیٹھتے تھے تو دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی تھی اور گھر کے نہایت نہ وری کام بھی بھول جایا کرتے تھے۔ دلی کے

مشہور شاعر کرامت علی خان سے قرابت دیرینہ رکھتے تھے اور شہر کے دو چار مشہور شاعروں کے سوا کسی سے کم نہ تھے۔

## شعری و ادبی ذوق :-

یوں تو مومن نے کئی علوم و فنون میں کمال حاصل کیا۔ لیکن بنیادی طور پر وہ شاعر تھے۔ اس لیے اپنی زندگی — میں سب سے زیادہ انہوں نے شعر و شاعری کے فن میں پھر اس کے بعد طب کے فن میں دلچسپی لی۔ انیسویں صدی کے دہائی کے مخصوص شاعرانہ ماحول میں ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ مومن کو شعر و شاعری سے طبعی مناسبت تھی اور وہ اس فن کے ساتھ فطری لگاؤ رکھتے تھے۔ چنانچہ ابتدائی عمر سے ہی انہوں نے اس صنف کے ساتھ دل بستگی پیدا کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس دل بستگی نے ان کے یہاں شعر کہنے اور شاعری کا شوق پیدا کیا۔ اس پاس اور گرد و پیش کے شاعرانہ ماحول نے اس آتش شوق کو بجھ کا یا۔

شاہ نصیہ سے بہت مختصر عرصہ کسب سخن حاصل کرنے کے بعد خود اپنے علم کی بدولت استاد کی گھر کے مرتبے پر پہنچ گئے۔ اور تمام افراد پر سبقت حاصل کر لی تھی۔ یعنی کہ مومن نے بہت جلد شعر و شاعری میں کمال حاصل کر لیا اور وہ تمام اصناف سخن پر قادر ہو گئے۔ انہوں نے غزلیں کہیں مثنویوں کی تخلیق کی۔ قصیدے لکھے۔ مسدس۔ مخمس۔ رباعی۔ ترکیب بند۔ ترجیع بند۔ سب کو اپنے شاعرانہ خیالات کے اظہار کے لئے استعمال کیا۔ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی طبع آزمائی کی۔ اور اس زبان میں بھی مختلف اصناف کو چارچاند لگا دیئے اور بہت تھوڑے عرصہ میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کا ایک قادر الکلام اور خوش فکر شاعر اپنے آپ کو تسلیم کر لیا۔ ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور دیکھتے دیکھتے وہ اپنے زمانے کے استاد سمجھے جانے لگے۔

ان کے والد ماجد کا انتقال ۱۲۴۱ھ میں ہوا تھا۔ مومن نے ان کے انتقال پر ایک قطعہ تاریخ فارسی میں کہا۔

پدرم شد اسیر دام اجل  
روحش از منہ آخشیاں در بست

طائرے بود آسماں پرواز رفت بر شاہسار قرب نشست  
 بہ من الہام گشت سال وفات  
 کہ غلام نبی بہ حق پیوست  
 اور اردو میں ”شور انگیزی قلم سنہ چاک اشک فشاں در ماتم حکیم غلام نبی خان“  
 کے عنوان سے ایک تاریخ کہی۔

جہاں نکوئی نکو بے جہاں  
 یہاں تک انہیں شوقِ خلدِ بریں  
 نہ دل میں نہ ان کے زباں پر کبھو  
 غرض آگیا وقتِ موعود جب  
 تاسف نے کیا کیا ستایا مجھے  
 غضبِ جان کو بے تواری ہوئی  
 کہ دکھا دل عشرتِ آلود مرگ  
 جہاں سے جب ایسا شفیق اٹھ گیا  
 کہوں کیا کسی سے کہ کیا نعم ہوا  
 ولے شعر کی جو ہوس ہے کمال  
 وحید زباں والدِ مہربان  
 کہ ہر دم کو گنتے دم واپس  
 رضائے الہی سوا آرزو  
 گئی تن سے وہ جان عشرت طلب  
 قلق نے زمیں پر لٹایا مجھے  
 بری حالت ایسی ہماری ہوئی  
 ہوئی زندگی اپنی محسود مرگ  
 تو جینے کا سچ سے مزا کیا رہا  
 سزاوار اشفاقِ ماتم ہوا  
 اسی نعم میں تاریخ کا تھا خیال

جنازہ اٹھایا فرشتوں نے آہ

توقد فازاً فوزاً عظیماً کما

ان قطعات تاریخ سے مومن کے والد کی شخصیت پر خاصی روشنی پڑتی ہے  
 یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک خصال آدمی تھے۔ لوگوں کو ان سے محبت تھی۔ زمانہ  
 ان کی عزت کرتا تھا۔ وہ بڑے شفیق اور مہربان باپ تھے۔ انہیں بہ لمحہ خلدِ بریں  
 کا خیال رہتا تھا۔ رضائے الہی کے سوا ان کے دل میں کوئی اور آرزو نہیں تھی۔  
 غرض وہ بڑے نیک دل اور صاف باطن انسان تھے انہیں صحیح معنوں میں  
 جنتی کہنا چاہیے۔

والد کے انتقال کے وقت مومن کی عمر ۲۶ سال تھی۔ ظاہر ہے کہ والد کی  
 وفات کے بعد وہ بے یار و مددگار ہو گئے ہوں گے۔ اور ساری ذمہ داریاں

انہیں اٹھانی پڑی ہوں گی۔ انشاءتے مومن میں انہوں نے ایک خط اپنی عورت مختارہ یعنی حکیم احسن اللہ خان کی ماں کے نام لکھا ہے۔ اس میں اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس سانحہ پر روشنی ڈالی ہے۔

نہ صرف ایک شاعر کی حیثیت سے بلکہ ایک مایہ ناز طبیب کی حیثیت سے بھی حکیم مومن ننان مومن نے اپنے زمانہ میں بڑی عزت اور شہرت حاصل کی۔ وہ شاعری کو اظہارِ جذبات کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس سے کبھی کچھ حاصل کرنے کی سعی نہیں کی۔ انہیں کبھی کسی دربار میں داخل ہونے کا خیال نہیں آیا۔ ال قلعہ اس زمانے میں شاعری کا مرکز تھا۔ لیکن شاعری کے سہارے انہوں نے قلعہ تک جانے کی کبھی آرزو نہیں کی۔ خاندانی شاہی طبیب ہونے کا بھی کبھی فائدہ نہ اٹھایا۔ اس زمانے کے کئی رئیسوں نے انہیں ملازم رکھنا چاہا۔ لیکن انہوں نے ملازمت قبول نہیں کی۔ کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کیا۔ کچھ حاصل کرنے کے خیال سے کسی کی مدد نہیں کی۔ ان کے زمانہ کے امرا اور قوسا اس بات کے لئے کوشاں رہتے تھے کہ انہیں کسی طرح اپنے پاس ملازم رکھ لیں۔ لیکن یہ تیار نہ ہوئے۔ ملازمت خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو انہیں پسند نہ تھی۔ اسی لئے جب کبھی بھی ملازمت کا سلسلہ ہوا تو انہوں نے کسی نہ کسی بہانے سے اس کو ٹھکرا دیا۔ اس کی بنیادی وجہ ان کی غیور طبیعت تھی۔ وہ کسی کے دستِ نگر بن کر نہیں رہ سکتے تھے۔ مزاج میں آزادہ روی تھی۔ اس لئے ملازمت کی پابندیوں کو برداشت کرنا ان کے لئے مشکل تھا۔ مومن کو والی رام پور، والی ٹونک، والی بھوپال، والی جہانگیر آباد وغیرہ نے اپنے دوستانہ جاں میں پھنسانا چاہا۔ مہاراج کپور تھلہ نے ساڑھے تین سو روپیہ ماہوار پر طلب کیا۔ مگر وہاں بھی نہ گئے۔ زادراہ تک واپس کر دیا۔

ریاست ٹونک کے وزیرالردولہ امیرالملك نواب محمد وزیر خان نصرت جنگ بہادر کو مومن سے نسبت نکاح تھی۔ وہ ان کے پیر بھائی ہوتے تھے۔ انہوں نے بلانے کی بہت کوشش کی۔ مومن نے معذرت کے طور پر ایک قصیدہ لکھ کر بھیج دیا۔ اور اس طرح نہایت خوش اسلوبی سے انکار کر دیا۔ قصیدے کے یہ

اشعار بڑے معنی خیز ہیں۔

یاد ایام عشرتِ افسانی  
جائیں وحشت میں سوتے صواکبیر  
ایسی وحشت سرا میں آئے کون  
نکتہ سنجوں سے جی میں ہے پوچھوں  
کیا ہوئی وہ بلند رہی دیوار  
نہ ملا کچھ نشانِ آبِ زوال  
نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی  
کم نہیں اپنے گھسہ کی ویرانی  
بے دری کمر رہی ہے درباری  
کہ میں شہری ہوں یا بسا بانی  
کیا ہوئے وہ غمناک طولانی  
خاک سارے جہان میں چھانی

میرے گوہر تمام ناسفت  
میں وہ سرمایہِ بلاغت ہوں  
میرے یاقوت سب بدحشانی  
جس کے در کا گدا ہے خاقانی

انوری کے بیان میں ہے کہاں

میری تقریر کی سی تا بانی

اسی طرح انگریزوں نے جو مدرسۃ العلوم دہلی کالج کے نام سے قائم کیا  
تھا اس کالج میں فارسی مدرس کی جگہ بھی حکیم مومن صاحب کو پیش کی گئی تھی لیکن  
اس کو انہوں نے قبول نہیں کیا۔

بات دراصل یہ ہے کہ مومن بڑے خوددار آدمی تھے۔ اس خودداری نے  
انہیں مادی ضرورتوں سے بڑی حد تک بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ کئی علوم کے ماہر  
تھے۔ چاہتے تو ان میں سے کسی کو بھی اپنا ذریعہ معاش بنا سکتے تھے۔ بات یہ ہے  
کہ وہ صرف شاعر تھے اور شاعری کو کسی مقصد برادری کے لئے ذریعہ بنانا ان کے  
نزدیک مناسب نہیں تھا۔

حکیم مومن خان مومن کے نزدیک شعر و شاعری محض تفریح طبع کی چیز نہیں  
تھی۔ وہ اس کو ایک فن سمجھتے تھے۔ اس فن کے تمام پہلوؤں سے انہیں لگاؤ تھا۔  
وہ اس فن کے تمامی اہل و روزگار کو جانتے تھے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے چوٹی کے  
شاعروں میں ہوتا تھا۔ لیکن انہوں نے کبھی بھی شاعری کو اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ انہوں  
نے ایسی باتیں کیں جو عام طور پر شاعر کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے زمانے میں دلی کی سڑکیں



پر بڑے بڑے شاعر موجود تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو کسی سے بڑا نہ سمجھا۔ ان کی چشمک کسی سے نہ تھی۔ سب ان کی عزت کرتے اور انہیں عزیز رکھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ مومن پر کسی نے اعتراضات نہیں کئے۔ زندگی بھر ان سے کوئی الجھا نہیں۔

غالب کی شاعری کا اس زمانے میں شہرہ تھا اور بلاشبہ اس زمانے کے سب سے بڑے شاعر غالب تھے۔ ان کے سامنے شاعری کا اعلیٰ و ارفع تصور تھا اس لئے وہ ذرا مشکل ہی سے کسی کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرتے تھے۔ غالب نے اپنے زمانے میں صرف حکیم مومن خان مومن کے جوہ کو تسلیم کیا ہے اور صرف ان کو ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر مانا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حکیم مومن خان مومن کی جب یہ غزل دیکھی جس کا مطلع ہے۔

اثر ان کو ذرا نہیں ہوتا

رنج راحت فرا نہیں ہوتا

اور جب غزل کا یہ شعر ان کی نظر سے گذرا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو بے اختیار کہہ اٹھے کہ کاش حکیم مومن میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھے دے دیتا۔ غالب جیسے سخن شناس کا اپنے ہم عصر حکیم مومن کے متعلق یہ اظہار صاف ظاہر کرتا ہے کہ انہیں حکیم مومن خان مومن کی شاعری سے دلچسپی تھی۔ اور وہ انہیں ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر خیال کرتے تھے۔

حکیم مومن خان مومن میں خود داری خود اعتمادی اور خدا اعتمادی حد درجہ تھی۔ کبھی کسی امیر۔ رئیس یا دربار میں صلہ کے عوض نہ تو گئے اور نہ ہی کوئی توقع رکھی۔ اسی لئے ایک دو کے سوا کبھی کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ ان کی خود داری کا ایک واقعہ درج ہے۔

راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کریم سنگھ رئیس پٹیالہ جو دہلی میں رہتے تھے اور ان کی سخاوتیں مشہور تھیں وہ ایک دن اپنے مصاحبوں کے ساتھ سربراہ اپنے

کوٹھے پر بیٹھے تھے۔ خان صاحب کا ادھر سے گذر ہوا۔ مصاحبوں نے کہا ”حکیم مومن  
یہی شاعر ہے۔“ راجہ صاحب نے آدمی بھیج کر بلایا۔ عزت و تعظیم سے بٹھایا۔ کچھ نجوم  
شعر و شاعری اور امراض و علاج کی باتیں کیں اور حکم دیا کہ ہتھی کس کر لاؤ۔ ہتھنی  
کس کر لائی گئی۔ وہ حکیم صاحب کو عنایت کی۔ انھوں نے کہا مہاراج میں غریب  
آدمی ہوں اسے کہاں سے کھلاؤں گا؟ اور کیونکر رکھوں گا۔ مہاراج نے کہا ستو  
روپیہ اور دو۔ حکیم مومن اسی ہتھنی پر سوار ہو کر گھر آئے اور پہلے اس کے ہتھنی  
روپیہ کھلتے اسے پیج دیا۔ پھر حکیم صاحب نے ایک قصیدہ مدحیہ شکر یہ لکھ کر  
راجہ صاحب کو روانہ کیا جس کا مطلع یہ ہے

صبح ہوئی تو کیا ہوا وہی تپہ اختیری

کثرت دود سے سیاہ شعلہ شمع خاوری

کوئی مدح کسی دنیا دار کے صلہ و انعام کی توقع پر نہیں لکھی اور اس کا سبب  
یہ تھا کہ وہ صحیح معنوں میں شاعر تھے اور شاعری کو دنیاوی عزت دولت اور شہرت  
کے لئے وسیلہ بنانا انھیں ناپسند تھا۔ ویسے وہ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔  
اور ایسی دردناک اور دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا۔

پسماندگان :-

حکیم صاحب کی پہلی زوجہ محترمہ سے کوئی اولاد نہ تھی۔ دوسری اہلیہ صاحبہ سے  
ایک دختر جن کا نام محمدی بیگم تھا اور کئی صاحبزادے پیدا ہوئے جن کا انتقال  
حکیم صاحب کی حیات میں ہوا لیکن ایک صاحبزادے خواجہ نصیر خان کی عمر جب  
چھ یا سات سال کی تھی تب حکیم مومن خان مومن کا انتقال ہو گیا تھا۔ دوسرے  
صاحبزادے عبدالوہاب جو عربی و فارسی کی تعلیم کے بعد فقہ کی جانب رجوع ہوئے  
ان پر عرصہ تک جذب کی کیفیت طاری رہی اور اسی عالم میں انتقال کیا۔

شاگرد :-

شاعری کے فن میں حکیم مومن نے اپنے زمانے کے بعض اہم شاعروں کی رہنمائی

کی۔ ان کے کچھ شاگردوں کا نام مشہور ہوئے ہیں جنہوں نے اس زمانے میں ہی خاصا نام پیدا کر لیا تھا۔ حکیم مومن کے شاگردان رشید کی فہرست طویل ہے ان میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ سرفہرست ہے۔

دیگر شاگردوں میں حکیم سید منور علی آشفٹہ۔ میر عبدالرحمن آبی۔ خلف میہ حسین تسکین۔ حکیم مولا بخش تعلق میرٹھی۔ نواب عباس علی خان۔ بیات رام پوری۔ شیخ علی بخش بیار۔ مرزا غلام فخر الدین تھوڑ۔ قاضی نجم الدین برق۔ مرزا مودبگیا رحمت۔ سعادت علی خان راسخ۔ مرزا قربان علی سالک۔ ظہور علی ظہور۔ عظمت اللہ عظمت۔ غلام احمد شورش۔ میاں جان دہلوی صغیر۔ مرزا خدا بخش قیصر۔ شیخ غلام علی کرم۔ اصغر علی خان نسیم۔ غلام علی خان وحشت۔ فخر الدین یاس قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعضوں نے تو خود استاد کی مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ مومن نے اپنی پانچویں نمنوی حسین مغموم میں ان کا ذکر یوں کیا ہے۔

کون سے شاگرد ہیں استاد دین	بے سخن ہے دلربا جن کا سخن
وحشت و مضط کرم تسکین و یاس	بے خودی میں بھی ہیں جنکے بدحواسی
اکبر و عظمت۔ مہ افراز سخن	پایہ بالا تر بہ افراز سخن
باعث ناز و غرور روزگار	میرے مشفق میرے مونس میاں
شیفتہ سر دفتر ابل قلم	نکتہ لحاظ نشان جس کا رقم
بے عدیل و بے سیم و بے بدل	بے نظیر و بے مثال و بے مثل
رازدان نکتہ بائے کس مدان	معنی کرسی نشین لحاظ نشان

بہم نفس بہم رضا جو دوستدار

شیفتہ دلدار والد جان نثار

غرضکہ مومن کو اپنے شاگردوں پر فخر تھا۔ ان میں سے بعضوں کو وہ اپنا بہت اچھا دوست بھی سمجھتے تھے اس زمانے کی زندگی میں ان کی شخصیتیں اہم حیثیت رکھتی تھیں۔ مومن سے انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا تھا اسی لئے ان سب کے دلوں میں حکیم صاحب کی بڑی عزت تھی اور خود مومن ان شاگردوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ کیونکہ ان سب نے مل کر اُس صحیح شاعرانہ ماحول کو پیدا کیا تھا۔

جو مومن کو بہت عزیز تھا اور جس کے بغیر مومن زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔

## انتقال :-

ایک دن حکیم مومن خان کے مکان کی مرمت ہو رہی تھی اور سامان بٹایا جا رہا تھا۔ یہ اس چھت کی منڈیر سے لگے ہوئے کھڑے تھے۔ چھت کی اونچائی کم تھی۔ یکایک جھکے اور ٹھوکر کھا کر کوٹھے سے نیچے گر پڑے۔ گرتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو فرمایا۔ میاں جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہوا مگر میرا علم کہتا ہے کہ میں صرف پانچ مہینے جیوں گا۔ لو مرنے کی تاریخ لکھ لو۔

دست و بازو بشکست ۱۲۶۸ھ

آخر وہی ہوا۔ جمعہ کے روز صبح کا وقت تھا کہ دنیا سے کوچ فرمایا۔ عمر کے لحاظ سے جب کہ قبل ندر ساٹھ برس کی عمر میں آدمی جوان معلوم ہوتا تھا یہ محض تیرہن برس کی عمر رکھتے تھے کہ انتقال کیا۔ دیکھنے میں چالیس پینتالیس برس کے معلوم ہوتے تھے۔ نماز جنازہ جامع مسجد میں ہوئی۔ حسب ہدایت ان کا جنازہ دلا دروازہ ہدیوں کے شہر خموشاں میں جو کہ دہلی کا پرانا گورستان ہے دفن کیا گیا یہ وہی قبرستان ہے جہاں شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالقادرؒ اور ان کے خاندان کے دوسرے لوگ دفن ہیں۔

شہر کے امیر غریب علماء، فضلا، شعراء، اطباء، شہزادے سب جنازے کے ساتھ تھے اور سب ان کی جواں مرگی کا سوگ منایا۔ غالب تو غالب ذوق کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور ہر بزم میں یہی چرچا تھا کہ دہلی کا چراغ بجھ گیا۔

مومن کی موت ایک شاعر، ایک اختر شناس اور ایک رند پارسی کی موت نہیں تھی۔ ایک آدمی ایک انسان ایک دوست اور ایک محب اسلام کی موت بھی تھی۔ ان کی موت نے سارے ماحول کو متاثر کیا۔ بڑے بڑے شاعروں نے تاریخیں کہیں اور اس طرح ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ان کے انتقال کا دلی کے ہر شخص کو غم ہوا۔ کیونکہ انھوں نے اپنی دلکش شخصیت سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالی تھی۔ وہ ہر طبقے میں مقبول تھے۔ ان کی شخصیت مرخان مرخج تھی۔ وہ کسی



منہ کا مزایہ تلخ کہ شیریں ہے اس سے تو  
 بے وجہ سہر کہ رو دیتے زیادہ حیلہ ساز۔!  
 صندوق سے درد سہر کو کھا جب تلک جبیں  
 میں اس کے آستناں پہ نہ رگڑوں بصد نیاز۔!  
 ہاں شوق سہر کہ رو دیتے ہندی صنم ہے خاک  
 صنم، شکن ہو سہر کہ انگری مجاز۔!  
 ہاں بوسے چاہیں گہ زلفِ یار کے  
 ممکن نہیں کہ دانہ آلو ہو چارہ ساز۔!  
 لازم ہے تیرے سینے پہ رخسارِ ماہ و شمس  
 کا فور کی ہو قرص سے کیا چارہ فراز۔!  
 جھوٹی شرابِ یار کی درکار ہے کہاں  
 تسکین پذیر ہو عرقِ بید سے جواز۔!  
 اس جائے بوسہ شکر میں لب کا کام ہے  
 گل قندے کیونکر طبیعت کو احتراز۔!

ایک قطعہ میں اپنا حال اس طرح بیان کیا ہے۔

ہوا جاتا ہوں اب جی میں ہے اس بے درد کو لکھوں  
 کہ مجھ کو تختہ مشقِ اطباء کیوں بنایا ہے

نہ یہ سمجھیں سبب نے کچھ علالت سے مرض پاویں

پڑے ہیں آپ مایخولیا مجھ کو بتایا ہے

کوئی کہتا ہے کہ آلودہ کہ صنم کی گرانی ہے

سیاہ رُونے سہرا رنگ جو چہرے کے پایا ہے

کوئی کہتا ہے لشرِ غش ہو جب بے خودی چھائی

مجھے وسواسِ سرسامِ دروغیں سچ ہی آیا ہے

کوئی کہتا ہے میں سمجھا یہ سہر جو اٹھ نہیں سکتا

ہزالِ روحِ انسانی نے یارِ سہرا اٹھایا ہے

کوئی کہتا ہے حاشا یہ گرمی غیبِ خالص کی  
 اسی حال سے زشتی کے درمیان دل کا اٹرایا ہے  
 کوئی کہتا ہے ترکیب اور غالب لحاظ مانگتے  
 رطوبت گرم نہیں تو کیوں پسینے میں نہایا ہے  
 کسی قسم پر سے عفویت کا جو درمیان آیا  
 تو آخر دیکھنے کو بول کا شیشہ منکھایا ہے  
 کوئی کہتا ہے یہ سکتے ہیں نظروں میں ہماری تو  
 کئی بار استغیثوں نے لاکے آئینہ دکھایا ہے  
 کوئی اطراف کی سردی سے گرم شور و غوغائیوں  
 کے سیکڑے چارہ بالشدہ مکرر آزمایا ہے  
 کوئی کہتا ہے دیکھو مٹلی سے منضج سے بل دو  
 دیکھیں بیشتر سے گرم کوئی منضج پلایا ہے  
 کسی کو گرم خدائی سے گماں سے ناتوانی کا  
 تو کہتا ہے جلدی لاؤ گرم کچھ بھی بکھایا ہے  
 کسی نے شربت ورد مکرر کی جو ٹھہرائی  
 تو کوئی سن کے مثل غنچے و گل مسکرایا ہے  
 کوئی کہتا ہے اب تو ہو گیا کیلوس بھی ناقص  
 کہ سالہ و لے ہی ہیں گرم چہ ہونٹوں کو چھایا ہے  
 کوئی کہتا ہے پاؤں جو شہجے سے سکڑتے ہیں  
 کہ فطرت سے یہی قانون میں میں نے پڑھایا ہے  
 کوئی کہتا ہے یہ سریش غزیری ہے کہ نہیں  
 سبھی اجزا ہیں بارد بن رہے تفسہ سا تو لایا ہے  
 کوئی کہتا ہے روغن دیکھنے با دام منقشر کا  
 یہ نکتہ مرتے دم استاد نے مجھ کو سکھایا ہے

یہ سودا عشق ہے تیرا یہ تپ سوزِ غریبی ہے  
کہ بے جا گرمی صحبت نے تیرا جی جالیا ہے

صدائے و صدر کا باعث بھی تیری بددماغی ہے  
اگرچہ صحبتِ ناصح نے بھی سر کو پھرایا ہے  
یہ طویل قطعات صرف اس مقصد سے یہاں نقل کئے گئے ہیں کہ ان سے مومن کی  
یہ تصویر سامنے آجائے کہ حکیم مومن خان صرف عشق و معشوق کے شاعر نہیں تھے، بلکہ  
کامل طبیب ہیں۔

ان میں طب کی تمام اصطلاحوں کا ذکر ہے۔ تمام امراض کا بیان ہے۔ مومن نے  
اپنے عم بزرگوار کو ان دونوں قطعوں میں بہت بڑا طبیب بتایا ہے۔ لیکن وہ بھی ان  
کے مرض کا علاج نہ کر سکے۔

### تصانیف :-

مومن کا اردو کلام تو ان کی حیات میں ہی ان کے شاگرد مصطفیٰ خان شہید  
نے ترتیب دے کر اور اس پر ایک دیباچہ لکھ کر ان کی زندگی ہی میں شائع کر دیا تھا۔  
لیکن فارسی کلام حکیم احسن اللہ خان نے ۱۲۷۱ھ میں مومن کی وفات کے تین سال  
بعد مطبعِ سلامانی میں اپنے اہتمام سے چھپوا کر شائع کیا تھا۔

مومن کے اردو کلیات میں صرف ۹ قصیدے ہیں ان میں سے سات کے مضمون  
دینی ہیں۔ صرف دو قصیدے دنیاوی شخصیتوں کے بارے میں ہیں۔ ان میں بھی مومن  
نے قصیدے کا روایتی انداز اختیار نہیں کیا ہے بلکہ ان کے انداز اور  
کہن ہیں جن سے ان کے مخصوص مزاج پر روشنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قصیدے  
عام قصیدوں کے مقابلے میں مختلف نظر آتے ہیں اور ان میں ایک نئے رنگ و آہنگ  
کا احساس ہوتا ہے۔

قصیدوں کے بعد اس کلیات میں غزلوں کا حصہ ہے اور اس حصہ میں مومن  
کی کل دو سو اٹھارہ غزلیں اور متعلق اشعار شامل ہیں۔ غزلوں کے بعد قطعاتِ رباعیہ  
اور چند معتمے ہیں۔



دیوانِ مومن میں مومن خان کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے یہ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ پھر کچھ تاریخیں ہیں ان تاریخوں کے موضوعات مختلف اور متنوع ہیں۔ انشاءً مومن۔ مومن کے فارسی خطوط کا مجموعہ ہے ان خطوط کو حکیم احسن اللہ خاں نے مرتب کیا تھا اور اپنا ایک دیباچہ شروع میں درج کیا ہے۔ یہ تین ابواب پر مشتمل کتاب ہے۔ حکیم مومن خاں مومن طبیب تو تھے ہی لیکن وہ پیدائشی شاعر تھے اور غزل ان کا خاص میدان تھا۔

طبی معرکے :-

حکیم مومن خان مومن اپنے اجداد کے آبائی مطب میں مریضوں کا معائنہ کر رہے تھے کہ ایک خاتون جو ارباب عیش و نشاط کے طبقہ سے متعلق تھیں تشریف لائیں اور مستورات کے گوشہ میں جا بیٹھیں۔ وہ غائبانہ طور پر حکیم مومن خان مومن کی رنگ شاعری کی مداح تھیں اور علاج و معالجہ کی معتقد۔

حکیم صاحب کے چند شاگردان رشید جو عام طور پر درواخانہ کی زینت بنے رہتے تھے اور احباب جو گاہے گاہے مطب میں آکر حکیم صاحب سے فیضیاب ہوتے تھے۔ مریضوں سے رخصت ہونے کے بعد دریافت کیا کہ فلاں خاتون کون تھیں؟ مریضوں کے اژدہام میں حکیم صاحب بغور کسی مریض پر ذاتی حیثیت سے توجہ نہ دے سکتے تھے۔ حکیم صاحب نے دریافت کیا کون مریضہ؟

احباب نیز شاگردوں نے جواب دیا وہی خاتون جو گوٹہ لچکے کا ڈوپٹہ پہنے تھیں۔ حکیم صاحب فوراً سمجھ گئے کہ یہ ان مریضہ کی جانب اشارہ کر رہے ہیں جو ارباب عیش و نشاط کے طبقہ سے متعلق تھیں۔

شاگردوں کی موجودگی کے پیش نظر احتیاطی طور پر جواب دیا اچھا وہ۔ خمیرہ گاؤربان سادہ بورق نصرۃ آمینختہ۔

ایسے ہی ایک موقع پر حکیم مومن نے مریض کو اپنے مطب میں دیکھ کر ایک نسخہ تجویز کر دیا اور عطار خانے سے دوائیں خرید کر استعمال کرنے کو کہا۔ چند یوم کے بعد وہ مریض حکیم مومن خان کے آبائی مطب میں پھر حاضر ہوا۔ جب اس مریض کا نمبر آیا

تو حکیم صاحب نے نسخہ طلب کیا۔ مریض نے بڑے تعجب سے کہا کہ۔ حکیم صاحب وہ نسخہ تو اُبال کر پی گیا۔ اور دو یوم برابر پیتا رہا ہوں۔ نصف افاقہ ہو گیا ہے۔ وہی نسخہ پھر دیدیجئے۔ تاکہ دو یوم اور پی لوں جو نصف مرض رہ گیا ہے تاکہ وہ بھی ختم ہو جائے۔ حکیم صاحب نے مریض کی فرمائش کی تکمیل کی اور نسخہ لکھ کر دے دیا۔

اس مریض نے دو یوم مزید حسب سابق یہ نسخہ بھی استعمال کیا اور فائدہ ہو گیا۔ شاگردوں کے استفسار پر جواب دیا کہ چونکہ اس کو اعتماد ہو گیا تھا اس لئے ایسا ہی کیا۔ اگر ٹوکتا یا غلط استعمال کرنے پر اس کو ہدایت دیتا تو وہ نصف افاقہ سے محروم رہ جاتا۔

چونکہ حکیم مومن خان مومن عملیات نیز تعویذ دینے کے لئے مشہور تھے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ اسی عمل کے دباؤ میں ہوا ہو۔

# حکیم محمود خاں دہلوی

۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۱۶ء ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۹۰۰ء

حاذق طبیب اور ماہر جنسیات

سیخ الملک حافظ اجمل خان کے والد گرامی حکیم محمود خان طب کی اُن مایہ ناز گرامی قدر ہستیوں میں ہیں جنہوں نے غدر ۱۸۵۷ء میں غریب، مساکین و مظلوموں کا بھرپور ساتھ دیا اور اس پاداش میں جیل کی تنگ ڈھاریک سنگلاخ مقام پر بند بھی رہے۔ قومی یک جہتی اور چھو اچھوت کے خلاف حکیم محمود خان نے اس وقت تحریک چلائی جب اس جذبے کا وجود نہ تھا۔

دہلی کی تاریخ بھی ایک عجیب تاریخ ہے اس کی تاریخ بے شمار انقلابات خون چکل واقعات، ناگہانی آفات اور ہر طرح کے خون آشام حادثات سے پُر ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی شہر ایسا ہو جس نے اتنے مصائب دیکھے ہوں۔ زمانہ اور رفتارِ زمانہ کے مطابق سرد و گرم سہا ہو۔ یہ دہلی اور صرف دہلی ہی کی قسمت ہے۔ کہ اس نے یہ تمام انقلابات خود دیکھے ہیں۔

خاندان :-

حکیم شریف خان کے وارث طب حکیم صادق خاں کے تین فرزند تھے (۱) حکیم غلام محمد خان (۲) حکیم غلام محمود خان (۳) حکیم غلام مرتضیٰ خان۔ اول حکیم غلام محمد خان اپنے والد ماجد کی حیات ہی میں ۳۳ سال کی عمر میں رحلت فرما گئے تھے۔ اور آخری صاحبزادے حکیم غلام مرتضیٰ نے ۱۲۹۲ھ بمر ۵ سال میں مالک حقیقی سے جملے۔



سلیم آودغان

ہاں اپنے گھر کے اسیاتن کو باہر لے کر اپنے خاندانی غلطیوں کے اس میں شہت  
اور ان کا خاندان تو میری پڑوسستان کا مشہور خاندان ہے۔ ان کے خاندانی غلطیوں کے

### پیدائش

عظیم محمود خاں کی پیدائش کو شہادتانی کے زمانے ۱۲۲۵ھ میں ہوئی۔ ان کے والد اعظم حکیم صادق خاں صاحب شہادتانی کے زمانے میں  
کنگنہ اور اس وقت وہ شہادتانی کے زمانے میں تھے۔

### تعلیم و تربیت

عظیم شہادتانی کے والد اعظم حکیم صادق خاں صاحب شہادتانی کے زمانے میں تھے۔ ان کے خاندانی غلطیوں کے  
ان کے تعلیم کی ابتدا گھر کے مدرسے میں ہوئی اور پھر شہادتانی کے زمانے میں ہوئی۔ ان کے والد اعظم حکیم صادق خاں صاحب شہادتانی کے  
ان کے والد اعظم حکیم صادق خاں صاحب شہادتانی کے زمانے میں تھے۔ ان کے خاندانی غلطیوں کے

### تعلیم و تربیت

عظیم کی تعلیم کی ابتدا اپنے بڑے بھائی عظیم غلام محمد صاحب شہادتانی کے زمانے میں ہوئی۔ ان کے والد اعظم حکیم صادق خاں صاحب شہادتانی کے

عظیم محمود خاں کو اپنی جوانی میں شہادتانی کے مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ان کے والد اعظم حکیم صادق خاں صاحب شہادتانی کے

ان کے والد اعظم حکیم صادق خاں صاحب شہادتانی کے زمانے میں تھے۔ ان کے خاندانی غلطیوں کے  
ان کے والد اعظم حکیم صادق خاں صاحب شہادتانی کے زمانے میں تھے۔ ان کے خاندانی غلطیوں کے

درزند و موج فتن در رسید۔ اٹنی جناب ممدوح و ولایت حیات بجان  
 آفرین سپردند و عہدہ طبابت نامزد خانہ دانی بنام این گننام مقرر گشت  
 از آنکہ جناب بجائی صاحب قبلہ حکیم غلام محمد خان صاحب در حیات  
 جناب ممدوح رحلت فرماتے عالم بقا بودہ باشند و برادر ازجان ہنر حکیم  
 غلام مرتضیٰ خان بوجہ ملازمت بہ سرکار پٹیالہ تیارم داشت۔۔۔۔۔

## قومی و ملی کارنامے۔

دہلی کے پُر آشوب دور میں جب کہ چہار جانب بدامنی، خون خرابہ تھا۔ علم و ادب  
 علوم و فنون کا نہ کوئی مرکز تھا اور نہ ہی گہوارہ۔ ایسے حالات میں دیگر زبان والوں اور  
 اہل علم و فضل کے ساتھ خاندان شریفی کے افراد بھی دہلی ریاستوں سے وابستہ  
 ہوئے لگے تھے۔ اور دہلی کے دیگر خاندانوں کے ساتھ ساتھ خانان شریفی کے بھی  
 بیشتر افراد و ارباب علم و فن و ہنر لکھنؤ، رام پور، پٹنہ، کلکتہ اور ہندوستان آج کے  
 ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ایسے حالات میں دہلی ریاستوں کے خاندان و اہل  
 ریاستوں نے عہدہ منقلب کے ان جواہر پاروں اور جواہر بنوں کو جہاں پایا  
 لیا۔

حالات کی نزاکت اور دہلی کے متعدد بار لگنے اچھلنے سے تنگ آکر حکیم محمد  
 خان کے برادر کلال حکیم غلام محمد خان پانچسو روپیہ ماسوار و وظیفہ پر مہاراجہ  
 پٹیالہ کے وہاں منسلک ہو گئے تھے۔ اور وہیں رہنے لگے تھے۔ اس کے بعد  
 ان کے عہدہ داروں نے غلام اللہ خان بعد میں جن کی دختر سے غلام محمد خان  
 خان کی شادی ہوئی تھی اور چھوٹے بھائی حکیم مرتضیٰ خان بھی پٹیالہ سے منسلک  
 منسلک رہے۔ خود حکیم محمود خان ریاست جہند کے راجہ فرید شاہ کے معالج  
 خصوصی تھے۔ اور ریاست جہند سے ماسوار و وظیفہ پاتے تھے۔

حکیم غلام محمد جو ان کے نہ صرف بڑے بھائی ہی تھے بلکہ محسن اور مہربانی بھی تھے  
 اور ساتھ ہی ساتھ استاد طب بھی۔ حکیم غلام محمد نے حکیم محمود خان کا عہدہ ۱۸۵۷ء  
 میں بہت ساتھ دیا اور ان حکیم غلام محمد کے خاندانی اثرات نے خاندان شریفی کو

تیار ہیں۔ بچا لیا اور نہ بچا گیا۔ کے اپنے پڑا آشوب دور میں خاندان شریفی اور تلی ماروں کے مرکز میں شریفی منزل تباد و برباد ہو گئی یہ تھی۔ غلام احمد نے مختلف علوم و فنون میں متعدد کتب تحریر کی ہیں۔ جس سے ان کی صداقت اور قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

## تصانیف :-

خاندان شریفی میں حکیم محمود خان وہ پہلے حکیم ہیں جنہوں نے زندگی بھر اپنا روزنامہ لکھا اور یہ ایک ایسا شیہ بہا ذبیحہ ہے وہ اپنی اولاد کے لئے چھوڑ گئے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

ان کے ساتھ ساتھ فالون شریفی وہ کتاب ہے جس میں خاندانی حالات درج کئے۔ اکثر روایات کا سرچشمہ حکیم محمود خان کی یہ تصنیف ہے۔ لیکن بعض روایات و حکایات پر یہ مشابہتیں معلوم ہوتی ہیں۔

حکیم محمود خان کا سب سے بڑا کارنامہ میدان تصنیف و تالیف میں یہ ہے کہ انہوں نے زمانہ قدیم میں جنسیات جیسے خشک اور اچھوتے موضوع پر تصنیف نامہ فرمائی کی بلکہ ایک ایسی جامع اور منفرد کتاب لکھی جو آج کے دور میں بھی انتہی کم روایت ہے۔ جتنی بھی قبل از زمانہ تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلد اول - باب اول -

ان دونوں کتابوں کا ایک ہی موضوع ہے۔ یعنی جنسی مسائل اور امراض باہمیہ و نظریات باہمیہ۔ حالانکہ ان کے اجراء بھی اپنی تمامتہ کوششیں تجربات باہمیہ پر مبنی کرتے رہے تھے لیکن حکیم محمود خان نے جس انداز سے ان امراض کی ماہیت اسباب و علامات پر زور دیا وہ صرف انہی کا حصہ تھا۔ حالانکہ آج یہ موضوع جنسیات ہو کر ایک مضمون کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

## نقد و ملاحظہ :-

حکیم غلام محمود خان اپنے دور کے مشہور طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے

خدا دوست متقی اور پرہیزگار انسان تھے حکیم محمود خان کی شرافت اور اعلیٰ طبیعت کا اندازہ اس سے ہوگا جو انھوں نے اپنے خاندان کے لئے فارسی میں ترمیر کی تھی۔  
ترجمہ حسب ذیل ہے۔

انصاف کا دامن نہ چھوڑیں۔ یگانگت اور دوستی کا خیال رکھیں۔ نہ گز کسی آدمی کو برائی سے یاد نہ کریں۔ غیبت نہ کریں۔ مال حلال ذریعہ سے حاصل کریں۔ مصونہ ما یتیم کے مال کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھیں۔ جوئے، شراب، بھری سونگڑ، نشہ اور اشیاء سے پرہیز کریں۔ بھلائی کے کاموں میں بڑھ کر حصہ لیں۔ محتاج اور پسماندہ افراد کی خاص طور پر مدد کریں۔ مرض کی تشخیص کے بغیر ہم گز علاج نہ کریں۔ اس سے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں گرفت ہوگی۔

حکیم محمود خان کے مزاج میں غنیمت کے ساتھ حد درجہ غیبت تھی۔ خواہ کچھ بھی ہو اپنی حیثیت کو قربان کرنا گوارا نہیں کرتے تھے ایک بار کاہنہ نے کہا کہ آپ کے لئے والی ریاست نے ان کو گرام اور معاوضے پر علاج کے لئے انچور ریاست بھی بلا یا۔ مہاراجہ پرانے خیالات کے آدمی تھے اور کسی غیر بندہ کو ان کے پاس سے اپنے آپ کو بخش نہیال کرتے تھے۔ جیسا کہ آج کل چھوٹا بھوتہ واندہ ماننے میں۔ حکیم صاحب حسب معمول وعدہ کے موجب بوٹت سے مریش یعنی مہاراجہ کی نبض دیکھنے حاضر ہوئے۔ نبض دیکھا کہ حسب معمول مہاراجہ کے ملازمین سے کہنا وہ مہاراجہ کا ہاتھ دھلائیں۔ حکیم محمود خان یہ دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوئے اور انھوں نے مہاراجہ کے سامنے اپنے ملازم سے کہا کہ پانی لا کر میرے ہاتھ اور اڑھتالے کیونکہ مہاراجہ کا ہاتھ چھو جانے سے میرا ہاتھ بخش ہو گیا ہے۔ مہاراجہ نے میرا حیران اور متحیر رہ گیا۔ کیونکہ کسی ریاست میں فرمانروا سے ایسا نہ کہہ سکتے تھے۔ کہنے کی کسی میں جرأت نہیال تھی۔ اس کے بعد حکیم نے کہا کہ ہاتھ دھلوا کر وہاں سے چل پڑے اور مہاراجہ کے آدمیوں کے اشارے پر بھی وہاں نہ رٹے۔

اسی طرح ایک واقعہ مزید ہوا۔ چونکہ حکیم محمود خان پر اسٹے ریاست کے ایک نہایت بار دفع بزرگ اور غریب، پرہیزگار، ان کا مطلب بلا شہرہ منبع خلایق تھا۔ ان کے مطلب میں ادب و تہذیب کا ایک جیسی بنگلہ بھی ہوا۔



مزبور ایسا ہوا کہ کسی سیر سے موجود مہمانوں میں سہفت کر کے کسی نہ پہا سے پہلے نبض رکھائی جائیں اور حکیم صاحب کے اسے سخت زجر و توبیخ کی۔ جو امر ا حکیم صاحب کی عادت سے واقف تھے وہ اس کا بڑا انبیال رکھتے تھے کہ حکیم صاحب کی مرضی کے نطائ کوئی بات نہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ حکیم صاحب بھی کبھی اہل زر سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔ اور واپس ریاست اگر نطائ کے لئے بلاتے تھے تو ہزار خوشامووں اور التجاروں کے بعد تشریف لے جایا کرتے تھے۔

**شہری رحمانیات**

ان صاحب کے ساتھ حکیم مہودیان کی اصل خوبی یہ تھی کہ وہ غدر ۱۹۵۵ء کی آڑوائش سے جس بل کے گزرتے وہ ایک نیا امرس عام یا عمل اور صوفی صافی کے لئے مزہب تھی۔

میں نے یہ سب سیکھی کہ تمام علمی مسائل مختلف میں علم الیقین اور دیک تھا تو وہ سب ہی رحمانی کی تھی نہایت شہداء آفاق تھی۔ یہ ان کا بزرگ اور ان مہودیان کے کون سے فی جہلی اللہ کرتا تھا اور اس سے اس کے ساتھ سے دیکھا گیا تھا کہ حکیم مہودیان سے اپنی ذات کو جامع مہمان و کمالات بنا کر سب سے اعلیٰ مراتب دینی اور اخلاقی پروردگار بنا لیا تھا۔

حکم مہودیان اللہ عزوجل کا پروردگار اور اس کا پیکار ہیں یہ تھا کہ وہ رات کے دہ بجے پروردگار کے شہادت دیکھنے لگے اور صبح تک سوز و غمالت میں مشغول رہتے۔ صبح کو اول نماز پڑھ کر کھڑے ہو کر اور محبوب الہی سلطان المشائخ شہادت دیکھا اور ان کے شانہ بر ترقی ہو گئی کے کے حاضر ہونے بعد ان کے منہ پر کھڑے ساتھی کے طلب میں کشمکش لگنے اور دن کے ۱۲ بجے تک طلب ہوئے تھے اس کے بعد کھانا کھا کر اجہاب کے بتھکن جلسہ مذاق اور شہر میں مشغول ہو جاتے تھے۔ شام کو بعد عصر طلب شروع کرتے تو شب کو جب عزم کرنے لگتے اس کے بعد شب کو کھانا کھاتے اور نماز عشاء اور نمازات کے نماز شروع کر کے راستہ کو آرام دہانے لگتے تھے۔ دن کے کھانے

سے فارغ ہو کر روزانہ فروغ کھینٹتے تک پہنچے اپنا روزنامہ تحریر فرماتے۔ بچہ احباب کی  
 جانب مٹو نہ ہونے تک۔ وہ معروف و معزز اور شہرت یافتہ امر و نواہی کے پابند تھے۔ یہ  
 درویش صفت درویش مشہور اور معاصر نسبت فرماتے۔

خود حکیم احمد زمان سے اسٹڈی والڈ جہد حکیم محمود زمان کی نسبت فرمایا ہے کہ  
 وہ ان کو فن طبع کے بلند مشکلی اور پیچیدہ اختلافی مسائل کے متعلق سوچیں و حاصل  
 تھا۔ ان کا فیصلہ ناطق اور نکتہ و مشہور کی گہرائی سے بااثر ہوتا تھا۔

حکیم محمود زمان ایک جامع صفات و کمالات طبیب ہیں جنہیں کئی بکے علم کمالات  
 اور روحانیت کی وجہ سے قدرت سے ان کو ایسا دست شفا عطا کیا تھا جس کی وجہ  
 سے دنیا کے طبیب میں ان کو اپنے اسطاعت سے بھی زیادہ ممتاز اور سر بلند کر دیا تھا۔  
 ۱۹۳۰ء کے لرزہ خیز زمانہ اور دنیا نے حکیم محمود زمان سے جو اپنی شہرت  
 دیکھی اس سے متاثر ہوئے اور وہ ایک سب سے حساس دلی و شہوت سے کئے  
 جاتے اور شہر و دنیا کے مہذب، متعلم، شعرا، ادیبوں کے احباب و دوستوں  
 کے خواہم کے ساتھ لڑی ہوئی تھی کہ سارا کتب خانہ انگریزی علمات میں لگا کر  
 اور کسی بھی نکتہ یا مشورے پر کڑک لیا جائے گا تو بلا تردد اس کو ہراساں کر دیا  
 بلکہ حکیم زمان کے جسٹس انتہا پہنچا اس کا حال و اسباب، مگر خدا کرے یا جائے تو اس  
 کو اور بھی زیادہ شہرت کیونکہ اس کا ایک شہادہ ہیں جو کتب خانہ جو ہار کتب خانہ  
 کراچی کے کسی ہی واقعہ پر لڑائی ہوئی۔ عجیب سے صورتحال کی کہ نہیں ہے وہ  
 حالات تھے، ان کے بڑے بھائی کی درخواست پر مہاراجہ پھیلائے کچھڑوں کی  
 قوت انہیں کہ دوا شہر، شہرین، منڈلی کی محفوظیت کے لئے۔ میں نے یہ سب  
 معلوم ہوا ہے۔ ان کے لئے تقریباً مشکل کو ہاں ہاں انہیں آیت اللہ علیہ السلام  
 کے درویشوں نے بھی جو جانا وہ اپنے کو داسا لایا کہ میں نے کچھ لکھا ہے۔

۱۹۵۰ء کو دلی پر جب ہانپوں کا قبضہ ہو گیا اور پھر اشتہار کے  
 ہانپوں کے دورِ قبضہ اور فتنے اپنی اور فرقہ گاہ دلی کا ماحول ملک نے پورا  
 مظاہر ہوئی کی شکست سے بعد جب ان کی وہی دلی تھوڑی کہ کچھ کے اشتہار  
 کے حکیم محمود زمان کی مخالفت میں قندھار کی شہر کے لئے کہیں مشکل میں ایسا



ان کی پوری عزت کی گئی۔ مرزا غالب جو حکیم محمود خان کے پڑوسی تھے اور قریب ہی کے مکان میں مقیم تھے انہوں نے اپنی تصنیف دستنبو میں نقل کیا ہے۔

۱۸۵۸ء کے آغاز میں جنوری کے مہینہ میں ہندوستان یوں کی خطائیں معاف ہوئیں اور لوگ شہر پھر واپس آنے لگے۔ اسی اثناء میں حاکم شہر کو پھلی خوروں نے تیر دی کہ راج فریندر بہادر کے معالج یعنی حکیم محمود خان کا مکان مسلمانوں کے لئے جائے پناہ بنا ہوا ہے اور بہت تکلیف ہے کہ ایک دو ماہ بھی ان لوگوں میں رہوں۔ چنانچہ ۱۲ فروری سے شنبہ کے روز حاکم شہر دوڑے کر آگیا اور مالک خانہ کو مع ساتھ آدیسوں کے پکڑ کر لے گیا۔ اگرچہ چند روز تک سب کو حوالات ہی رہی لیکن حکیم صاحب کی عزت کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا۔ بالآخر حکیم محمود خان حکیم متضی خان اور ان کے چچا زاد بھائی حکیم عبدالحکیم خان کو واپسی کی اجازت ہو گئی ۱۲ فروری کو کچھ اور لوگ چھوڑ دیئے گئے۔ ۱۳ فروری کو تین اور نئے رہائی پائی۔

اس واقعہ کا ذکر غلام رسول نے جو غالب کے ہم عصر اور فقیہ دوست تھے اپنی کتاب غالب میں بھی کیا ہے مگر ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

تو تک حکومت وقت کو کوئی ثبوت نہیں مل سکا تھا اس لیے اور خاندانی اثرات اور ذاتی شخصیت ایسے موقع پر کام آئی ورنہ اگر ثبوت بناوت مل جاتا تو وہی زندہ بچنا محال ہو جاتا بلکہ شہین منزل کی ایٹ سے ایٹ بجادی جاتی۔

اس پر آشوب دور میں شہا ہی طبیب حکیم حسن اللہ خان بن پرائمریوں کی جاسوسی اور بہادر شاہ ظفر کی تباہی کا الزام تھا ان کی جانب سے عوامی دباؤ کی بڑھتی جارتی تھی۔ دوسری جانب خانہ ان شریفی کی خدمات اور غلام محمود کی خدمات زمانہ خدیں باشن گان دہلی کے ساتھ ہندوستان میں کی گئی تھیں۔ ان کے عوامی کی عوامی مقبولیت اور صداقت و اباقت کی بنا پر حکیم محمود خان اعظم کا مطلب بہت کامیاب ہو گیا۔

حکیم محمود خان کو نئے نئے نصاب اور نئے نئے نصابوں کے طاقانے تھے۔ ترممانی خون سے ان کا چہرہ روشن تھا۔ پیرانہ سالی میں بھی مدانہ و جاہت ان کے چہرے پر نمایاں تھی۔ لانسبا قدر مناسب اعضا جسم کی رنگت سے وسیع

میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ ایک شخص اس قدر بے پروا ہو کر اپنے آپ کو اپنے آپ سے الگ کر دے۔

میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ ایک شخص اس قدر بے پروا ہو کر اپنے آپ کو اپنے آپ سے الگ کر دے۔

میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ ایک شخص اس قدر بے پروا ہو کر اپنے آپ کو اپنے آپ سے الگ کر دے۔

میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ ایک شخص اس قدر بے پروا ہو کر اپنے آپ کو اپنے آپ سے الگ کر دے۔

میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ ایک شخص اس قدر بے پروا ہو کر اپنے آپ کو اپنے آپ سے الگ کر دے۔

میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ ایک شخص اس قدر بے پروا ہو کر اپنے آپ کو اپنے آپ سے الگ کر دے۔

میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ ایک شخص اس قدر بے پروا ہو کر اپنے آپ کو اپنے آپ سے الگ کر دے۔

میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ ایک شخص اس قدر بے پروا ہو کر اپنے آپ کو اپنے آپ سے الگ کر دے۔

بے حقیقت اس نے سمجھا مال و دولت کو سدا  
 گو طبیب اور ڈاکٹر تھے شہر میں بے انتہا  
 تھے برابر اس کے نزدیک اغنیا اور سب تو  
 کوئی مفلس کا نہ تھا پر سان حال اسکے سوا  
 کرتے ہیں جو دعویٰ بہدردی نوع بشر  
 اس نے باطل کر دیتے تھے انکے دعوے سر بسر  
 گو کہ جلتے تھے شفا خانوں کو خاص و عام سب  
 نطق کا پھلجا اور ادویٰ اسی کا تھا مطب  
 پرالنجہ جاتے تھے سمیت امراض میں بیمار جب  
 اس کے بیماروں کو گونا گویا پس ہوں یا جاں بلب  
 سو تدبیر و معالج کی خطا کا ڈرنہ تھا  
 موت کا ڈر تھا مگر مہلک دوا کا ڈرنہ تھا  
 اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم محمود خان عوامی طور پر کتنے مقبول اور معروف  
 تھے۔ شاعر کی آواز قوم کے جذبات کا آئینہ ہوتی ہے۔ اس سے جہاں حکیم صاحب  
 کی قابلیت عزت اور شہرت کا پتہ لگتا ہے وہیں ارباب علم و فن و فنکاروں کا حکیم محمود خان  
 سے قربت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

پسماندگان :-

حکیم محمود خان نے اپنے بچے پانچ اولادیں چھوڑی تھیں ۲ دختران اور ۳ پسران  
 جوان کی علمی ادبی افتخاراتوں کے حقیقی وارث ثابت ہوئے اور انھوں نے اپنے  
 باپ کے نام کو مزید چمکایا۔ سب سے بڑے حکیم عبدالحمید خان۔ منجملے حکیم واصل خان  
 اور سب سے چھوٹے حکیم اجمل خان۔  
 سب سے بڑی وراثت جو حکیم محمود خان نے اپنی اولاد کے لئے چھوڑی وہ علم  
 و چیزوں پر مشتمل تھی۔ ایک اخلاق انسانی اور جذبہ خدمت خلق۔ وہ علم و فن  
 اپنے فن کی محبت۔ دنیا کے مال و منافع سے انھوں نے بہت کم حصہ لیا تھا۔  
 طبی معرکے :-

حکیم محمود خان کے مطب میں مرضاء کی لائن لگتی تھی اور ہر مریض لائن میں بیٹھ  
 جاتا تھا۔ جب اس کا نمبر آتا تو دکھاتا تھا۔ امیہ نمیب کی تفریق نہ تھی۔ بال اگر کوئی بیچیدہ

پاکستان میں آج کل اس کی بات دوسری تھی

ایک دن حکیم صاحب کو ایسا ہی غیرت سے اپنا ہاتھ دکھارتے تھے کہ اتنے میں ایک بڑے  
 شخص نے حیرت سے ہنسنے شروع کیے ساتھ حکیم صاحب کے مطلب میں آتے تھے اور  
 انھوں نے ادارت کے کئی کاموں پر حیرت کی کہ ایک غریب شخص جو اپنا ہاتھ حکیم صاحب  
 کی جانب سے کھینچنے کے لئے بڑھا چکا تھا اس غریب کو پیچھے ہٹا کر وہ خود آگے  
 بڑھ گئے۔ پھر حکیم صاحب نے ان بڑے امیر و کبیر شخص پر ایسی خفگی ظاہر کی کہ  
 شاید زندگی میں پہلی بار اس شخص کا رشتہ دولت کو مستلیم ہوا ہو گا کہ اس کی راجی  
 عدالتی میں لایا گیا ہے جسے جے جہاں غریب کا حق مارنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

ان حکماء کے واقعات کے انداز سوچ و فکر دیانت داری اور غبار پرستی کا  
 اندازہ تو ہوتا ہی ہے وہیں طلب کی جادو ٹھہری کا جس احساس ہوتا ہے۔  
 حکیم محمود خان کے سینکڑوں طبقہ مع کے اور فنی معجزے ہیں ان کو ایک واقعہ  
 یہ اندازہ دیا گیا ہے کہ ان میں بھی شامل کیا تھا۔

ایک دفعہ رسالہ زبان کے مدیر صاحب کی والدہ کو گرمی کے موسم میں ٹھیک  
 وسیع کو کسی مٹھی ٹارو دے دیا۔ لگا لگا ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ گلے میں بلغم بولنے  
 لگا۔ نہ بخیر ہو گیا۔ آنکھیں پونے لگیں۔ اور وہ ہمیشہ سو گئیں۔ مکان کے باہر ہی  
 ایک نوٹیشن نامی ویدک رہتے تھے ان کو بلا کر دکھایا گیا۔ انھوں نے تجویز کیا کہ سردی  
 اور ہوائی سہارا سے بھر کر مرض بہت بڑھ گیا ہے۔ جانی ہی کی کوئی امید نہیں۔ بہر حال  
 انھوں نے بھروسہ کی کہ اگر وہ حلق سے نیچے نہیں اترتی تا جا رہا والد صاحب  
 گھبراہٹ سے بھر کر انھوں کی خدمت میں پہنچے۔ حکیم صاحب مکان کی چیت پر ایک  
 چوڑی سیڑھی باندھ کر بیٹھے تھے۔ والد صاحب حوائی میں محو تھے۔ والد صاحب چوڑی  
 سے گھٹکتے گئے اس سے وہیں جا پہنچے۔ اور مریض کا حال بیان کیا۔ آپ نے جگہ  
 لہو لہا۔ بار بار غلاب پلا دیا۔ ان کے والد صاحب بہت متعجب ہوئے  
 کہ جہاں شہرت غلاب اور جہاں بھیروں۔ قیمت میں زمین و آسمان کا فرق نظر آکر  
 پھر تھوڑی دیر میں حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت شہرت غلاب کے  
 سہتہ ہی مریض کی حالت تو اور بھی دگرگوں ہوئی۔ میں نے آپ کے کہنے سے شہرت

پلایا ہے۔ اگر خدا نخواستہ وہ مر گئی تو میں قیامت کے دن آپ کا دامن پکڑوں گا۔  
 حکیم صاحب نے فرمایا۔ کیوں جھوٹ بولتا ہے۔ تو مجھے خواہ مخواہ دھوپ میں دق  
 کرنا چاہتا ہے اچھا چل۔ یہ کہہ کر آپ پا پیادہ ساتھ ہوئے۔ گھر پر آتے ہی ایک  
 لوبے کی نالی سے منہ کھول کر شربتِ عناب پلوایا اور شربت کے پیتے ہی مرئیے کو  
 آرام ہو گیا۔



# ۱۲۷ مطابقت ۱۵ حکیم ابو علی محمد جعفر

## اعلیٰ الشہنشاہ ۱۹۲۲

حکیم حافظ

کچھ لوگ ایسے آگے ہیں جنہوں نے اپنی حیات میں ایسے کام کئے اور کئے  
کچھ لوگ ایسے آگے ہیں جنہوں نے زندگی کا مقصد تعلق ہی رانی خدمت ہی رہا ہے۔  
ان میں حکیم ابو علی محمد ہا نماز ان ہی شامل رہا ہے جن کے خاندان میں اہل  
سے عن طب بنارگان حق کی خدمت کا ایک اہم مقصد حیات رہا ہے۔

خاندان

حکیم ابو علی صاحب کے دادا مرحوم کے عہد سے قبل اپنے وطن پھلی شہر ضلع  
الکشمیر تھوڑے وقت انگریزوں کے غلبے سے بچنے کے لئے تری ولسن کر کے ہا میں  
مکملت اختیار کی۔ وہاں پہلے کئی عہدہ میں قیام کیا۔ ان کے عہدہ اہلے حکیم احمد علی جو  
حکیم ابو علی کے والد تھے اپنے زمانہ کے معزز اور شہرت یافتہ شخص تھے۔ ان کے ہاتھ  
تھے ان کے دادا ایران سے معززین ہند پر وارد ہونے لگے اور اپنے وقت کے  
ایران کے بہترین نیا لوگوں سے متعلق تھے۔

پیدائش

حکیم ابو علی صاحب نے ۱۲۷ مطابق ۱۹۲۲ء میں ہا میں پیدا ہوئے۔

۱۰  
 ۱۱  
 ۱۲  
 ۱۳  
 ۱۴  
 ۱۵  
 ۱۶  
 ۱۷  
 ۱۸  
 ۱۹  
 ۲۰  
 ۲۱  
 ۲۲  
 ۲۳  
 ۲۴  
 ۲۵  
 ۲۶  
 ۲۷  
 ۲۸  
 ۲۹  
 ۳۰  
 ۳۱  
 ۳۲  
 ۳۳  
 ۳۴  
 ۳۵  
 ۳۶  
 ۳۷  
 ۳۸  
 ۳۹  
 ۴۰  
 ۴۱  
 ۴۲  
 ۴۳  
 ۴۴  
 ۴۵  
 ۴۶  
 ۴۷  
 ۴۸  
 ۴۹  
 ۵۰  
 ۵۱  
 ۵۲  
 ۵۳  
 ۵۴  
 ۵۵  
 ۵۶  
 ۵۷  
 ۵۸  
 ۵۹  
 ۶۰  
 ۶۱  
 ۶۲  
 ۶۳  
 ۶۴  
 ۶۵  
 ۶۶  
 ۶۷  
 ۶۸  
 ۶۹  
 ۷۰  
 ۷۱  
 ۷۲  
 ۷۳  
 ۷۴  
 ۷۵  
 ۷۶  
 ۷۷  
 ۷۸  
 ۷۹  
 ۸۰  
 ۸۱  
 ۸۲  
 ۸۳  
 ۸۴  
 ۸۵  
 ۸۶  
 ۸۷  
 ۸۸  
 ۸۹  
 ۹۰  
 ۹۱  
 ۹۲  
 ۹۳  
 ۹۴  
 ۹۵  
 ۹۶  
 ۹۷  
 ۹۸  
 ۹۹  
 ۱۰۰

کے مشہور شہر بنارس میں ۱۲۰۵ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں تولد ہوئے۔

### تعلیم و تہذیب :-

حسب فائدہ و تعلیم کی ابتدا انگریزوں کے بزرگوں سے ہوئی۔ ابتدائی تعلیم سے فائدت کر کے کتب درسیہ فارسیہ کی تعلیم کے لئے مولوی ثناء اللہ کے سامنے حاضر ہوئے اور نئی زبان کی تعلیم کے لئے مولوی عبدالحق جیسے استاد فن کے سامنے رہے۔ ادب تہذیب کیا۔ مولوی عبدالحق اپنے وقت کے مایہ ناز طبیب حکیم شاہ عبدالعزیز میں دہلوی جیسے عالم باعمل کے طبیب وقت کے شاگرد رشید تھے۔ آپ کے زمانہ میں عربی طرز تعلیم دینیات پر مبنی تھا۔ کتب حکمت یعنی علوم عقلی بہت کم پڑھانے پاتے تھے۔ آپ نے عملاً نظام الدین صاحب کا سلسلہ نظامیہ مولوی محمد علی صاحب سے پڑھا جو شارح مسلم کے پوتے تھے۔ اس کے بعد آپ کو جامعہ تعلیم کے لئے لکھنؤ بھیجا گیا جہاں آپ نے مولوی عبدالحق فونکی علی سے درس حاصل کیا اور عالم و فاضل ہوئے۔

### تعلیم طب :-

مولوی عبدالحق فونکی علی سے درسیات کی تکمیل کر کے آپ نے اپنے خاندانی پیشہ طبابت کی جانب رجوع کیا۔ اور کتب درسیہ طب مشہور و معروف طبیب حاذق لکھنؤ حکیم منہد علی لکھنوی سے حاصل کی۔ حکیم ابو علی نے جوہر کے حکیم محمد علی کے مطب میں مسلسل دس برس تک رہ کر علم طب میں استفادہ کیا۔ حکیم محمد علی جیسے صاحب فن و طبیب کامل نے آپ کو امرار سینہ سے بخوبی اس طویل وقت میں واقف کرایا۔ اور حکیم محمد علی سے سند طبابت حاصل کر کے اپنے آبائی وطن ثانی بنارس کے مشہور و معروف محلہ وال منڈی میں اپنے اجداد کے دو خانے میں مطب شروع کیا۔

محلہ وال منڈی بنارس میں آپ کا مطب "جعفریہ دو خانہ" کے نام سے مشہور تھا۔ تقریباً پچاس سال تک برس کزوفاتے مطب لیا، اسی زمانے میں آپ کا انتقال

بحیثیتِ معالج خاص مہاراجہ بنارس کے ہوا۔ اس عہدِ قدیم میں مہاراجہ بنارس سے بطور  
معالج ۳۰ روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا رہا۔

اکثر جوڑوں اور تعلقہ داروں میں معرکہ الآرا علاج و معالجہ کرتے اور آپ کی  
خلعت و انعام سے عزت افزائی کی جاتی اسی طرح آپ کی شہرت در شہرت دیارِ بدیار  
پڑھتی چلی گئی۔ خاص طور پر صوبہ بہار کے شہواراج کی رانی صاحبہ کے ہنوں کا علاج  
اور تعلقہ داروں میں راجہ صاحب یہ پور کے یہاں کینسہ کا علاج، علاجِ سرطان، تقابلی  
ذکر میں بگڑا اکتیاز ہے اور جو غایت شہرت کا باعث ہے۔

دور دور سے مختلف امراض میں مبتلا مریض آیا کرتے تھے اور خدا کے فضل سے  
شفایاب ہو جایا کرتے تھے۔ خدانے آپ کو دستِ شفا بھی عنایت فرمائی تھی۔ طبی بھی  
لاٹھ میں اٹھا کر دے دیتے تو مریض شفایاب ہو جاتا۔ چنانچہ بنارس میں ان کے ایک  
علاج کی بے شہرت ہوئی کہ یہ معرکہ علاج آج بھی زبان زدِ عام ہے۔

## شعری و ادبی ذوق :-

حکیم محمد جعفر صاحب صرف میدانِ طب و حکمت کے ہی شہسوار نہیں تھے بلکہ اپنے  
شعر و ادب کے بے شمار تاجدار تھے۔ انھوں نے جہاں حکمت کے باب میں کارہائے  
نمایاں انجام دیتے ہیں وہیں شعر و ادب میں بھی جو اس کا ثمن حاصل کیا ہے۔

مولانا سید ظفر الحسن صاحب ان کی اس صفت کے بارے میں لکھتے ہیں :-

.. آپ کی طبیعت فنِ شعر و ادب میں نہایت موزوں تھی۔ آپ جناب

حکیم محمد علی حذرتی لکھنوی کے شاگرد تھے اور حزیں و حوم میں انہیں

با کمال شاعر کے شاگرد تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ :-

ہرگز کیونکر نہ غم ہو دل پہ اس استادِ کامل کا

کہ تھا یکتا امیں خوش بیاں صاحبِ کمالوں میں

اس طرح بیک واسطہ و ترا انہیں کے شاگرد تھے۔

تہ کا مہون چن دقتا سے ایک غزل اور ایک قصیدے کے کچھ اشعار بطور

نمونہ کلام پیش ہے۔

## ”قطعات نوروزی“

خدا کہ فیصل مسرت نشاں رسید  
یاد بہار عطر نشاں در جہاں رسید  
خند و چیرانہ غنچہ دلہا کے مومنین  
امروز حق ز فضل خدا بر ممال رسید

دیگر

امروز چشم حق رضا مستقیم شد  
محکم بنا کے دین خدا کے نبیہ شد  
جنت و چیرانہ بازو کے ایماں قوی شود  
پشت و پناہ او چو شد دستگیر شد

غزل

نشام را نہ بود آنجا نشاں جانیکہ من بودم  
ہمہ راز سنہاں بودہ عیاں جانیکہ من بودم  
بیک خود دل نمی گیرند اسباب مسرت را  
متاع درد باشد بس گراں جانیکہ من بودم  
ز خود با سر بکف آیند عشاق اندراں مفضل  
نہ جلد د است نہ تیغ و سناں جانیکہ من بودم  
مثلاں درد ماہا از صفا آئینہ می گیر و  
بپاشد حاجت آہ و فغاں جانیکہ من بودم  
ز تسایم جنوں و بے خودی کارش بکار آئند  
نہ باشد کار عقل نکتہ داں جانیکہ من بودم  
حجابات خودی بودہ ز نور بے خودی مائل  
فنا گشتہ رسید در جہاں جانیکہ من بودم  
بیازارش نہ آرزو خبر بعشق مصطفی جعفر  
گراں قدر ست این گوہراں جانیکہ من بودم

❖ ❖ ❖

## قصیدہ

اے کہ ذاتِ موردِ من عندہ ام الکتاب  
 وبے کمالت مصدرِ من ادنی فصل الخطاب  
 قاسمِ نسیم و کوثرِ ساقی خمِ غدیر  
 رافعِ درجاتِ جنتِ شافعِ یومِ الحساب  
 مطلعِ مہرِ امامتِ منبعِ انسابِ فیض  
 موضعِ علمِ لدنی مجمعِ اُممِ الکتاب  
 پردہِ عصمتِ سرایتِ چادرِ تطہیرِ گشت  
 بارگاہِ بتِ را خدائے عرشِ کردہ مستطاب  
 بارک اللہ رتبہ راہِ نجفِ گردونِ وقار  
 ہیں کہ از کملش فزون شد کیشانِ آبِ وقاب  
 چوں نہ باشد سرمہ چشمِ بصیرتِ آن عبا  
 صجدم روید ز جاروبِ شعاعی آفتاب  
 از علی علم نبوت را اگر خواہی بخواہ  
 بتوان داخل شدن در شہرِ گرامی زباب  
 گر شود از فیضِ دریائے عطایتِ آبگیر  
 گوہرِ شہوارِ بارِ دجلے بارانِ از سحاب  
 چوں نہ باشد حق تو روشن تر از مہرِ منیر  
 شاید حق تو گشتہ وقتِ رجعتِ آفتاب  
 از تجلایے جمالتِ عشقِ شد آمد بہ ہوش  
 چوں گلِ زحمار تو باشی بر موسی کلاب  
 نعمتِ جاوید بر جوانِ علی یغما دہند  
 حصہ از باغِ رضواں گر تو میخوای شتاب  
 دشمنت راز طوافِ کعبہ و سنکش چہ سود  
 بے توالے تو بگردد چوں عملِ نقشِ بر آب

مطلب جعفر پر آپ کو سخت گروہ مقام  
نشست خاکش چوں شود خاک حرم بو تراب

آپ کے اوصاف حمیدہ اور صفات پسندیدہ کے تذکرے بڑے بڑے پڑھوں کی زبان پر اب بھی جاری ہیں۔ مریضوں میں طبیب مہربان، دین داروں میں واعظ خوش بیان، احباب میں تواضع کی جان غرضیکہ وہ ہمہ رخ انسان تھے۔ آپ نے چند رسائل بھی لکھے ہیں جن میں سے نظم کلام میں درجہ سلسلے ”الہام ربانی“، ”ارشاد المفید الہدایۃ الرشید“ چھپ چکے ہیں۔

وفات :-

آپ کا انتقال ۳ ماہیت ۱۹۲۲ء کو ہوا اور روضہ فاطمان میں علامہ شیخ علی حزیں اعلیٰ اللہ مقامہ کے مزار کے متصل آپ کی آخری آرام گاہ ہے۔

آپ کی خطبات اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ شہ بنارس کی کارپوریشن نے نئی سڑک سے جو راستہ دال منڈی کے لئے طے کیا اور جو ویلیو گلی کا بھی پورہ کلاں ریشم کٹہہ پانہ مہان اور دال منڈی ہوئی ہوئی چوک تھانے تک جاتی ہے وہ آپ کے نام سے بلور یادگار منسوب کر دی گئی ہے۔ حکیم محمد رفیعہ سڑک کی ابتدائی سڑک سے ہوتی ہے جہاں کارپوریشن کی طرف سے اس نام کا پتہ لکھا ہے اور یہ آج بھی تقسیم سے قبل کا واقعہ ہے۔ اسی روڈ کے وسط میں حکیم محمد جعفر اعلیٰ اللہ تعالیٰ کا رہائشی مکان واقع ہے۔

شاگرد و پیہانندگان :-

آپ کے کئی شاگرد تھے جن میں اکثر صاحبِ مطلب ہوئے۔ حکیم عبدالرحمن خان اور حکیم شہ حسین نے کافی شہرت حاصل کی

حکیم ابو علی محمد جعفر کے تین لڑکے اور نو بیٹیاں تھیں۔ بہت سے تلامذہ نے حکیم ابو الحسن محمد باقر صاحب ہمیشہ اپنے والد کے ساتھ ہی مطلب کرتے تھے۔ حکیم محمد جعفر کے انتقال کے بعد ۱۹۲۳ء سے خود مطلب چلا رہے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کے پیمانہ گان میں ایک بڑا اور ایک لڑکی تھی۔ ان کے صاحبزادے جن کا نام محمد اطہر ہے، وہ آج بھی کلکتہ میں اپنا مطب کر رہے ہیں وہ کیوں ہیں مشہور و معروف شخصیت کے حامل بھی ہیں۔

حکیم محمد جعفر صاحب کے دوسرے صاحبزادے حکیم ابوالقاسم محمد طاہر چھپرہ صوبہ بہار میں اپنا مطب کر رہے تھے پچاس سال سے رائد بنی مطب کرنے کے بعد عمر پچھتر سال انتقال کیا۔ چونکہ لاوی تھے اس لئے مطب کا سلسلہ بند ہو گیا آپ کا مطب اور تین تلوے پختہ مکانات موجود ہیں ریفٹ فی سہل اللہ ہیں۔

حکیم محمد جعفر صاحب کے تیسرے صاحبزادے حکیم محمد کاظم سے اپنے والد بزرگوار کے مطب کو بہت ہی حسن و خوبی کے ساتھ چلا رہے تھے اور قابل قدر ترقی کی تھی۔ فن طبابت و حکمت میں آپ نے دورِ حاضرہ میں بہت ہی قابل قدر خدمتیں انجام دی تھیں۔ جسے یورپی ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان میں بھی بہت سراہا گیا۔

ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔

- 1۔ خیراتی یونانی اسپتال قائم کیا۔ جو ابھی بھی قائم ہے۔
  - 2۔ آنکھوں کے آپریشن کا اسپتال کھولا جو ابھی بھی جاری ہے۔
  - 3۔ بنارس میں ایک طبیبہ کالج سلفیہ طبیہ کالج کے نام سے جاری کیا تھا۔
  - 4۔ بورڈ آف انڈین میڈیسن کے ممبر ہونے۔
  - 5۔ بورڈ آف میڈیسن کے ممبر چینی ہونے۔
  - 6۔ نومبر 1961ء میں القباہ بن کی آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کرائی۔
- مندرجہ بالا کارہائے نمایاں نے ان کی عزت و عظمت کو عالمی سطح پر بلند کیا۔ حکیم محمد جعفر کو قدرت نے عزت و دولت اور شہرت کے ساتھ ساتھ کثرتِ نسل کی نعمت بھی عطا کی تھی۔ آج ان کی ذلت ان کی اولاد میں امریکہ، مغربی جرمنی، سعودی عرب، کویت اور پاکستان میں پھیلی ہوئی ہیں۔
- موصوف کا عزاخانہ جعفریہ آپ کی رہائش گاہ پر قائم ہے۔ یہاں سیدھی درگاہِ فاطمہاں میں تعمیر کرائی۔ جہاں ایک چتہ میں تاج بنگلہ ہے۔



آں محمد جعفر عینین نفس  
 مندرجہ تاریخ مابہ حسب حال  
 بانہی مسیہ شہرا از لطف کرم  
 حکمت میگرد است این فعل از حکیم  
 ایک وقف بھی قائم کیا تاکہ عشرہ محرم میں مجالس اور رمضان المبارک میں  
 اخطار و نذیرہ کا اہتمام بغیر کسی دقت کے کیا جاسکے۔ اس کے لئے آج سے ستر سال  
 قبل تیس ہزار روپیہ اس وقف کے لئے بینک میں محفوظ کر دیا تھا جو بڑھتے بڑھتے  
 بفضلِ خدا پچاس ہزار روپیہ ہو چکے ہیں۔

معرکے :-

بنارس کی ایک مشہور و معروف شخصیت کی نکسیر بھوٹی اور انتہا سے زیادہ خون  
 جاری تھا کسی حال بند نہ ہوتا تھا۔ حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ صبح کے وقت لوگ آپ  
 کے پاس آئے۔ آپ منہ دھورے تھے اور لوگ نکسیر کے مریض کی دوا کے لئے عجلت  
 کر رہے تھے۔ آپ نے انھیں اپنے منجن سے دو چٹکی راکھ دے دی اور کہا کہ  
 ناک میں کس صورت سے ڈال دیں۔ ایسا ہی کیا گیا۔ خون بند ہو گیا اور وہ اس  
 صورت سے شفا پا گئے۔ اور پھر کبھی یہ شکایت انھیں پیدا ہی نہیں ہوئی۔ شاگردان  
 مرشد کے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ منجن میں ماہشات (خون بند کرنے والی)  
 دوائیں خاص تعداد اور مقدار میں تھیں۔

آپ کی خداقت کا چرچا بنگال، بہار اور مشرقی یوپی میں بھی رہتا۔

# ۱۲۱۶ مطابق ۱۸۵۵ء حکیم حاجی محمد عبدالغزیز ۱۹۱۱ء

تاج الاطباء      بانی ادارہ طب      فخر الاطباء

سزہ میں ہند میں تاریخ طب یونانی کے باب میں فن کو بچانے سوار نے اور آبیاری کرنے میں جہاں چیدہ چیدہ اطباء کا کردار نمایاں رہا ہے وہاں چند خاندان ایسے بھی گزرے ہیں جن کی مساعی جہیلہ کی بدولت طب یونانی ہندی طب کے ساتھ مل کر آج موجود شکل میں موجود ہے جب کہ طب یونانی کی جائے پیدائش یونان تک میں اس طب قدیم کا وجود نہیں ملتا ہے۔

حکیم محمد یعقوب کے خاندان میں ویسے تو لاتعداد قابل اور عاذق اطباء ہوئے ہیں۔ لیکن جو ملکہ حکیم محمد عبدالغزیز کو ملا وہ کسی دوسرے طبیب کے حصے میں نہیں آیا بلکہ علامہ اقبال بڑی مشکل سے ہوتا ہے جن میں دیدہ وریسیدہ حکیم عبدالغزیز کے کارناموں کی بنا پر ان کو وہ عزت و شہرت ملی کہ ان کا خاندان خاندان مستوفی نہ کہہ سکتا کہ خاندان غزیزی کے نام سے منسوب ہوا۔

خاندان ۔۔

خاندان غزیزی کے اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے کشمیر پر جب احمد شاہ درانی نے چڑھنا اختیار کے بعد تباہی مچائی تو بہت سے خاندان اپنا وطن کشمیر چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ ان پناہ گزین خاندانوں میں حکیم عبدالغزیز کا خاندان



حکیم مولوی حاجی محمد عبدالعزیز صاحب بانی مدرسہ طب وریس لکھنوی

بھی تھا۔ لیکن خاندانِ عزیزی کے بانی حقیقی حکیم محمد یعقوب ہیں۔ جن کی پیدائش لکھنؤ میں ۱۷۹۰ء بعہد نواب آصف الدولہ ہوئی تھی۔

## پیدائش :-

محمد عبدالعزیز کی پیدائش یکم محرم ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۳ مارچ ۱۸۵۵ء کو لکھنؤ کے ایک علمی ادبی نیز طبّی خاندان میں ہوئی ان کے والد خاندانِ عزیزی کے بانی حکیم محمد یعقوب کے فرزند حکیم محمد اسمعیل تھے۔

## تعلیم و تربیت :-

تعلیم کی ابتدا حسب دستور پانچ برس کی عمر میں والد اور دادا کی پر خلوص دعاؤں کے ساتھ گھر سے شروع ہوئی۔ ہونہار بروا کے چلنے چلنے پات کے مصداق شروع ہی سے ذہانت و ذکاوت نمایاں تھی۔ ابتدائی درسی کتابوں کی تعلیم کے بعد فرنگی محل کے متعدد علماء و فضلا کے ساتھ مشہور عالم شمس العلماء مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور فارسی و عربی کی تعلیم کی تکمیل کی۔

## تعلیمِ طب :-

سب سے پہلے ان کے دادا حکیم محمد یعقوب نے قانونیچہ پڑھایا بعد ازاں طب کی بقیہ کتابیں اپنے چچا حکیم محمد ابراہیم سے پڑھیں۔  
۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ء میں ان کے والد محترم نے ان کے مطب کے لئے ایک خوب صورت عمارت تعمیر کرائی جہاں پر حکیم محمد عبدالعزیز دو خانہ کر سکیں۔ آج یہ عمارت تکمیل الطب طبّیہ کالج کے نام سے جانی جاتی ہے۔ عمارت پر حسب ذیل اشعار تحریر تھے۔

مسیحائے ثانی ہیں عبدالعزیز اب      مطب کے لئے ان کے یہ گھر بنا ہے  
لکھی کلک الشرق نے تاریخِ ہجری      یہ دارالشفاء ہے یہ دارالشفاء ہے  
بچپن سے ہی علمی ادبی نیز طبّی شوق حد درجہ تھا درس و تدریس کے شوق و رغبت

کے ساتھ مل کر یہی شہسواران پڑھ کر سب ایک نئے نئے بہت جلد قبول ہو گئے۔  
 انسانی تعلیم اور وہ بھی عام دنیا میں ایسے کہ یہاں کے دوران و زمانہ دور دورت  
 کے ساتھ قبول ہوا۔ انسانی تعلیم سب سے پہلے اگر ایک جانب آئے گئے تو دوسری جانب ان کے  
 لیے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ سب سے پہلے۔ افغانستان۔ خارا۔ سمرقند۔ ہرات اور حجاز  
 اور غیرت سے تلبا اور ان کے لیے تعلیم جانے ہوئے تھے۔

مکرم محمد عبدالعزیز نے اپنے ہم عصروں اقطاب میں کلیات قانون کے پڑھانے والوں میں  
 ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ مولانا سلیمان سید عبدالحمید حسنی نے اپنی تصنیف "نورۃ الخوامر"  
 میں لکھا ہے کہ مکرم محمد عبدالعزیز کو اپنے ہم عصروں اقطاب میں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔  
 ان کی خدمت میں جوفی درجہ جوفی اقطاب، کلیات قانون پڑھنے کے لئے آتے تھے۔ ان میں  
 زیادہ تر لیبے اقطاب ہوتے تھے جو اپنے علم و فن کے راسخ ہوتے تھے۔

مولانا ابوالسننات محمد عبدالحمید وحشی مٹھی اور جہتہ العصر مولانا سید یحییٰ سلیمان  
 مولانا سید محمد اسحاق ان کے نام سے یاد کرتے تھے۔

یہ سب بڑے بڑے اسکالر تھے ان کے نہ صرف تعلیم نامزد ہی نہ تھے بلکہ ان کو علوم ظاہری  
 اور باطنی سب سے ڈھنگا اور ان کی علمی قابلیت کی بناء پر ان میں انکا اور شیخ الحدیث  
 کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔ درحقیقہ کے حصار میں ان کے ثنائی کوئی دوسرا فلسفی  
 تعلیم کا نظریہ آتا ہے کیونکہ ان کو طلبہ یونانی کے نظریاتی و اختلافی مسائل کے علاوہ  
 عربی یونانی کے عمادی فلسفیانہ مسائل میں سمجھ حاصل تھا۔

یہ سب میں تعلیم کے لیے سب سے پہلے دستور ایسا تھا کہ فرنگی محل کے علماء اپنے مدرسہ  
 کے متعلقہ محرموں کو اپنی فائدہ عام کے پاس ان کے ادب و ذوق کی تسکین کے لئے  
 اور ان کے تعلیم کے لئے ان کے عقائد کو تعلیم کے لئے فرنگی محل کے مدرسے  
 میں لائے۔ ان کے عقائد میں سے دو اہم مکتبہ فکر کے نام، فلسفیانہ  
 تعلیم کے بارے میں جو ان کے علم کی شہرت و دوروں کے فکر کے حلقوں میں  
 مشہور تھا، یہی نہیں ان کے عقائد میں سے فلسفیانہ کے ساتھ علماء بھی شریک  
 ہوتے تھے اور مستفید ہوتے ہیں نیز مسوس کہتے تھے۔

مکرم محمد عبدالعزیز مولانا الطیف اللہ علی گڑھی ایک مرتبہ لکھنو تشریف لائے

اور اپنے امراض کا علاج حکیم عبدالعزیز سے شروع کیا جب مولانا کو علاج سے اتفاق ہو گیا تو مولانا نے ایک دن حکیم صاحب سے کہا میں نے آپ کے درس کی بہت تعریف سنی ہے کسی وقت خود بھی شرکت کی خواہش ہے حکیم صاحب نے جواب دیا آپ جب چاہیں تشریف لائیں لیکن علماء کے سامنے میرا درس کیا حیثیت رکھتا ہے۔ لکھنؤ سے روانگی سے ایک یوم قبل بغیر اطلاع کے مولانا درس میں خاموشی سے شریک ہو گئے اور کافی دیر تک سنتے رہے درس کے بعد فرمایا حکیم صاحب جیسا میں نے سنا تھا اس سے کہیں بڑھ کر آپ کو پایا۔ میں نے دہلی میں حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں کا درس بھی سنا ہے۔ لیکن آپ کے درس کا عالم ہی جداگانہ ہے۔ یہ طب اور فلسفے کا گنجینہ ہے۔

اسی طرح ایک دیگر بزرگ مولانا محمد فاروق چٹیا کوئی اپنے وقت کے مایہ ناز عالم تھے۔ لکھنؤ کے قیام میں اکثر حکیم صاحب کا درس سننے تشریف لاتے تھے ان کا کہنا تھا کہ حکیم صاحب حکمت و فلسفے کے بحرِ دقار ہیں۔ مشہور عالم اور اپنے وقت کے مایہ ناز جید فاضل مولانا عبدالحق خیر آبادی جن کے شاگرد رشید متعدد اہل کمال اطباء ہوئے ہیں۔ لکھنؤ تشریف لائے اور حکیم عبدالعزیز کے درس میں شرکت کی۔ درس سننے کے بعد فرمایا۔ آپ کتابوں کی مشکلات اس طرز سے بیان کر کے حل کر دیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ معقولات میں آپ کا علم کس قدر وسیع ہے۔ میں کسی اہل علم کی تصنع کے ساتھ تعریف نہیں کرتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس وقت ہندوستان میں فخر الحکماء اور تاج الاطباء ہیں آپ کا نظیر آئندہ یہاں مشکل سے ہوگا۔

لکھنؤ اور ہندوستان میں خاندان جھوانی ٹولہ کو جو مرکزِ اہمیت حاصل ہے وہ صرف علاج و معالجہ میں مقامِ خصوصی کی اہلیت ہی نہیں ہے بلکہ اس کی ترقی و ترقی یہ ہے کہ اس خاندان نے اپنے وقت میں طب کی تعلیم کے لیے جدید طریقوں کو نافذ کرنے میں کیا بلکہ اس کے لیے عملی جدوجہد بھی کی۔

ہندوستان کی راجدھانی دہلی میں اگر خاندان شریفی کے مایہ ناز طبیب حکیم عبدالمجید کے ہاتھوں مدرسہ طبیہ کا قیام عمل میں آیا تھا جو دہلی کے طریقہ علاج کا نمائندہ کالج تھا تو حکیم محمد یعقوب بانی خاندان عزیزی کے سردار عزیز طبیب حکیم محمد عبدالعزیز کے ہاتھوں لکھنؤ کے طریقہ علاج کی ترقی و سر بلندی کے لیے

پہلی دورہ کا پہلا سہ ماہی اور بعد میں دوسرا سہ ماہی۔

اس کے بعد چوتھے سہ ماہی سے پہلے میں اس شب کو ایک ماہ ایفکٹ کرنے کے طور پر  
پہلی سہ ماہی۔

تیسرے دورہ میں پہلی سہ ماہی میں غیبی طور پر پوری رہا تدارکی ہے اس بات  
کو مدنظر رکھنا کہ ہر طرح کے ردائوں کے ساتھ قدر و طرح مذاق بن کر رہنے سے  
بہتر اس وقت کے وقت کے اہم اہم احتیاط کی گئیں اور یہ نافع طریقوں میں متمم ہو جائے  
گا۔ اس کے بعد پہلی سہ ماہی کی نظر میں یہ بھی کہ اس میں کئی اہم اور ضروری  
بیزاریاں تھیں۔ کہ اس وقت سے پہلے میں اس شخص میں یہ کی تھی کہ میں ملا اس ہو گیا  
ہے اور مطلق ہے جو میرا کیا تھا کہ اس نقص کو دور کیا جائے۔

دوسرے دورہ میں پہلی سہ ماہی کے لیے مناسب وقت کے لیے اس کے لیے مسیحا کے انھوں نے دورہ میں  
کو مشورہ دیا ہے کہ اس میں لیا جائے اور اس کے شروع کر دیا انھوں نے اس میں کو اس طرح پڑانی  
کے لیے اس میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
پہلی سہ ماہی میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
تیسرے دورہ میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
چوتھے دورہ میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
پہلی سہ ماہی میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
دوسرے دورہ میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
تیسرے دورہ میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
چوتھے دورہ میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے

پہلی سہ ماہی میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
دوسرے دورہ میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
تیسرے دورہ میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
چوتھے دورہ میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
پہلی سہ ماہی میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
دوسرے دورہ میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
تیسرے دورہ میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
چوتھے دورہ میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے

پہلی سہ ماہی میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
دوسرے دورہ میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
تیسرے دورہ میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
چوتھے دورہ میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
پہلی سہ ماہی میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
دوسرے دورہ میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
تیسرے دورہ میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے  
چوتھے دورہ میں اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے

جانب متوجہ کرنا تھا۔

مجھ کو بھی بعض بڑی بیماریوں میں لائق ڈاکٹروں کی شرکت با مشورت کرنے سے اور اپنے خاص زیر علاج بیماروں میں اعمال بالید کی ضرورت داعی ہونے سے بہا کرات و مرآت ایک ایسی کمی محسوس ہوئی جس سے غیرت و حمیت فن نے میرے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ اس نقصان کی تلافی کروں اور اس فن شریف کو جیسا ہوتا آیا ہے اس کی حالت اصلی کی طرف پلٹا دینے کی کوشش کروں۔ تب میں نے اپنے دونوں بڑے صاحبزادوں حکیم عبدالرشید اور حکیم عبدالحمید کو لفٹیننٹ کرنل جے انڈین سول سرجن کی خدمت میں بھیج کر تشریح و سر جری کی تعلیم دلانی۔ لیکن وہ طبیب عامل بالید پورے ملک کی ضرورت کے لئے کافی نہیں ہو سکتے تھے۔ اور نہ ہی طب یونانی کے ناقص المعیار ہونے کا الزام رفع کر سکتے تھے اور نہ ہی اطبلے یونانی کے پورے گروہ سے بے کمالی کا داغ مٹا سکتے تھے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنے پاس حاضر باش شاگرد پیشہ اطباء کو بھی عمل بالید کی تعلیم و تربیت دی جائے تاکہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں جا کر طب کا نام روشن کریں اور اس عمل و جائینوس کی گودیں پرورش پائی یہ طب تخییر کا نشانہ نہ بنے۔“

حکیم عبدالعزیز کے پاس اپنے آبائی اجداد کا ایک قدیم نادر کتب کا نجی کتب خانہ بھی تھا۔ جو آگے چل کر انھوں نے اپنی درسگاہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔ حکیم عبدالعزیز پندرہ سالوں سے برابر غور کر رہے تھے کہ جھوٹی ٹولہ کی طبی مرکزیت اور تدریسی اہمیت کے پیش نظر اس مقام پر باقاعدہ ایک طبی درسگاہ قائم کریں۔ یہ کام تین تہا انجام نہیں دیا جاسکتا تھا اس لئے خاص احباب سے شورو مکر کے ساتھ ۱۹۰۲ء کو ایک جلسہ شوری منعقد کیا جس میں عمومی تعاون حاصل کرنے کے سوا یہ کمی فراہمی آلات جراحہ کی خریداری۔ مرصنا کے لئے جگہ کا انتظام۔ غیر مستطیع طلباء کے لئے بے فکر ہو کر عمل بالید کی مشق کرانے کا انتظام کرنے پر اتفاق ہوا۔ لیکن اسی وقفہ میں انھوں نے اپنے پیرو مشددا ولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں کہ ”عبدالعزیز مدرس قائم کر دو اور میری جانب سے یہ چند جوابی اشرفی پر مشتمل تھا اس میں شامل کر دو۔ آنکھ کھلنے ہی انھوں نے اپنے



برادر خورد حکیم عبدالحفیظ دونوں صاحبزادوں حکیم عبدالرشید و حکیم عبدالحمید اور دو  
برادر زادوں حکیم حافظ عبدالحمید اور حکیم عبدالمعید کو جمع کیا اور خواب کے تذکرے  
کے بعد فرمایا کہ اب میں اپنے طبی درسگاہ کے قیام کے منصوبے کو عملی جامہ پہناتا ہوں  
اس کے بعد مذکورہ جلسہ احباب بلایا تھا۔ جن میں ان کے ساتھ احباب و رفیق شریک  
ہوئے تھے۔

اس مشورہ سے قبل حکیم عبدالعزیز متعدد بار اس طرح کے بیانات جاری کر چکے  
تھے جن میں طب میں علم تشریح، علم جراحی اور علم الادویہ کی ناقص تعلیم کو طب کی  
کسمپرسی کا سبب سمجھ کر اس کی اصلاح کے لئے فکر مندی کا اظہار کر چکے تھے یہی اس کا  
تکمیل الطب کے قیام کا مقصد بن گیا۔ جس کے تحت جولائی ۱۹۰۲ء میں حکیم عبدالحمید  
دہلوی کی طرح انہوں نے بھی ہمت کر کے ایک طبی درسگاہ "تکمیل الطب" کی بنیاد  
ڈال دی اور تین سال کا نصاب تعلیم مقرر کیا۔ جس میں طب نظری کے ساتھ عملی تربیت کو  
اہمیت دی گئی ہے۔ مدرسہ میں معیار تعلیم کو یقینی بنانے کے لئے بیرونی مقرر  
کئے گئے۔ حکیم عبدالعزیز نے کلیات قانون کا درس دینے کی ذمہ داری خود لی۔  
حیاتیات قانون حکیم عبدالحفیظ کے سپرد ہوئی۔ شرح اسباب اول حکیم عبدالرشید  
اور حکیم عبدالحمید کے ذمہ تھی۔ نفسی کا کل الشاختہ تشیح و جراحی حکیم عبدالحمید  
کے ذمہ سپرد کیا گیا۔ قانونچہ مونیر افرائی حکیم عبدالمعید کو پڑھانے کے لئے دیا گیا  
تعلیم قدیم رواج کے مطابق سبقاً سبقاً ہوتی تھی۔ کتب درسیہ طبیبہ کی فراہمی پر خصوصی  
توجہ دی گئی اور حکیم عبدالعزیز کے رفیق خاص منشی پرگنہ نرائن مطبع لوکلشور نے کتب  
درسیہ کی طباعت کا خاص اہتمام کیا۔ اور مطبع نامی نے بھی طب کی کتب طبع کیں جن  
میں زجر اوی کی کتاب التصریف، سر جری، نفاہ اس اہتمام سے شائع کی۔

۱۹۰۳ء میں ملک میں طاعون کی وبا پھیلی جس کے اثرات سے لکھنؤ بھی محفوظ

نہ رہا۔ اس موقع پر یونانی اطباء کی مذاقت اور مسیحائی نے بڑا کام کیا۔ مدرسہ طب  
"تکمیل الطب" میں حکیم عبدالرشید و حکیم عبدالحمید کے زیر نگرانی جدید شاخ  
عمل بالید کی کھل جانے سے طبی علاج کے سوا طاعونی گلٹیوں کے چاک کرنے میں  
بہت مدد ملی۔

تکمیل الطب کے سالانہ ایک جلسہ کے موقع پر جبکہ عمائدین ملک موجود تھے مرزا محمد عباس توش لکھنوی نے ایک قصیدہ پیش کیا جس کے بعض اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

مگر اس گم شدہ دولت کو جس نے پھر نکالا ہے وہ ہے حکمت کا پتلا اور مجسم عقول یونانی  
وہی سربر آوردہ زمانے کے طبیبوں میں وہی ہے فخر زہرا وہی وہی ہے رشک کیلانی

وہ ہے استادِ کامل نام ہے عبدالعزیز اس کا

نہ سمجھ شیخ ثانی بلکہ وہ ہے شیخ لاثانی

لفٹیننٹ کرنل جی انڈرسن سول سرجن لکھنؤ اور تکمیل الطب کالج کے خاص سربراہوں میں تھے جن کے ذریعہ سے آلات جراحی منگائے گئے تھے اور جن کی مہربانی سے عمل بالید میں تکمیل الطب کو ترقی ملی۔ ۱۹۰۹ء میں جب وہ ریٹائرڈ ہو کر اپنے ملک واپس ہو رہے تھے ۲۶ اپریل کو ان کے اعزازِ شخصیت میں جو تہذیب ہوئی اس تہذیب میں مولانا شبلی، سر راجہ محمود آباد علی محمد خان اور سر راجہ احمد قی ریسول بھی شہر کے دیگر رؤساء عمائدین شہر کے ساتھ حکیم حنیف علی رعب جو حکیم عبدالعزیز کے شاگرد تھے انھوں نے بطور مداح ایک نظم بھی تھی جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

جلوہ گر اس انجمن میں ہے وہ صاحب احترام

جس کے ہیں رہوں منت کیا خاص اور کیا عام

جس کے ہیں وصف آشاہد و جوان پر درخش

جس کے ہیں مدحت سرا چوٹے بڑے ہر صفت و شان

کون یعنی وہ کچھ نہ جس وحید و عسکری کا

آئی ایم۔ ایس ڈاکٹر کرنل جی انڈرسن کے نام

۱۹۰۵ء میں حکیم حنیف علی رعب نے ۱۱۴ اشعار پر مشتمل ترکیب حسنہ لکھی اور ان میں

جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

آج جس کی ذات والا ہے سے طب کو افتخار

کون ہے یعنی حضرت عبدالعزیز نامدار

اس کو بقاء وارسطو پر نہ کیوں ترجمہ بیخ دوں

نور کے مقابل ہو نہیں سکتی ہے تار

عہد کا اپنے بے لقمان اور افلاطون عہد

قرشی اپنے وقت کا اور بوعلی روزگار  
زندہ ہوتے آج بطلیموس و جالینوس اگر

اس کے خوان فیض کے ادنیٰ سے ہوتا زرخوار  
غازہ زحسار ہے میرا وہ باشوکت جوال

نام نامی جس کا ہے عبدالرشید نکتہ دریاں  
اک ذکی الطبع جس کا نام ہے عبدالحمید

نور ہے میرے رخ روشن کا وہ روشن رواں  
لکھنؤ ملک اودھ کا شہر ہے میرا مقام

اور جھوانی ٹولہ ہے اس شہر میں جا قیام

ایک دوسرے جلسہ ۱۹۰۶ء میں حکیم حنیف علی رعیت نے یہ اشعار پیش کئے تھے۔

چھوانی ٹولہ میں جس باغ نے نشوونما پائی

نہ کیوں نہ غنچہ و گل میں ہو اس کی حکمت آرائی

حکیم عبدالعزیز کو کتب بینی کا ذوق حد درجہ تھا۔ ماہنامہ کے بعد غصہ کی نازت تک  
کتب بینی میں مصروف و مشغول رہتے تھے۔ مطالعہ کے کمے میں تختوں کے چوکے پر صوف  
ایک دری بچھی ہوتی تھی اور چہار جانب کتابوں کا ڈھیر رہتا تھا۔ قلمی اور نادر کتب  
منجھ مانگی قیمت پر خریدتے تھے۔ یہ کتب خانہ حکیم صاحب نے "تکمیل الطب" کے لیے وقف  
کر دیا تھا۔

تصانیف :-

1- رسالہ تحفۂ عزیز فی فارسی۔ ادویہ مکبہ کا مزاج نکالنے اور دوا کی کیفیت  
بڑھنے سے کیفیت میں تبدیلی۔ تفصیلی بحث۔

2- رسالہ فی الطال جز جوہر الدماغ

3- حواشی بر قانون شیخ { غیر مطبوعہ۔  
4- ذاتی تجربات

## پسماندگان :-

حکیم صاحب کی پہلی شادی ۱۹ سال کی عمر میں ۳۱ دسمبر ۱۸۷۲ء مطابق ۱۰ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ بروز سنچر بھوپچا حکیم حاجی رضا کی صاحبزادی زینب خانم سے ہوئی۔ ان سے شفاء الملک حکیم عبدالرشید شفاء الملک حکیم عبدالحمید کے علاوہ ایک صاحبزادی خدیجہ بیگم تولد ہوئے۔ شادی کے بیس سال بعد زینب خانم دلغہ منقارت دے گئیں۔

دوسرا عقد زینب خانم کی چھوٹی بہن یعنی حکیم عبدالغزیز کی سالی سے ہوا۔ ان سے چار صاحبزادے حکیم عبدالحکیم، حکیم عبدالحمید، حکیم عبدالعظیم اور حکیم عبدالعظیم اور دو صاحبزادیاں اکبری خانم اور اصغری خانم تولد ہوئے۔

## مذہبی شغف :-

حکیم صاحب کو اس وقت کے ماحول اور طریقہ تعلیم نے بچپن ہی سے مذہب کا دلدادہ بنا دیا تھا مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی سے بیعت تھے۔ حکیم صاحب فلسفیانہ ذہن کے مالک ہونے کی وجہ سے جھاڑ بھونک کے قائل نہیں تھے۔ طبیہ کالج کی بنیاد پر مولانا نے خواب میں آکر مدرسہ طب کی بنیاد ڈالنے اور ایک اشرفی سے امداد دینے کی بات کہی تھی اسی طرح اپنی صاحبزادی خدیجہ بیگم کی شادی میں روپیہ کی کمی کی وجہ سے تامل فرما رہے تھے تو مولانا کو خواب میں یہ فرماتے دیکھا کہ تاریخ مقرر کر دو روپیہ کا انتظام ہو جائے گا۔

دوسرے ہی دن ریاست بڑودہ سے ایک ہزار یومیہ پر طلبی آئی اور مہارانی کے اصرار پر بیس یوم قیام رہا جس سے شادی کا مسئلہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا اور حکیم عبدالمجیب صاحب سے عقد ہو گیا۔ ان خوارق نے حکیم صاحب کو اولیاء اللہ خاصکر مولانا کا معتقد بنا دیا تھا۔ چنانچہ اپنے صاحبزادے حکیم عبدالحمید کی بچپن میں علالت اور علاج سے مایوسی کے بعد اپنے ایک رفیق خاص منشی احتشام علی رئیس کاکوری کے مشورے سے مولانا کی خدمت میں لے گئے۔ بوقت طعام حکیم صاحب کو یاد کیا گیا تو تنہا تشریف لے گئے

موتوانے دریافت کیا نہ صاحب زراعت کو کیوں نہیں لاسے وہ بھی ہمارے ساتھ کھائے گا۔  
حکیم صاحب نے معدت کی کہ اسے یخنی تک ہضم نہیں ہوتی ہے معمول کی غذائوں مدتوں  
سے بند ہے۔ فرمایا سب ہضم ہوگا۔ پھر اپنے پاس بٹھا کر ماش کی کھپڑی اور پوری کپوری  
رہیہ تمام تقیل و ربا دی اشیا، جو طبی نقطہ نظر سے مضر تھیں کھلوائیں اور پانی میں اپنی  
سب سے ڈبو کر پلوائی۔ اسی روز سے موارضات میں افاقہ شروع ہو گیا۔

حکیم عبدالغزیز نے ۱۹۱۰ء میں انتقال سے ایک سال قبل حج کا ارادہ فرمایا اور  
عید کے بعد پہلے جہاز سے روانہ ہو گئے۔ مکہ مکرمہ میں آپ کا بڑا پر تپاک استقبال  
کیا گیا اور خود شہر یعنی مکہ نے آپ سے ملاقات کی حج اور مدینہ منورہ کی حاضری کے  
بعد آپ نے دیگر مقامات مقدسہ اور مصر کی مشہور درسگاہ جامع ازہ کو بھی دیکھا  
واپسی میں بمبئی سے لکھنؤ تک عقیدت مندوں نے جس شاندار اور پر خلوص طریقے سے  
ان کا حیدر مقدم کیا اس سے ان کی مقبولیت اور ہر دل عزیز کی کامرانہ نظر بجا ملتا  
ہوئے۔

کسی شاعر نے حکیم عبدالغزیز کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے حسب ذیل شعر کہا ہے۔  
دامن مقصود و نجورول کا جس نے بہ دیا  
جس نے یونان کے فن مدد کو زندہ کر دیا

وفات :-

حکیم صاحب کی صحت قابل رشک تھی۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ ورزش کر لیا کرتے تھے۔  
آخر عمر میں مگر چلا رہے تھے کہ فالج کا حملہ ہوا اور چہرے سے معذور ہو گئے  
تکلیف و ہر اہم صائب کے علاج سے افاقہ ہوا۔ چھڑی کے سہارے چلنے لگے تھے  
پیشین گوئی کی تھی کہ چار ماہ دس دن پر مرض فالج کا بران ہو گا۔ پیشین گوئی درست  
ہوتی جمعہ کی شب ۱۹ شوال ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو تقریباً ۷۰ سال کی  
عمر میں وفات پائی۔

یہ معمولی حادثہ نہ تھا آپ کی وفات پر نہ صرف اندرون ملک بلکہ غیر ممالک میں  
بھی اظہارِ رنج و غم کیا گیا۔ اخبارات و رسائل نے ادائے اور متعدد شعراء نے

خواب مرتبہ اور نصیحت لکھے۔

دو بار کا پڑھنا اٹنی سے منہ پہ لکھی قلمی لکھی

تھا مسیحا کا تہذیب نامہ ارواح کتب

اس لئے جنت میں مورتی پاک بھوانی گئی

جو گیا زمان کے اپنی حکیم دفتی کا نام

وہ عمل کی نظرت۔ لگا لوگوں کی دانائی گئی

لکھیوں فلہ سے دیاستہ مسیحا لکھی

وہ عمل کا نام میں کا مسیحا لکھی

مسیحا لکھی کے نام سے مسیحا لکھی

پسندہ دل کو تہذیب سے مسیحا لکھی

-۱۳۲۵-

## طبعی محرک

مبارا جی کا تہذیب نامہ لکھی ہے۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔

بنیاد پر غلیل تہذیب ہے۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔

کی جانب سے تہذیب ہے۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔

اس وقت ہر وقت ہے۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔

میں نظام ہے۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔

اور کتابیں۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔

میں حکیم صاحب بحیثیت ہے۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔

کہیں۔ جند نسوانی تہذیب ہے۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔

کو دکھا باکیا حالات ہے۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔

سے دیا کہ اب میں اجازت ہے۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔

جو ہانے تہذیب ہے۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔

قیام کریں۔ مباران کی تہذیب ہے۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔ اس کا نام ہے تہذیب نامہ۔

نبض دیکھی اور کہا کہ آپ کو شروع زندگی میں یہ امراض تھے جن کا خفیف اثر اب بھی ہے اور ایک نسخہ لکھ دیا۔ مہاراج بہت ہوشیار و مدبر تھے۔ انہوں نے مہارانی سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے میرے حالات پہلے ہی بیان کر دیئے تھے حکیم صاحب سے؟ مہارانی کے انکار پر مہاراج صاحب سخت متعجب ہوئے۔ اور حکیم صاحب کی خوب ضیافت کی۔ حکیم صاحب قیام بڑودہ میں اس درمیان کسی سے نہ ملے۔ صرف کتب بینی ہی کرتے رہے۔

غرضکہ بڑودہ میں حکیم صاحب نے اٹھارہ یوم قیام کیا۔ اپنے دو خانے کی مصروفیتا درس و تدریس و افکار کی بنا پر حکیم صاحب لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ یہ دور وہی تھا جب حکیم صاحب اپنی دختر کے عقد میں اخراجات کے لئے متفکر تھے۔ اس کے قبل مہارانی بڑودہ خود قریب قریب دو ماہ لکھنؤ رہ کر علاج کرا چکی تھیں۔

حکیم عبدالعزیز صاحب کا مطب مرجع خلائق تھا خلفاء و رؤسا سبھی فیضیاب ہوا کرتے تھے۔ مطب میں کسی مریض سے کسی طرح کی فیس نہ لیتے تھے۔ شہر لکھنؤ میں اگر کوئی مریض اس زمانے میں گھر پر جا کر حکیم صاحب کو دکھانا چاہے تو سولہ روپیہ اور اگر صوبہ میں کسی مقام پر بلانا چاہے تو پانچ سو روپیہ اور صوبہ سے باہر ایک ہزار روپیہ یومیہ فیس تھی۔ ایک بار حکیم عبدالعزیز نواب شاہجہاں بیگم کے دور میں ان کے علاج کے لئے۔ بھوپال بھی تشریف لے گئے تھے اور تین دن بھوپال میں حکیم صاحب کا قیام رہا تھا۔

ایسے تھے پہلے دور کے حاذق کامل و ماہر فن طبیب۔

## صوفی صاحبِ درویش و نیک اندیش حکیم سید برکات احمد ٹونکی

۱۳۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء

ہندوستانی طب کی ترقی و تعمیر میں ہندوستان کے راجاؤں اور نوابوں کا بھی بہت تعاون رہا ہے۔ گرچہ اپنے مفاد کے تحت اس ملک میں جدید طریقہ علاج یعنی ایلوپتھی طریقہ علاج کو فروغ دینے کے لئے انگریزوں نے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ پھر بھی آج جو ایسی طریقہ علاج رائج ہیں وہ سب نوابوں، راجاؤں اور ریسوں کی زمین منت ہے۔ ان ریاستوں میں حاذق کامل صاحب فن کامل اطباء کا تقرر ہونا تھا اور ان کی حیثیت معالجِ خصوصی کی ہوا کرتی تھی۔ آج بھی ریاستوں کے اندر جاجا جو مفت شفاخانے یا اسپتال و دواخانے نظر آتے ہیں یہ سب اطباء اور ریاستوں کی دین ہیں۔

انھیں ریاستوں میں ایک چھوٹی سی ریاست ٹونک بھی تھی۔ جہاں طبی علاج و معالجہ بہت مقبول تھا عام و خاص میں۔ اسی ریاست ٹونک میں ایک ماہر فن طبیب حکیم مولانا سید برکات احمد ٹونکی نے اپنی ذہانت و فراست اور قابلیت کی بنا پر علاج و معالجہ میں ایک بلند مقام اور مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ آج بھی نہ صرف اس ریاست میں بلکہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں ان کے فیض یافتہ موجود ہیں۔

خاندان :- حکیم سید برکات احمد کے والد محترم حکیم سید دائم علی جن کا آبائی وطن



c

پندرہ روزہ کیمبرج کرسچن اسکول، لاہور

میزنگر ضلع پٹنہ صوبہ بہار تھا۔ آپ کے اجداد ایک عرصہ سے نسل در نسل یہاں مقیم تھے۔ ذوقِ علم میں وطن کو خیر باد کہا اور اُس دور کے اساتذہ علم و فن مولانا احسن کیلانی علامہ فضل حق خیر آبادی مولانا عالم علی نکیئی اور حکیم احسن اللہ خاں دہلوی جیسے بچکانہ روزگار علماء اور اہل فن نے ان کے حویہ قابل کو نکھارا اور ان بزرگوں کے نرمن فیض سے خوشہ چینی کی۔ علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد ٹونک میں منوطین ہو گئے۔ نواب ٹونک کے مزاج میں ۱۹۰۵ء میں حاصل کیا کہ طبیب خاص اور دیوان خزانہ مقرر ہوئے روحانی فیوض و برکات حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے حاصل کیں اور ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہو کر خلافت سے سرفراز ہوئے حکیم مولانا میر سید دائم علی نے ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۸ء) میں وفات پائی۔

حکیم برکات احمد کے نانا شیخ ولی محمد صاحب کامل ولی تھے جو مشیت شاہ اسماعیل شہید کے رشتہ کے بھتیجے تھے۔

## ولادت یا پیدائش :-

ٹونک ہی میں ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۲ء) کو حکیم سید برکات احمد کی ولادت باسعادت ہوئی آپ سلطان اہل سادات میں ہیں۔

## تعلیم و تربیت :-

حسب قاعدہ ان کی تعلیم کی ابتدا الطیب خاص ان کے والد کے ہونے کی وجہ سے شادی طور پر یقہ پر قائم ہوئی۔ پھر اس کے بعد ابتدائی تعلیم ٹونک کے شاہین صاحب میں ہوئی۔ اور بالبعد درسیہ نظامیہ کی متوسط کتابوں کی تعلیم اور والد کے مدرسے حاصل کی۔ والد مجتہد کے علاوہ ہیں اساتذہ فن و علم کے سائنس دانوں سے ادب سے کیا ان میں مولانا مفتی بہاری مولانا محمد حسن تلمیذ مولانا آزاد خاں طور پر قابل ذکر ہیں۔

پھر اس کے بعد مزید تحصیل تعلیم کے لئے علامہ عبدالحق خیر آبادی کی درگاہ

علمی میں داخل ہوئے۔ علامہ کی نگاہ انتخاب نے حکیم برکات احمد کو چن لیا۔ اور علامہ انھیں تعلیم کے لئے ٹونک سے اپنے ساتھ رام پور لے گئے۔ حکیم برکات احمد نے ایک در پکڑ کر مضبوطی سے پکڑا۔ پندرہ سال وہ علامہ عبدالحق خیر آبادی کی خدمت باسعادت میں رہے اور مختلف علوم و فنون مثلاً ادب منطق۔ فلسفہ۔ بدیعات۔ طبیعیات الہیات کلام۔ اصول و فقہ تفسیر اصول تفسیر اصول حدیث میں علامہ کی شاگردی میں رہ کر حاصل کئے۔ علامہ کو معقولات میں غیر معمولی شغف اور کمال حاصل تھا۔ جنوب ایشیا، ان کے فلسفہ اور منطق کی شہرت سے گونج رہا تھا۔ علامہ عبدالحق کے لئے شاگردوں میں اس ہونہار شاگرد کے جوہر قابل کی چمک دیک علیحدہ تھی۔ اس لئے علامہ فضل حق خیر آبادی اس ہونہار شاگرد کو بڑی محنت اور شفقت سے تعلیم دیتے تھے۔ علامہ کے زیر اثر حکیم برکات احمد کا ذہن ترقی کرنا گیا۔ انھوں نے علامہ سے وہ تمام کتب پڑھیں جو درس نظامیہ میں شامل ہیں۔ اور وہ کتب بھی دیکھیں جو خیر آبادی سلسلہ درس میں داخل ہیں۔ مثلاً ہدیہ سعیدیہ۔ ہدیہ الہدایہ۔ جوابہ الفالیہ۔ شرح ہدایت۔ الحکمت۔ حواشی حونساری اور فتوحی کے قولات۔ وغیرہ۔

## دینی علوم :-

دینی علوم کا ذوق ان کو بھوپال کھنچ کر لے گیا۔ اور قاضی محمد ایوب قاضی القضا کے حلقہ درس میں شریک ہو کر علوم دینیہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ اور علاج و معالجہ کا پیشہ بھی اپنائے رہے جس کی تکمیل پہلے ہی کر چکے تھے۔ بھوپال میں اپنے چند نہایت معرکتہ آرا علاج کئے۔

## طبی تعلیم :-

حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی سے درس کی تکمیل کے بعد پہلے تو تکمیل طب کے لئے مشاہیر اطباء لکھنؤ جو اپنے وقت کے معروف و ذکی اطباء تھے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن بوجہ کمال علمی و ذہانت طبی آپ کے کوئی طبیب ان کی تشفی کر سکا۔ بالآخر مجبوراً دہلی کا سفر کیا اور عضدولہ جناب حکیم غلام نجف خاں برادر خور

شاگرد و دانشدہ احترام الدولہ جناب حکیم محمد احسن خاں صاحب طبیب خاص وزیر سلطنت شاہ ظفر مرحوم کے پاس خدمت میں حاضر ہو کر طب کی ابتدا کی حکیم محمد احسن خاں حکیم مومن خاں مومن کے قریبی رفقاء و اعزائیں تھے۔

حکیم غلام نجف خاں نے ایسے لائق اور قابل طالب علم کو دیکھ کر اپنی تمام قابلیت سے رموز و اسرار طب کی ان کو تعلیم دی۔ اسی زمانہ تعلیم میں جناب عضد الدولہ مرحوم نے اپنے پوتے شفاء الملک عالی جناب حکیم رضی الدین کو آپ کے سپرد واسطے تعلیم کے کیا۔ چنانچہ جب تک آپ دہلی رہے حکیم رضی الدین کو درس دیتے رہے اور دولتِ علم و عمل طب و علوم دیگر سے فراغت کر کے بھوپال کا سفر کیا۔

ان کے والد بزرگوار حکیم سید دائم علی جو خود بھی حکیم احسن اللہ خاں عزیز حکیم مومن خاں مومن کے شاگرد تھے اور معالج خاص حضور انور امین الدولہ وزیر الملک عالی جناب نواب حافظ محمد ابراہیم خاں بہادر صولت جنگ جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ والی ریاست ٹونک دام اقبالہم کے وہاں تھے۔

اکتیس سال کی عمر میں حکیم مولوی سید برکات احمد علوم عقلیہ و نقلیہ سے فارغ ہو کر ٹونک تشریف لائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان کے والد ماجد دیوان خزانہ اور منصب طبیب خاص سے دست کش ہو چکے تھے۔ والی ٹونک نے ان کے والد کی طرح ان کی بھی پوری قدر افزائی فرمائی۔ اور انھیں اپنی ریاست کے لئے باعثِ عزت و شہرت سمجھ کر ان کو ان کے بڑے بھائی کی جگہ جو بوجہ پیری استعفاء، داخل کر چکے تھے مقرر کر کے طبیب خاص کا درجہ و مرتبہ عطا کیا۔ اور حکیم برکات احمد اپنے فرائضِ ملازمت نہایت ہی تندہی سے انجام دینے لگے۔

حکیم برکات احمد نے ۱۳۳۱ھ (۱۹۱۲-۱۳) میں حج و زیارت حرمین شریف کی سعادت حاصل کی۔ اور ممالک اسلامیہ بشمول مصر، شام و فلسطین کے مزاراتِ متبرکہ پر حاضری دے کر وطن واپس ہوئے۔

## علمی و ادبی خدمات :-

حکیم سید برکات احمد صاحب کو درس و تدریس سے فطری مناسبت تھی وہ



کے باوجود سادگی کا یہ عالم کہ ایک روپیہ کے پیسے گننا نہیں جانتے تھے۔ ان کی شخصیت اور ان کا فن دونوں عظیم تھے۔ ان کی نظر علم و فن کی اشاعت پر تھی۔ فن اور شخصیت کے بھرپور چاؤ نے ان کو علامہ عبدالحق خیر آبادی کے بعد معقولات کا امام بنا دیا تھا لیکن انہوں نے اپنے دانش کدہ کو شہ بیت کے جمال سے منور رکھا اور کبھی عقل کو بے لگام نہیں ہونے دیا۔

### نورِ معارف

حکیم سید برکات احمد کے قلب کو جن بزرگوں کے نور بصیحت اور معرفت نے منور کیا اور ان پر تصوف کی راہیں کھولیں وہ رام پور کے ایک صاحب دل بزرگ جن کا تعلق سلسلہ صابریہ سے تھا۔ شاہ مکن عالم تھے۔ جن سے ابتداء بیعت ہو کر حکیم صاحب نے روحانی استفادہ کیا۔ اخیر میں حیدرآباد دکن کے ایک اور مشہور و معروف بزرگ مچھلی والے شاہ صاحب سے بھی روحانی استفادہ کیا۔

### عشقِ رسولؐ

عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حکیم صاحب کا قلب متاثر تھا۔ زندگی کے آخری دور میں بارہ مرتبہ سعی کی کہ مدینہ طیبہ ہجرت کر جائیں لیکن باوجود کوششوں کے اس کا موقع نہ مل سکا۔ مدینہ طیبہ کے رہنے والوں سے خصوصاً اور عرب کے رہنے والوں سے عموماً بے حد محبت کرتے تھے۔ اپنے والد کی تعمیر کی ہوئی مسجد کے قریب ایک مہاں نواز محلے تعمیر کرائی تھی تاکہ عام مسافروں اور خصوصاً علماء کو قیام میں سہولت ہو۔

یہ رباط (سرائے) رباط الحکیم کے نام سے آج بھی مسافروں کے قیام کے لئے وقف ہے اور وسط شہر میں پائنتی چوہا بے کے قریب واقع ہے۔

### استاد سے محبت و عقیدت

اپنے استاد محترم مولانا فضل حق خیر آبادی سے غیر معمولی عقیدت و محبت رکھتے

تھے۔ تین زمانہ میں بغرض تعلیم خیر آباد میں مقیم تھے حکیم صاحب کو معلوم ہوا کہ مولانا کو سینا پور کی فلاں دوکان کے کباب بہت پسند ہیں۔ حکیم سید برکات احمد بلاناغہ ریل سے سینا پور جاتے اور علامہ کے لئے کباب لے کر آتے چند دن تک تو علامہ نے اپنے عزیز شاگرد کی یہ زحمت گوارا کی۔ آخر علامہ نے منع فرما دیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بھی ہر سال اپنے استاد کی قدم بوسی کے لئے پابندی سے خیر آباد حاضر ہوتے تھے۔ علامہ خیر آبادی کی وفات پر ایک رسالہ حسرت العمامہ بروفات شمس العلماء کے نام سے لکھا۔

## وفات :-

حکیم سید برکات احمد کے ایک صاحبزادے مولانا حکیم سید محمد احمد صاحب تھے جو علم و عمل کے اعتبار سے ان کے حقیقی جانشین تھے۔ معنوی اور مناصب سرکار سے وہی حکیم صاحب کے صحیح قائم مقام ہوئے۔ انھوں نے بھی کئی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

حکیم سید محمد احمد کی اولاد میں ایک صاحبزادی اور دو صاحبزادے حکیم مولانا محمود احمد برکاتی اور سید مسعود احمد برکاتی ہیں۔ سید مسعود احمد برکاتی کراچی میں مطب کرتے ہیں اور جو وقت بچتا ہے تصنیف و تالیف میں گزارتے ہیں۔ ان کی کئی ٹھوس اور اہم تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ وہ کراچی کے ان دانشوروں میں ہیں جو نام و نمود سے بے نیاز ہو کر ریسرچ اور علمی و تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں اور غالب کے اس مصرعہ کے بقول ع

زستائش کی تمنانہ صلہ کی پروا

ان کے چھوٹے بھائی سید مسعود احمد برکاتی ہمدرد کراچی کے شعبہ تالیف و تصنیف و ترجمے میں ناظم ہیں۔ حکیم محمد سعید صاحب کی دور رس نگاہ نے ان کے جوہر قابل کو پرکھا۔ اور اپنے دفتر کی زینت بنا لیا۔

مختصر یہ کہ دونوں برادر پیکر شرافت و نجابت ہیں اور ان کو دیکھ کر بے اختیار جوش کا یہ مصرعہ زبان پر آ جاتا ہے۔

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

تصانیف :-

حکیم مولانا برکات احمد صاحب کی جو فلسفیانہ تصانیف منظر عام پر آئی ہیں ان میں سے بعض کتب کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ انہار اربعہ تصوف میں۔

۲۔ القول القابط فی تحقیق۔

۳۔ الوجود الرباط۔

۴۔ امام الکلام فی تحقیق الاجسام۔

۵۔ فلسفہ میں حاشیہ بر حاشیہ خیر آبادی۔

۶۔ حاشیہ شرح موافقت کلام میں۔

۷۔ حاشیہ بر جامع ترمذی (حدیث شریف میں)

۸۔ عشرہ کاملہ۔ (طبیعیات میں)

۹۔ حقیقت الاسلام ( )

۱۰۔ رسالہ وجود الرباطی (منطق میں)

۱۱۔ المعارف الدعیہ (الہایات میں)

۱۲۔ تنویر المنار (اصول فقہ میں)

علامہ اقبال کو حکیم برکات احمد صاحب کا ایک رسالہ بعنوان تحقیق زبان پورا نام رسالہ اثقان العرفان فی ماہیتہ الزمان "کو عرصہ تک تلاش رہی۔ ان کی تصانیف بڑے پایہ کی ہیں۔

طبی معرکے :-

حکیم صاحب ایک مستند اور متبحر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ فن طب پر بھی گہرا عبور رکھتے تھے۔ ان کی تجویز و تشخیص اور معالجانہ نظر بڑی گہری تھی۔ مرض کتنا ہی پیچیدہ اور پرانا کیوں نہ ہو وہ کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوتے تھے وہ اکثر فرمایا



کرتے تھے کہ طبیب کے دل میں اگر خوفِ خدا نہ ہو اور اس کی زندگی پاک و صاف نہ ہو تو اس کے ہاتھ سے شفاء بھی اٹھ جاتی ہے۔ طبیبِ صحت و عزت کا امین ہوتا ہے اسے امانت میں کبھی بھی خیانت نہ کرنا چاہیے۔

ایک مریض جس کو دستوں کی پرانی شکایت تھی اور بہت دور دراز تک کے ڈاکٹروں کا علاج کر لیا تھا لیکن افاقہ کی کوئی شکل نہیں ہو رہی تھی اس لئے حکیمِ صاحب کا نام سن کر علاج کے لئے حاضر ہوا تھا۔ اور اپنے اس مرض کی وجہ سے لبِ مرگ تھا۔ آپ نے جو ارشِ مصطلکی وغیرہ پہلے دی لیکن افاقہ نہ ہونے پر اپنے تجربات سے ایک گولی تیار کرائی جس کا نسخہ حسب ذیل ہے۔

نسخہ :-

کچلہ عمدہ و تازہ رات کو پانی میں بھگو دیں۔ پانی کچلوں سے دو انگلی اوپر ہے صبح ان کچلوں کو اتنا پکائیں کہ پانی جل جائے اور کچلے (اذا راقی) سیاہ رنگ کے ہو جائیں۔ پھر انھیں کوٹ کر رکھ لیں۔ کچلوں کا یہ سفوف فلفلِ سیاہ، کالی مرچ، گل از می، انیسون، ہر ایک ایک تولہ کر باریک پس کر موزنگ کے دانہ کے برابر گولیاں بنا کر رکھ لے۔ روزانہ تین گولیاں عرقِ بادریان و عرقِ پودینہ کے ہمراہ استعمال کریں۔ چند دنوں تک یہ گولیاں مریض کو استعمال کرائی گئیں جس سے مریض کی بہت پرانی شکایت دور ہو گئی۔

ایک شخص کو ٹونک میں سکتہ ہو گیا اور دو یوم گزر گئے۔ تمام اطباء نے عنہ نے متفقہ طور پر تشخص کیا کہ مرگیا ہے۔ مریض کو مردہ سمجھ کر تجہیز و تکفین کا سامان کیا جا رہا تھا کہ اسی دوران آپ کو مریض کے دیکھنے کا موقع ملا۔ مریض کا بغور مطالعہ اور معائنہ کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ مردہ نہیں ہے ابھی اس میں زندگی کی علامات موجود ہیں۔ اور اس کو کل صبح ہوش آجائے گا۔ بطور دوا تریاقِ کبیرا، اسیرین حل کر کے حلق کے اندر ڈال دینے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ ٹھیک وقت پر صبح کو بالکل ہوش آ گیا۔ پورے شہر میں یہ نہر بجلی کی طرح دوڑ گئی کہ حکیمِ برکات احمد صاحب کی کرامت سے مردہ زندہ ہو گیا۔

اسی طرح نواب صاحب ٹونک کے محل میں ایک ہیکم صاحبہ کی بیانی کمزور ہو گئی اور انھیں زیادہ نمبروں کا چشمہ لگنے لگا۔ انھوں نے حکیم صاحب سے خواہش کی آپ کوئی ایسا نسخہ لکھ دیں کہ عینک کی عادت چھوٹ جائے۔ حکیم برکات احمد صاحب نے مریضہ کے لئے مندرجہ ذیل نسخہ ترتیب دیا۔

چینی دس تولہ، شورہ پانچ تولہ، سبز چوڑی کا کالج ڈھائی تولہ، کب سبب عینی ڈھائی تولہ سب کو نہایت باریک پیس کمر آپ یا دیان میں ایک ماہ کھل کیا جائے۔ اب اس میں مرداریدنا سفتہ ۲ تولہ ڈال کر خوب کھل کیا جائے۔ جب یہ سب مثل سرمہ ہو جائے چھان کر شیشی میں محفوظ کر لیں۔

مہینہ دو مہینہ یہ سرمہ ہیکم صاحبہ نے استعمال کیا اور اس کے نتیجے میں ان کی عینک (چشمہ) لگانے کی عادت چھوٹ گئی۔

# سیح الملک حاذق الملک حکیم حافظ اجمل خاں شیدا

۱۹۲۷ء

۱۲۸۳ھ  
۱۸۶۳ء

میں لائے ہند

تاریخ طب میں ایسی بے شمار نادر روزگار ہستیاں ہوئی ہیں جنہوں نے اپنے کارناموں سے نہ صرف اپنا نام روشن کیا بلکہ اپنے ان کارناموں کی وجہ سے اس فن کو اور اپنے سلسلہ نسب کو بھی حیاتِ جاودانی عطا کر دی۔ ایسی ہستیوں اور شخصیتوں میں حکیم اجمل خاں کا نام نامی و اسم گرامی بھی صفِ اول میں آتا ہے۔

میدانِ طب کی ایسی ہستی کو جتنی بے شمار انعامات۔ اعزازات خلعتیں ملی ہیں اتنی شاید طب کی کسی دیگر ہستی کو آج تک نہیں ملی ہیں۔

خاندانِ شریفی کا یہ چراغ جب تک جلتا رہا روشنی دیتا رہا اور اپنے بعد روشنی کا وہ عظیم مینارہ قائم کر گیا کہ جب تک دنیا ہے اس مینارہ روشنی سے فیضیاب ہوتی رہے گی۔

خاندان :-

حکیم اجمل خاں کا خاندان وہی مشہور خاندان ہے جو تاریخ میں خاندانِ شریفی کے نام سے منسوب ہے اور جس کے جدِ امجد طبِ حکیم فاضل خان تھے لیکن ان کی چوتھی پشت میں جو طبیب ہوئے۔ ان کے ہی نام پر خاندانِ شریفی منسوب ہوا۔ حکیم محمد شریف خان مرحوم اپنے زمانے کے بے نظیر طبیب تھے۔ علم و عمل کے



مجدد طب حاذق الملک بہادر حکیم حافظ محمد اجمل خان صاحب رئیس اعظم دہلی

لحاظ سے یگانہ روزگار تھے۔ صاحب تالیف و تصنیف تھے۔ متعدد کتابیں لکھیں اور متعدد درسی کتب پر حاشیے لکھ کر ان کے اہم اور پیچیدہ مسائل کو سلجھایا۔ آپ کے بعد حکیم صادق علی خاں اور پھر حکیم محمود خاں نہایت بلند پایہ طبیب ہوئے ہیں۔ حکیم محمود خاں مسیح الملک کے والد ماجد تھے اور بہت سی خوبیوں کے مالک۔ حکیم محمود خاں مرحوم کے ۳ تین فرزند تھے جنہوں نے فن طب کو فنا ہوتے دیکھ کر مدرسہ طبیہ قائم کیا۔ اور بعد میں مسیح الملک کی انتھک کوششوں کی بدولت طبیہ کالج بنا۔

حکیم محمد واصل خاں مرحوم منجھلے فرزند تھے اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں سب سے چھوٹے فرزند تھے جن کا ذکر یہاں خصوصیت سے مقصود ہے۔

غرض کہ حکیم اجمل خاں کے آباء و اجداد مغل عہد میں ہندوستان وارد ہوئے ان کا سلسلہ نسب اگر باپ کی جانب سے حضرت صدیق اکبرؓ سے ملتا ہے تو ماں کا شجرہ حضرت عمر فاروقؓ تک پہنچتا ہے۔

## پیدائش :-

حکیم محمد اجمل خاں کی پیدائش ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۱ فروری ۱۸۶۴ء دلی کے ایک عالی رتبہ رئیس اور فن طب کی تاریخ میں معروف شریف منزل میں ایک ایسا آفتاب طلوعِ سحر ہوا جس کی روشنی کی کرنیں سرزمین ہند سے نکل کر عرب و عجم، مصر و حبش اور یورپ تک جا پہنچی۔

## وضع قطع - یعنی لباس -

ابتدا میں حکیم صاحب قبلہ وہی طرز لباس پسند فرماتے تھے جو ان کا خاندانی لباس تھا یعنی دو کلیہ ٹوپی، کچی بلبل کا انگریز کھاجست پاجامہ، دہلی کی زری کی جوتی، سردی کی شدت کے وقت ایک ٹیمہ آسنجن، ایک ہلکی ادنی چادر کا سردی میں اضافہ۔ ان کا خاندانی لباس تھا جو خاندان شریفی کے بزرگ اور اطباء عموماً پہنتے تھے۔ لیکن رام پور سے واپسی کے بعد خاندانی رسم و رواج کے خلاف خدمت پسندی

کی وجہ سے اور تحریک علی گڑھ سے متاثر ہو کر علی گڑھ فیشن اختیار کر لیا تھا۔ خاندانی لباس کے بعد ترکی ٹوپی اوڑھنے اور شیروانی و قمیص پہننے لگے تھے۔ پاجامہ گوجیت نہ ہوتا تھا مگر آری تراش کا سپدھا پاجامہ بغیر چوڑی کا استعمال کرنے لگے تھے۔ وہ بلا تکلف اونی گرم کپڑے اعلیٰ قسم کی سرج جامہ دار اور عمدہ کشمیرے کے بنے ہوئے پہنتے تھے۔

تحریک آزادی سے وابستہ ہونے کے بعد ترک موالاتی کی شکل میں کھدر میں ملبوس رہنے لگے تھے اس پر طرہ یہ کہ پہلے تو ترکی وضع کی کھدر کی عنابی رنگ کی ٹوپی اس کے بعد کھدر ہی کی کشتی نما ٹوپی پہننے لگے تھے۔ وسط سال ۱۹۲۵ء میں جب وہ شام فرانس اور یورپ کی سیاحت پر گئے تھے تو انگریزی وضع قطع کا لباس یعنی انگریزی سوٹ اور ہیٹ بھی استعمال کرنے لگے تھے۔

### تعلیم و تربیت

چونکہ گھرانہ علمی ادبی ماحول سے پر تھا لہذا یہ ماحول حکیم صاحب کو بھی ملا۔ اور حسب دستور ابتدائی تعلیم کی ابتدا گھر سے ہی شروع کی۔ ان دنوں شریف خانی خاندان کے مخصوص وقار اور حکیم محمود خاں کی بلند مرتبہ شخصیت کی وجہ سے شریف منزل میں علماء کا مجمع رہا کرتا تھا۔ اوریوں بھی اُس زمانے میں رؤسا اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام گھر پر ہی کرتے تھے۔ اس لئے حکیم اجمل خاں کی تربیت اور ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ مگر ان کے ذوق علم نے ان کو رسمی مقبوضہ کا پابند نہیں رکھا۔ اور وہ اپنی علمی تشنگی کو فرو کرنے کے لئے دہلی کے ارباب علم ہنر و کمال کی خدمت میں جانے میں عار نہیں محسوس کرتے تھے۔

حکیم صاحب نے اٹھارہ سال کی عمر تک منطق، فلسفہ، طبیعات ادب حدیث تفسیر اور فقہ وغیرہ کی تکمیل کر لی تھی۔

صرف و نحو میں ان کے استاد پیر جی صدیق احمد صاحب دہلوی تھے منطق اور فلسفہ شمس العلماء، مولوی عبدالحق مرحوم مفسر تفسیر حقانی اور مولوی عبدالرشید صاحب رامپوری سے حاصل کی اور دیگر علوم مرزا عبید اللہ بیگ حکیم مولوی

جمیل الدین اور دیگر اساتذہ سے پڑھے۔

مندرجہ بالا علوم کے علاوہ خوشنویسی کی تعلیم خلیفہ محمد امیر پنج کش اور مولوی رضی الدین سے حاصل کی۔

مقبول و منقول کی تعلیم کے ساتھ خاندانی رسم و رواج کے مطابق تعلیم طب کی جانب خصوصی توجہ دی۔

## طب کی تعلیم :-

طب کی ابتدائی کتب اپنے والد گرامی حکیم محمود خاں صاحب سے اور انتہائی کتب اپنے برادر بزرگ حکیم عبدالمجید خاں صاحب سے پڑھیں۔ خاندان شریفی کے ایک مشہور بزرگ حکیم غلام رضا خان تھے۔ ان کو قانون پر ملکہ تھا۔ حکیم اجمل خان نے اپنے والد گرامی اور برادر کلاں کے علاوہ ان سے بھی طب میں فیض حاصل کیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ فن نبأ یعنی مطلب اور نسخہ نویسی جو ایک حکیم کے لئے لازمی تعلیم ہے اپنے والد قبلہ کے ساتھ اور بعد میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مطلب میں بیٹھ کر حاصل کی۔ قرآن مجید پہلے ہی حفظ کر چکے تھے۔

چونکہ حکیم اجمل خان کو مطالعہ کا بچپن سے ہی حد درجہ شغف تھا۔ جب کچھ تعلیم اچھی ہو گئی تو انھوں نے اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ مطالعہ کتب پر صرف کرنا شروع کر دیا۔ شاہان مغلیہ کے عہد میں علم دوست خاندان قلمی کتابوں کو عموماً جمع کرتے رہتے تھے اور عدر سے پہلے دہلی میں متعدد خاندانوں میں گراں قدر کتب خانہ تھے۔ مگر جب عدر میں دہلی برباد ہوئی اور شرفاء کو اپنی عزت اور جان کا بچانا مشکل ہو گیا تو ایسے حالات میں یہ کتب خانے کیسے محفوظ رہ سکتے تھے۔ یہ علمی و ادبی خزانے بھی لٹ پھینک اور ضائع ہو گئے۔ حسن اتفاق سے مرزا غالب کی طرح حکیم محمود خاں کا یہ مکان "شریف منزل" بھی راجہ نریندر اور مہاراجہ بیالیہ کی سعی سے لٹنے سے محفوظ رہا اور خاندان شریفی کا یہ علمی خزانہ تلف ہونے سے محفوظ رہ گیا۔

حکیم اجمل خان کے لئے یہ علمی خزانہ ایک نعمت خدا داد ثابت ہوا اور انھوں نے مستقل طور پر اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ اس کے مطالعہ میں صرف کرنا شروع کر دیا

چونکہ شریف منزل میں مرضاء و شرفاء کی آمد کی بنا پر وہ گوشہ تنہائی پیش نہیں آسکتا تھا جو یلائے علم کے طلب گاروں کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے انھوں نے — شریف خاں کی مسجد کے ساتھ والا کوٹھا اپنے لئے مخصوص کر لیا جو اس مکان کے قریب ہے جس میں مرزا غالب — اخیر میں منتقل ہو گئے تھے۔ اور جس کے متعلق غالب نے فرمایا تھا۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے  
یہ بندہ کمینہ ہمسایہ خدا ہے

حکیم اجمل خاں کے اس شوق مطالعہ و ذوق علم کی وجہ سے حکیم محمود خاں یعنی ان کے والد ان کو ملا کہا کرتے تھے اور بعض اوقات ان کے غیر معمولی انسہاک پر تعریض بھی فرمایا کرتے تھے۔

حکیم صاحب کا مطالعہ صرف طب کی کتابوں تک محدود نہ تھا بلکہ ادب تفسیر منطق اور فلسفہ کی کتابوں کا بھی وہ گہری نظر سے مطالعہ کیا کرتے تھے۔ مطالعہ کے بعد وقت طلب مسائل کے حل کے لئے حکیم عبد المجید حکیم غلام رضا اور حکیم عبدالرشید خاں صاحب جیسے اساتذہ فن سے مشکلات کے حل میں مدد بھی لیا کرتے تھے۔

جس وقت نظر کے ساتھ انھوں نے طبی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ متعدد کتابوں پر ان کے تحریر کردہ حواشی پائے جاتے ہیں۔

اس مطالعہ و نظر نے ان کی آئندہ زندگی پر انقلاب انگیز اثر پیدا کیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ متاخرین نے تقلید محض کا راستہ اختیار کر کے طب کی ترقی کو روک دیا ہے اور اسی لئے وہ زیادہ تر لفظی بحثوں میں الجھ گئے ہیں انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ طب میں فلسفہ اور طبیعیات کی آمیزش شیخ کے مسلک کے خلاف ہے۔ اور اس سے بچنا ضروری ہے۔ انھیں دوران مطالعہ یہ بھی معلوم ہوا کہ جالینوس اور بوعلی سینا کے بہت سے نظریات قابل تنقیح ہیں اور اگر ان کی جلد تنقیح نہ کی گئی تو طب قدیم کا یہ قلعہ کسی دن منہدم ہو جائے گا۔

یہ تمام خیالات دل و دماغ میں موجزن مگر ان خیالات کی تکمیل کسی صورت سے ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ اسی دوران ایک تاریخی واقعہ پیش آیا جس سے ان کے



خیالات کو مزید تقویت ہو گئی۔

طب کی تعلیم کا اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ خاندان کے مختلف بزرگ اپنے اپنے مطلب میں طلباء طب کو درس دیتے تھے کوئی باقاعدہ درسگاہ نہ تھی۔ اسی دوران میں سید احمد خان نے مدرستہ العلوم کی تحریک شروع کی۔ اگرچہ ابتدا میں سرسید کی سخت مخالفت ہوئی مگر سرسید کے پختہ عزم و استقلال اور خلوص و ایثار نے اس تحریک کو کامیاب کر دیا۔ اس طرح مختلف علوم کے مدارس کے قیام کی جانب خواہی توجہ مبذول ہو گئی۔ شریف خانی خاندان بھی اس سے متاثر ہوا اور ایک طبی مدرسے کے اجراء کے مشورے ہونے لگے۔ اور آخر حکیم عبدالمجید نے ۱۸۸۲ء میں مدرسہ طبیہ کا افتتاح کر دیا ایسے موقع پر حکیم اجمل خاں کی عمر انیس سال تھی تاہم انہوں نے مدرسہ میں پوری دلچسپی لینی شروع کر دی۔ اسی زمانے میں ان کو طب یونانی کے متعلق بحث و نظر کا موقع ملا اور وہ اپنے استاد طب حکیم مولوی عبدالرشید خاں اور مولوی حکیم جمیل آلین سے تبادلہ خیالات بھی کرتے رہے کیونکہ اساتذہ سے استفادہ میں کوئی جھجک مانع نہیں تھی۔

مدرسہ کے قیام کے کچھ عرصہ کے بعد نصاب تعلیم میں جدید تشریح و جراحات کا اضافہ کیا گیا درحقیقت یہ اضافہ حکیم صاحب کی کوشش سے طب یونانی کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے کیا گیا تھا کیونکہ حکیم صاحب اس حقیقت سے واقف تھے کہ حکماء قدیم مثلاً التصریف زہراوی اور الکافی ہارون بن موافق اللہ کے مطابق تشریح الاعضا اور عمل بالید میں کتنی مہارت رکھتے تھے۔

۱۸۹۲ء میں حکیم صاحب کو ریاست رام پور میں طبیب خاص اور میڈیکل آفیسر کا عہدہ پیش کیا گیا۔ ریاست رام پور کے شریف خانی خاندان سے دیرینہ مراسم اور تعلقات تھے۔ ریاست کی جانب سے اس خاندان کا وظیفہ بھی مقرر تھا۔ اور وقت ضرورت حکیم عبدالمجید خاں خود ریاست میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ریاست کے نواب صاحب کی اس خواہش پر کہ حکیم عبدالمجید اپنے ایک بھائی کے قیام رام پور میں اجازت مرحمت فرمائیں حکیم اجمل خاں کا تقرر میڈیکل آفیسر کے طور پر عمل میں آیا تھا۔

دورانِ قیامِ رام پور حکیم صاحب کا تقرر چار سو روپیہ ماہوار ہوا تھا لیکن ان کی علمی قابلیت اور صلاحیت کی بنا پر چار سے چھ سو پھر آٹھ سو اور بعد میں ایک ہزار روپیہ ماہانہ ہو گیا۔ یہاں حکیم صاحب نے رام پور کے کتب خانے جس کے بعد میں وہ انچارج بھی ہو گئے تھے ایک ایک کتب کا بغور مطالعہ کیا اور ان نایاب کتابوں کی نقل کی اور کرائی جو خاندان شریفی کے کتب خانے میں موجود نہ تھیں۔ کتب خانہ رام پور اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے ان کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا جہاں دنیا کی نایاب و کمیاب کتب جمع تھیں۔ چنانچہ شریف خانی کتب خانہ کی بعض اہم کتابیں مثلاً جالینوس کا لکھا ہوا رسالہ نبض اور تلخیص المفتاح جو جالینوس نے بقراط کے اقوال کی شرح میں لکھی ہے، اور المنقذ من الملکہ فی دفع مضار السمائم الملکہ۔ التصریف لمن عجز عن التالیف حصہ جراحات ترویج الدرواح فجنیدی وغیرہ رام پور کے کتب خانہ سے ہی نقل کی گئی ہیں۔

قیامِ رام پور میں حکیم صاحب نے ادبیات عرب کی بھی تکمیل کی فی الحقیقت حکیم اجمل خاں دنیا کے بڑے آدمیوں کی طرح خود بھی ادب کی جانب طبعی رجحان رکھتے تھے لیکن طب کے خاندانی شغل ہونے کی بنا پر وہ ادب کو نہتہائے مقصود نہیں بنا سکتے تھے دہلی میں دیگر علوم کی طرح عربی و فارسی کی تکمیل ضرور کی تھی مگر ایک طالب علم کی طرح تشنگی ابھی باقی تھی۔ اس وقت عربی کے مشہور عالم مولانا محمد طیب عرب وہاں موجود تھے جو عربی کے صرف عالم ہی نہ تھے بلکہ شاعر اور ادیب بھی تھے۔ حکیم صاحب نے ایسے موقع پر بلا تکلف مولانا کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا حکیم صاحب کو عربی میں تحریر و تقریر کی جو بے نظیر مہارت تھی جس کی بنا پر اکثر لوگ متحیر رہ جاتے تھے وہ درحقیقت مولانا کی تربیت کا ہی نتیجہ تھا۔ حکیم صاحب کے اس ادبی کمال کی وجہ سے علماء بہت متاثر ہوئے تھے چنانچہ جب عراق میں علماء سے تبادلہ خیالات کا اتفاق ہوا تو وہ سب کے سب حکیم صاحب کی سلیس و سگفتہ تحریر و تقریر سے متحیر ہو گئے تھے۔ اسی طرح مصر اور پیرس میں سعد زغلول پاشا اور دوسرے مشہور خطیب حکیم صاحب کی اس عربی دانی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی

جو عربی ادب کے مشہور نقاد اور صاحب علم تھے انھوں نے حکیم صاحب کے متعلق فرمایا تھا کہ ”میری نظر میں ہندوستان بھر میں حکیم اجمل خان سے زیادہ کوئی شخص قابلِ عزت نہیں ہے کیونکہ علم و امارت کا ان سے بہتر پیکر ملنا مشکل ہے۔“

قیام رامپور میں حکیم صاحب کے اس فارسی ذوق کی بھی نشوونما اور جلاہوتی حکیم صاحب کا مکان مرزا غالب کے مکان کے قریب ہی تھا اور مرزا غالب فارسی کے بہترین شاعر اور ماہر تھے اور ریاست رام پور نے غالب کو افکارِ مشیت سے آزاد کر کے تاجدارِ سخن بننے میں اگر مدد کی تھی تو حکیم صاحب نے ان کو فارسی و عربی کا بہترین ادیب اور شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہونے میں بھی مدد دی۔

حکیم صاحب کے قیام رام پور کے زمانہ میں دربارِ رام پور میں اردو و فارسی اور عربی کے بہترین ادیب جمع تھے اور شعرو سخن کی مختلف نشستیں، مذاکرے مجالس اور صحبتیں منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں نواب صاحب اور حکیم صاحب دونوں شریک ہوا کرتے تھے۔

حکیم صاحب رام پور میں طبیب بھی کیا کرتے تھے رام پور میں اس وقت متعدد معروف طبیب بھی موجود تھے۔ حکیم صاحب کا مطب تھوڑے ہی عرصہ میں مرجعِ خلافت بن گیا تھا لیکن حکیم صاحب مقامی طبیبوں کی حوصلہ افزائی کرنے سے کبھی دریغ نہیں کرتے تھے۔

اسی طرح حکیم صاحب کے نواب صاحب اتنے گرویدہ ہو گئے تھے کہ صرف علاج و معالجہ ہی میں نہیں بلکہ ریاست کے تمام امورِ مہمہ میں نواب صاحب کے مشیرِ خاص سے ہو گئے تھے بعض اوقات ریاست کے معاملات میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی جاتی تھیں مگر حکیم صاحب کا ناخن تدبیر ان گتھیوں کو آسانی سے سلجھا لیتا تھا۔ ریاست میں اثر و رسوخ میں حکیم صاحب کی شخصیت نواب رام پور بہرائی نس سرسید حاد علی خاں کے بعد سب سے زیادہ نمایاں تھی اگر حکیم صاحب دربار میں اس قدر اثر انداز تھے کہ ان کے مشورے سے اہم امور طے پاتے تھے تو دوسری جانب جمہور میں اس قدر ہر دل عزیز تھے کہ رام پور کے باشندے ان کا دلی احقلم کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ شرفاء کی اعانت اور غرباء کی دستگیری کرتے رہتے تھے۔

اس کے باوجود حکیم صاحب نے اپنے ذاتی مفاد یا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کبھی نہیں کی حالانکہ اس درجہ ریاستی امور میں غلبہ رکھنے کے بعد وہ فائدہ اٹھا سکتے تھے لیکن ان کا مزاج بالکل نواب و قارا ملک کی طرح تھا اور وہ پوری کوشش کرتے تھے کہ کوئی امر ان کے خاندانی وقار کے خلاف سرزد نہ ہو۔

قیام رام پور کے زمانہ میں حکیم صاحب کی تحریک پر نواب محسن الملک مرحوم علی گڑھ کالج کی جانب سے ایک ڈیپوٹیشن لے کر گئے جس میں نواب صاحب رام پور نے پچاس ہزار کا گراں قدر عطیہ عنایت کیا تھا۔ حکیم صاحب ہی کی وجہ سے رام پور میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا کامیاب جلسہ بھی ہوا اور اسی زمانے میں حکیم صاحب علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی بھی مقرر ہوئے تھے۔

ہنر بانی نس نواب صاحب پر حکیم صاحب کے غیر معمولی اثر و رسوخ کی بنا پر دربار میں بعض مخالفین بھی پیدا ہو گئے تھے لیکن نواب صاحب نے غیر معمولی اعتماد اور حکیم صاحب کی محتاط روش کی بنا پر یہ حاسدین اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ پھر بھی ایک بار نواب صاحب اور حکیم صاحب میں غلط فہمی پیدا ہو گئی لیکن نواب صاحب لوہارو کی مداخلت اور مساعی جمیلہ سے یہ آپسی غلط فہمی دور ہو گئی اور اس قدر تعلقات استوار ہو گئے کہ صرف موت کا زبردست پنجہ ہی ان دونوں کو آپس میں دور کر سکا۔ اس غلط فہمی کی تفصیل آگے درج ہے۔

نواب صاحب رام پور صبح چھ بجے سے شام کے ۴ بجے تک سوتے تھے اس لئے دن کا یہ حصہ حکیم صاحب کے لئے اکثر و بیشتر فرصت کا ہوتا تھا۔ حکیم اجمل خاں قیام رام پور میں صبح چھ بجے سو کر اٹھتے تھے اور ضروریات و حوائج ضروریہ سے فراغت کر کے صبح کے ۱۰ بجے سے ۱۰ بجے تک مطب میں مریضوں کو دیکھتے تھے اور بجے کے بعد شام ۴ بجے یعنی نواب صاحب کے سو کر اٹھنے تک عبدالصمد خاں چیف سکرٹری ریاست رام پور کے ساتھ گزرتا تھا اور دوپہر کا کھانا بھی ان کے ساتھ ہی ہوتا تھا جو انگریزی طرز کا ہوتا تھا۔

اس دوران ملاقاتی اور اسٹاف کے لوگ بھی ابتر رہتے تھے۔ شام ۴ بجے سے قبل جملہ متعلقہ احباب و اسٹاف کے ساتھ چائے ہوتی تھی۔ ۴ بجے نواب صاحب کے

بیدار ہوتے ہی سارا اسٹاف کمر بستہ اور مصروف عمل کاروبار ریاست ہو جاتا تھا اور دو گھنٹے تک نواب صاحب ریاست کے کاروبار اور کاغذات دیکھنے کے بعد پھر حکیم صاحب کو اپنے فریب بلا لیتے تھے۔ جو رات کے ۲ بجے تک ساتھ رہتے تھے۔ اس سبب رات کے کھانے ۸ بجے سے قبل نواب صاحب اندرون محل بیگمات کے پاس جاتے تھے تو حکیم صاحب اس درمیانی وقفے میں بلیرڈ کے کھیل سے منگولوظ ہوتے تھے۔ ٹھیک آٹھ بجے نواب صاحب اور لواحقین مع حکیم صاحب کے کھانے کی میز پر موجود ہو جاتے تھے جن کی تعداد قریب اکیس ہوتی تھی اور کبھی کبھی کسی خاص مہمان کے آ موجود ہونے پر ان اکیس شرکاء میں سے کسی کو قطع کر دیا جاتا تھا۔ اگر کبھی شب ۲ بجے سے پہلے حکیم صاحب کو نواب صاحب کی خدمت سے چھٹی مل جاتی تو یہ وقفہ حکیم صاحب کا مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ کبھی کبھی دن میں بھی دواخانہ سے فرصت کے بعد حکیم صاحب ان کتب کا مطالعہ کرتے تھے۔

ایام محرم میں اوقات شب میں نواب صاحب کے ساتھ حکیم صاحب شریک مجالس ضرور ہوتے تھے مگر نواب صاحب یا دیگر شرکاء و رفقہ کی طرح کبھی ماتم یا نوبہ خوانی کبھی نہ کرتے تھے جیسا کہ دیگر درباری اور خوشامدی لوگ کرتے تھے نواب صاحب کی سالگرہ کے موقع پر عوام و خواص کی نظریں نواب صاحب کی خدمت میں پیش کی جاتیں اور نواب صاحب ان پر ہاتھ رکھ کر واپس کر دیتے جس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ نواب صاحب نے قبول کر لی ہیں مگر حکیم صاحب کا جو تحفہ پیش ہوتا تھا وہ نواب صاحب نے صرف قبول ہی کرتے تھے بلکہ احتیاط خاص سے اپنے پاس محفوظ کر لیتے تھے حکیم صاحب کا یہ تحفہ عام طور پر ڈوا شرفیاں اور ایک خوبصورت سی شیشی ہوتی تھی جو حکیم صاحب کے لئے خاص طور پر تیار کی جاتی تھیں ان شیشیوں میں ایک خواص گولیاں ہوتی تھیں جو صرف نواب صاحب کے لئے مخصوص تھیں۔ اگر گورنر اودھ (یوپی) کبھی رام پور تشریف لاتے تو حکیم صاحب قبلہ کو بھی دہلی سے نواب صاحب ضرور بلاتے تھے رام پور سے ہی حکیم صاحب کے تعلقات سرجمیس سٹن اور نہ بار کورٹ ٹیلر نیز دیگر ذمہ دار انگریزوں سے وسیع ہوئے تھے۔ نواب رام پور اور حکیم صاحب کے تعلقات اتنے زیادہ وسیع ہو گئے تھے کہ

حکیم صاحب یا نواب رام پور کو ایک دوسرے کے بغیر سکون نہ رہتا تھا۔  
حسب ذیل واقعات سے ان تعلقات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

(۱) نواب رام پور کو جب کبھی حکیم صاحب کو بلانا اور ملنا مقصود ہوتا تو اتن بیابا یا پرائیوٹ سیکرٹری کو حکم دیتے کہ فوراً حکیم صاحب کو تار دو کہ براہ مہربانی پہلی ٹرین سے رام پور تشریف لائیں۔ وہ فوراً حکم کی تعمیل کرتے تھے اس کے گھنٹہ یاد و گھنٹہ کے بعد پھر دریافت فرماتے کہ حکیم صاحب کو کسی نے بلایا کہ نہیں جواب دیا جاتا کہ حضور تار دیا ہے۔ حکم ہونا کہ مجھے انتظار ہے ایک تار اور بھیجو۔ اس کی بھی تعمیل کی جاتی۔ اسی طرح ہر گھنٹہ میں بار بار دریافت فرماتے اور تار بھجواتے رہتے تھے یہاں تک کہ حکیم صاحب کا جواب پہنچ جاتا کہ میں فلاں گاڑی سے رام پور پہنچتا ہوں پس اطمینان ہو جاتا اور اب اس گاڑی کا انتظار شروع ہوتا وہ حکیم صاحب کی آمد کی گھڑیاں گنتے تھے اور بے چین رہتے تھے۔ یہ حال تھا نواب صاحب کی حکیم صاحب کے ساتھ گرویدگی کا۔ خدا جانے حکیم صاحب نے کیا جادو کر دیا تھا کہ نواب صاحب کو حکیم اجمل خاں کے بغیر چین نہ ہوتا تھا۔ جب وہ رام پور میں رہتے تھے اور حد درجہ انتظار رہتا تھا جب وہ دہلی یا دیگر کسی مقام پر رہتے تھے اور اگر بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوتی تھی تو بہت بے تابی کے ساتھ بغلیں ہو جاتے تھے۔

(۲) چنانچہ ۲۵ ستمبر ۱۹۲۵ء کو حکیم اجمل خاں جب اپنے اسفار یورپ و فرانس سے واپس آئے تو بے شمار دوست احباب اور مذاہنوں نے ان کو گھمیر لیا اور ہار پھول پہنائے۔ اسی دوران حکیم صاحب کو اطلاع دی گئی کہ نواب صاحب رام پور بندرگاہ کے باہر ایک طویل وقفہ سے اپنی موٹر میں آپ کے منتظر ہیں۔ یہ سنتے ہی حکیم صاحب فوراً باہر کی جانب چلے جب بندرگاہ کے باہر حکیم صاحب آئے تو نواب صاحب کو موٹر میں منتظر بیٹھا پایا۔ حکیم اجمل خاں کو پھولوں اور باروں سے لدا پھندا دیکھ کر نواب صاحب موٹر سے اتر کر حکیم اجمل خاں سے بغلیں ہو گئے اور نواب صاحب کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ ”حکیم صاحب آپ کے انتظار میں آنکھیں پھرا گئیں۔ اور آپ نے جس مقصد کے لئے یہ سفر اور میں نے فراق گوارا کیا اس میں بہت

کامیابی تو نوظ نہی آئی۔ ” آپ کی صحت اس سفر سے کچھ بہت زیادہ تو بہتر نہیں ہوئی۔ ” غرضکہ یہ عاشق و معشوق ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے موٹر میں سوار ہونے اور سہارا جہ اندور کے بنگلہ میں جہاں نواب صاحب قیام رکھتے تھے روانہ ہو گئے۔

(۳) ایک بار نواب صاحب ہیرائی نس رام پور بہادر کو پیش کی شکایت ہوئی۔ حکیم اجمل خاں صاحب کو بلایا گیا جنہوں نے نواب صاحب کے لئے روغن بیدانجر اور دودھ بھونیر فرما کر اپنے سامنے پلوا دیا۔ اور تمام دن غذا میں سوائے دودھ کے دیگر کوئی غذا ان کو نہ دی گئی۔ شب کو آٹھ بجے جو عموماً نواب صاحب کے کھانے کا وقت ہوتا تھا خاصہ پر اس وقت حکیم اجمل خاں مولوی مقبول احمد صاحب مجتہد اور دیگر رؤسا و اراکین ریاست تھے۔ حسب ارشاد معالج خاص حکیم اجمل خاں کے مونگ کی دال کی کھچڑی پتلی پتلی نواب صاحب کے لئے اور حکیم صاحب و دیگر اراکین کے لئے مختلف انواع و اقسام کے کھانے پیش کئے گئے۔ نواب صاحب کو اس دن پورے دن کا فاقہ تھا اور تیل انڈی اور دودھ کا جلاب پہلے ہی دیئے جا چکے تھے اور بالعموم شب کو وہ ایک ہی وقت کھانے کے عادی تھے کیونکہ تمام دن شام تک سوتے تھے مگر اس دن جلاب کی وجہ سے تمام دن جاگتے رہے تھے اس لئے بھوک کا غلبہ شدت سے تھا۔ روزہ داروں کی طرح چہرہ تھمٹایا ہوا تھا۔ جب کھچڑی سامنے آئی تو نواب صاحب نے مولوی مقبول احمد صاحب مجتہد سے دریافت کیا کہ ”مولوی صاحب حکم ہے۔ ذرا استخارہ دیکھ کر مجھ سے فرمائیے۔“ مولوی صاحب نے اپنی تسبیح پر کچھ پڑھا اور پھر کچھ شمار کیا اور کہا حضور ممانعت ہے۔ ”مجھ کو سب لوگ بیٹھے رہے۔ پندرہ منٹ بعد نواب صاحب نے پھر مولوی صاحب سے استخارہ دیکھنے کی خواہش کی پھر مولوی صاحب نے اسی طرح عرض کیا کہ حضور اب کی مرتبہ بھی ممانعت آئی۔“ اب نواب صاحب کو بیتابی شروع ہو گئی چہرہ پر گاہے ضعف کی زردی اور گاہے غصہ کی وجہ سے سرخی جھمک جاتی تھی۔ آخر ٹھوڑی دیر کے بعد پھر مولوی صاحب سے استخارہ دیکھنے کے لئے اترتا ہوا۔ مولوی صاحب نے بدستور پھر حکم ممانعت فرمایا۔ اب تو حکیم صاحب سے برداشت نہ ہو سکا اور انہوں نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ سرکار! میں

بحیثیت آپ کا معالج ہونے کے حکم دیتا ہوں کہ آپ فوراً بلاتا خیر کھانا شروع کر دیں۔  
نواب رامپور نے اسی وقت کھانا شروع کر دیا۔ اور پھر مجتہد صاحب کے مقدر میں  
جتنی منغلاط لکھی تھیں وہ ان کو اسی وقت نقد وصول ہو گئیں۔ پھر نواب صاحب  
کی طبیعت ٹھیک ہو گئی اور وہ دہلی آ گئے۔

اور اس طرح حکیم صاحب ۱۹۰۲ء میں اپنے وطن دہلی کو رامپور سے تشریف  
لے آئے۔ اور ۱۹۰۴ء تک حکیم صاحب کا قیام زیادہ تر دہلی میں رہا۔ اس زمانے  
میں انھوں نے دو اہم کام کئے۔ ایک تو مدرسہ طبیہ دہلی کا ترجمان مجلہ طبیہ  
کے نام سے شائع کیا مجلہ طبیہ ماہوار رسالہ تھا جس میں مدرسہ کی خبروں کے  
علاوہ طبی مضامین ہوتے تھے۔ یہ رسالہ عرصہ تک بہترین خدمات انجام دیتا  
رہا اور اس کی ادارت کے فرائض زیادہ تر یہی حکیم سید عبدالرزاق معلم تشریح  
الاعضاء کے ذمہ رہے۔ حکیم سید عبدالرزاق اس کو نہایت محنت اور کاوش سے  
مرتب کرتے تھے۔ اس رسالے کے پہلے سرپرست حکیم واصل خان تھے مگر حقیقتاً  
پالیسی ڈائریکٹر حکیم اجمل خان ہی تھے۔ حکیم صاحب وقتاً فوقتاً اس میں مضامین بھی  
لکھتے رہتے تھے جو عام طور پر مقبول ہوتے رہتے تھے۔ ان مضامین میں سب سے  
پہلا مضمون پانی پر تھا اس مضمون میں حکیم صاحب نے نہایت سیر حاصل بحث  
کی تھی اور اس کا کوئی پہلو نشہ نہیں رہنے دیا تھا یہ مضمون کئی نمبروں میں شائع  
ہوا تھا۔

دوسرا اہم کام مفرد دواؤں کی بہم رسانی اور مرکب دواؤں کی تیاری کے  
لئے ایک مرکز کے قیام کا تھا۔

حقیقتاً دور آخر کے مجدد طب اجمل خاں اعظم کا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے  
چونکہ مدرسہ طبیہ تو قائم ہو چکا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتابیں پڑھ لینے اور  
مطب کر لینے سے تو مسئلہ حل نہیں ہو جاتا تھا۔ جب تک طلباء کو دواؤں کے  
وسیع علم کے ذاتی مشاہدے کی بنا پر واقفیت نہ ہوتی کہ وہ اصلی نقلی دوا کونسا  
کر سکیں ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت اطباء شناخت ادویہ سے قاصر تھے کیونکہ  
درس و تدریس کے بعد مطب سے سابقہ پڑ جاتا تھا ان حالات میں ضرورت تھی کہ



کہ ایک ایسا دواخانہ قائم ہو جو

- ۱۔ مدرسہ طبیہ کے طلباء کو شناخت ادویہ اور دوا سازی کا علم سکھائے۔
- ۲۔ مفردات اصلی اور خالص مہیا کرے۔
- ۳۔ مرکبات اصلی اور اعلیٰ تیار کرے۔
- ۴۔ ملک کے سامنے تجارت ادویہ کا صحیح طریقہ پیش کرے جس میں تجارتی لوٹ مار نہ ہو۔ بلکہ معتدل تجارتی منفعت کے ساتھ مریضوں اور غریبوں کی ہمدردی کا عنصر غالب ہو۔

۵۔ ہندوستان میں پیدا ہونے والی ہزار ہا جڑی بوٹیوں پر تحقیق کی جائے ریسرچ کی جائے اور اطباء کے ذریعہ ان پر تجربہ کے بعد ان دواؤں کو عوامی خدمت کے لئے عام کیا جائے۔

اس کام کے لئے یونانی اینڈ ویدک میڈسینر لٹٹیڈ کمپنی کا اجراء تھا یہ کمپنی مشترک سرمایہ سے قائم کی گئی تھی اور اس کا منشاء صحیح اور عمدہ مفرد و مرکب دواؤں کی فراہمی تھا۔ کمپنی مشترک سرمائے سے جن میں حکیم صاحب کے ذاتی دوستوں نے حصہ لیا جن میں مرزا اکبر علی خان مرحوم رئیس۔ نواب فیض احمد خاں رئیس۔ لالہ گل کشور وکیل۔ لالہ ہزاری مل جوہری۔ مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتہانی۔ شمس العلماء ہند سید احمد۔ امام جامع مسجد دہلی۔ میر جمال الدین وغیرہ دہلی کے اکابرین اور کچھ اہل علم کے رؤسا اور معززین شامل تھے۔ شروع میں سرمایہ چند ہزار پر مشتمل تھا اور جو انٹرنٹ اسٹاک کمپنی ایکٹ کے ماتحت کمپنی قائم کرائی گئی تھی۔

یہ کمپنی فی الحقیقت اس عظیم الشان پروگرام کا ایک جز تھی جو حکیم صاحب نے فن کی ترقی و اصلاح کے لئے تیار کیا تھا۔

اس کمپنی نے تھوڑے ہی عرصہ میں بہت ترقی کر لی۔ خاندان شریفی کی سرپرستی کی وجہ سے جمہور کو بہت جلد کمپنی کے دواخانہ کی طرف توجہ ہو گئی اور اس کی آمدنی ماہانہ ڈیڑھ دو ہزار تک ہو گئی۔

۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء میں حکیم صاحب قولنج اور ضعف قلب کے دوروں کی وجہ سے عرصہ تک علیل رہے جس کا سبب منجھلے بھائی حکیم واصل خان کا عین عالم جوا

میں دنیا سے رحلت ہونا اور بڑے بھائی حکیم عبدالحمید خان کے انتقال کے وقت غسل کھا کر گر پڑے تھے اور عمر بھر اختلاجِ قلب کا جو عارضہ رہا یہی حادثہ اور پھر منجھلے بھائی کے حادثہ نے مل کر ایک عجیب مریض بنا دیا تھا جس سے حکیم صاحب چھٹکارہ نہ پاسکے تھے اس وقت ڈاکٹروں نے یہ تجویز کیا کہ یہ عصبِ راجع ذیوگسٹریوں کا دروس ہے ان دوروں کی وجہ سے حکیم اجمل خاں بہت کمزور ہو گئے اور کئی ماہ تک مہسرولی لاہور منٹگری۔ ملتان کا سفر کیا۔

اسی صبح قریب ۱۹۰۵ء میں حکیم واصل خان کا انتقال ہوا اور خاندان کے دستور کے مطابق حکیم اجمل خاں ان کے جانشین ہوئے اس وقت بھی حکیم صاحب پر نقاہتِ مرض کا اثر تھا اس لئے جاٹ پنی کے چند روز بعد حکیم اجمل خاں صاحب نے حصولِ صحت کے لئے سفرِ بغداد کا عزم کیا۔ چنانچہ المارچ ۱۹۰۵ء کو حکیم صاحب اپنے دیگر رفقاء، حکیم مولوی امجد علی آنریری مجسٹریٹ و میونسپل کمشنر دہلی اور سید حامد صاحب جو شمس العلماء مولوی سید احمد امام جامع مسجد دہلی کے بھائی تھے کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اس سفر میں حکیم صاحب نے مسقط۔ بصرہ۔ قسطنطنیہ بغداد کوفہ کربلائے معلیٰ نجف اشرف کے علاوہ عراق کے دوسرے قبائلیات کی زیارت مقابر کی زیارات اور اکابرین عراق سے ذاتی تعلق و ارتباط کا رشتہ قائم ہوا جس سے آپ کی صداقت اور علمی قابلیت کی بہت شہرت ہوئی بغداد میں متعدد طبی و مذہبی اختلافی مسائل پر حکیم صاحب اور بغداد کے مشہور علماء میں مذاکرہ ہوا اور سب ان کے تبحر اور قادر الکلامی کے قائل ہو گئے اور ۹ جون ۱۹۰۵ء کو حکیم صاحب بخیریت دہلی آگئے۔ اور اہل دہلی نے ان کا استقبال کیا۔

ادھر حکیم اجمل خان کے سفر عراق و بغداد اسلامیہ کے دوران بنگال میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا انقلابیوں کے ذہن میں تانا بانا بنا جا رہا تھا اور ۱۸۵۷ء کے بعد اس وقت تک سیاسی غلامی کے خلاف ہندوستان کی سرزمین پر کوئی اتنا بڑا مظاہرہ نہ ہوا تھا چنانچہ ۱۹۰۵ء کو جب کہ ہندوستان پر لارڈ کمرزن کی حکومت تھی یہ حکومت کی چال چلی گئی کہ ہندو مسلم تفریق کر کے سیاسی شورش کا رخ فرقہ وارانہ کشمکش کی جانب پھیر دیا جائے تاریخ مذکورہ

کو تقسیم متحدہ بنگال کا اعلان شائع ہوا

یہ ایک چنگاری تھی جو بنگال کے بارود خانے میں گری

ادھر حکیم صاحب نے ممالک غیر کے اسفار سے آتے ہی سب سے پہلے مطب کی ترقی کی جانب توجہ کی اور تھوڑے ہی عرصے میں مطب کو نہایت کامیاب بنا دیا ان کے مطب میں رجوعات کا یہ عالم تھا کہ وہ صبح سے ابجے تک اور شام کو دو تین گھنٹے بیٹھتے تھے اور بمشکل مریضوں کا ہجوم ختم ہوتا تھا۔ اس عرصہ میں وہ کئی کئی سو مریضوں کو دیکھتے تھے۔ مریض نہ صرف مدراس بمبئی اور برما جیسے دور دراز مقامات سے آنے لگے بلکہ ایران، عراق، افغانستان اور ترکستان وغیرہ ممالک غیر کے مریض بھی ان کے مطب کا طواف کرنے لگے۔

حکیم صاحب کے مطب کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے یہاں مطب میں امیر غریب ہندو مسلمان غرضکہ سب کے ساتھ مساوی حیثیت کا بتاؤ ہوتا تھا۔ اسی ایسا۔ انڈرپوز مشہور پادری نے حکیم صاحب اور ان کے مطب کے لیے حسب ذیل الفاظ کہے تھے۔

”حکیم صاحب کی سب سے پہلی ملاقات میرے لئے ہمیشہ یادگار رہے گی۔ اس سے ہندوستان اور اہل ہند کے متعلق ایک نئی روشنی میرے دماغ پر پڑی میری پرورش انگلو انڈین کے قدیم گھرانے میں ہوئی تھی اور میرے دماغ میں یہ خیال ٹھونس دیا گیا تھا کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان مذہب اور ذات پات کی وجہ سے ایک ایسی تلخ حائل ہے جو کسی طرح پاٹی نہیں جاسکتی۔ مجھے یہ بتلایا گیا تھا کہ ہندو مسلمانوں کا اتحاد پانی اور تیل کے اتحاد سے زیادہ ممکن نہیں ہے۔ انگلستان سے دہلی آنے پر میرے اس اعتقاد کو کئی مرتبہ صدمہ پہنچ چکا تھا۔ مگر حکیم صاحب کے مطب کو دیکھ کر تو وہ بالکل پاش پاش ہو گیا۔ میرے ساتھ کے پادری نے مجھے بتایا کہ حکیم صاحب کے مطب میں ہر مذہب و ملت کے اشخاص آتے ہیں اور حکیم صاحب ہر امیر و غریب و مسلمان میں کوئی تمیز نہیں کرتے ہیں۔ میں نے ان غریب ہندو مریضوں کو خصوصیت سے دیکھا جو حکیم صاحب سے بلا معاوضہ مشورہ حاصل کر رہے تھے۔“

اسی طرح ایک مرتبہ لارڈ ہارڈنگ سابق وائسرائے ہند کے پرائیویٹ سکریٹری

حکیم صاحب سے مشورہ لینے کے لئے آئے۔ وہ حکیم صاحب کے مطب کا منظر دیکھ کر بہت حیران ہوئے اور انھوں نے لارڈ ہارڈنگ سے اس کا ذکر کیا۔ لارڈ ہارڈنگ اس کے بعد حکیم صاحب کو میگنٹ آف انڈیا (ہندوستان کا مقناطیس) کہا کرتے تھے۔

مطب کی مصروفیات اور مشغولیات کے باوجود حکیم صاحب خاموش نہ بیٹھتے تھے اور طب کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے فروری ۱۹۰۶ء میں طبی تحریک کے لئے ایک قدم آگے بڑھا کر اطباء اور طب یونانی کی بازگشت ایوانِ قصہ میں پہنچانے کے لئے طبی کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ اس تحریک کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ حکیم صاحب طب یونانی اور برادرانِ وطن کی طب ویدک کی متحدہ اور مشترکہ ترقی کے لئے روزِ اول سے ہی کوشاں تھے حالانکہ اس وقت سیاسی نقطہ نظر سے ہندو مسلمان اتحاد کا سوال زیادہ نمایاں نہ ہوا تھا۔ پھر بھی حکیم صاحب کی دوراندیشی وقت کے تقاضوں کو بہت پہلے ہی سمجھ چکی تھی۔

اس کے قبل حکیم صاحب بعض مذہبی تحریکات میں بھی حصہ لے چکے تھے۔ ریواڑی کے ایک پادری نے اسلام کے خلاف متعدد کتابیں لکھیں۔ ان میں اس نے نہایت دلآزار پیرائے میں حضور پاک کی سیرت پر سخت حملے کئے اور مختلف یتیم مسلمان لڑکے اور لڑکیوں کو عیسائی بنا لیا تھا۔ ان میں سے ایک دہلی کی تھی۔ اس واقعہ سے مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا۔ حکیم صاحب بھی اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے دہلی کے ایک صاحب دل کی معیت میں محلہ جتلی قبر میں ایک یتیم خانہ قائم کیا جو ان کے دور میں بہترین انتظامات کے ساتھ چلتا رہا۔ اور اسی سال ڈھاکہ میں علی گڑھ کی ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا چنانچہ ڈھاکہ میں ہی نواب سر سلیم اللہ حکیم حبیب الرحمن خان نواب وقار الملک نے ایک سیاسی جماعت بنانے کے لئے جلسہ کرنے کا فیصلہ کیا اور پہلے جلسہ ڈھاکہ میں مسلم لیگ کا سنگ بنیاد پڑ گیا۔ لہذا پہلا ہی بنیادی ریزولیشن جس میں مسلم لیگ کے قیام کا اعلان کیا گیا جو نواب ڈھاکہ نے پیش کیا تھا حکیم صاحب ہی نے اس کی تائید کی تھی۔ یہاں لیگ کے جو ممبران پنجاب کی نمائندگی کے لئے نامزد کئے گئے

ان میں حکیم صاحب کا نام بھی تھا اس طرح حکیم صاحب مسلم لیگ کے اولین معاروں میں سے ایک تھے اور آخر تک وہ مسلم لیگ کی پالیسی کو زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ عوامی زندگی کے سانچے میں ڈھالتے رہے تب تک جب تک کہ وہ کانگریس کے برابر نہ ہو گئی۔

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ڈھاکہ میں مسلم لیگ کا قیام حکیم صاحب کی سیاسی زندگی کی پہلی سیڑھی اور آغاز تھا۔

۱۹۰۷ء میں حکیم صاحب نے ”یونانی“ اینڈ ویدک میڈیسن ” لمٹیڈ کمپنی کے شرکاء کو اس پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے حصص مدرسہ طبیہ کے حق میں فروخت کر دیں۔ کمپنی کے حصہ داروں نے بلا تامل حکیم صاحب کے ارشاد کی تعمیل کی بلکہ بعض نے اپنا حصہ بھی چھوڑ دیا چونکہ ہندوستانی دواخانہ بنانے کا مقصد اعلیٰ اور معیاری دواؤں کی فراہمی تھی دو سال تک دواخانہ نے عوام کی خدمت کی اس کا اعتراف کیا گیا اور اسی درمیان حکیم صاحب نے دواخانہ میں شعبہ ادویہ کی تدوین و اصلاح کی ایک زبردست اسکیم تیار کی اور اسی غرض سے تمام مروجہ نسخوں کی جانچ پڑتال دواؤں کے تحفظ اور تیاری کو جدید علمی تقاضوں کے مطابق بنایا گیا اور کاروباری نظام پر نظر ثانی کی گئی۔ بعض قابل افراد کا تقرر اس کی انتظامیہ میں کیا۔ اس طرح دواخانہ ترقی کرنے لگا۔

۱۹۰۷ء تک حکیم صاحب کی زندگی کے بیشتر اوقات اپنے مطب یا رام پور اور علی گڑھ کے حالات میں اور سیاسی طور پر مسلم لیگ کی تحریک میں صرف ہو رہے تھے کانگریس کی تحریک میں عملی طور پر شریک نہ تھے لیکن ذہنی طور پر وہ کانگریس کی تحریک سے ہم آہنگ تھے کیونکہ ان کے خاندان کا قدیمی اخبار اکمل الاخبار کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی دلچسپی کانگریس سے ہو گئی تھی۔

جون اور جولائی ۱۹۰۷ء کے مہینوں میں کام کی کثرت کی وجہ سے حکیم صاحب کی صحت بہت گر گئی تھی لہذا عرصہ تک صحت کی خاطر کوئٹہ میں مقیم رہے۔ سال کے آخری چند ماہ زیادہ تر خیر پور اور فریدکوٹ میں بسلسلہ علاج گذرے اور دسمبر میں حکیم اجمل خان مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے کراچی تشریف لے گئے۔

ہندوستانی دواخانہ کی جانب سے مطمئن ہو کر ایک اور اہم ضرورت کی جانب

توجہ مبذول کی۔ ہندوستان میں جاہل و ناقابل دانیوں کی وجہ سے عورتوں اور نومولود بچوں پر کیا کیا ظلم ہوتا ہے اس درد انگیز داستان سے ہر کوئی واقف ہے۔ حکیم اجمل خان کا درد آشنا دل بھلا اس ہلاکت آفرینی کو کب تک برداشت کرتا۔ چنانچہ انھوں نے اس مصیبت عظمیٰ سے اہل ہند کو بچانے کے لئے ایک زنانہ طبی مدرسہ کی ایک شروع کردی اور ایک قلیل عرصہ میں چالیس ہزار روپیہ جمع کر لیا۔ اور اس صرمایہ سے اس مدرسہ کا افتتاح دہلی کے محلہ چوڑی والان میں ایک وسیع مکان کرایہ پر لے کر زنانہ طبی مدرسہ اور زنانہ طبی شفا خانے کا انتظام کرنا شروع کر دیا۔ اور پنجاب کے گورنمنٹ گورنر مسٹر یوٹی ڈین کی اہلیہ سے اس ادارہ کا افتتاح کروانے کی درخواست کی اور وقت مقررہ پر ڈین صاحب مع اپنی اہلیہ اور مسٹر ہمفری ڈپٹی کمشنر کے تشریف لائے۔ اس موقع پر رؤساء دہلی اور عمائدین و خواص حکیم صاحب کے موجود تھے۔ رسم افتتاح کے قبل کرنل اسمعیل خان نے جو حکیم صاحب کے دوستوں میں تھے اور ایران میں سفیر تھے، ایک تقریر فارسی زبان میں کی۔ جس میں کرنل اسمعیل نے گورنر اور ان کی لیڈی صاحبہ کا خیر مقدم کیا تھا اور زنانہ طبی ادارہ کی اہمیت و افادیت کے ذکر کے ساتھ چار ہزار روپیہ کی امداد کا اعلان بھی کیا تھا۔

گورنر بہادر نے انگریزی میں ایک ہمدردانہ تقریر کے ساتھ حاذق الملک کے اس کام کی تعریف کی اور کہا۔

” میری حاذق الملک کے خاندان سے بہت دیرینہ واقفیت ہے جب موجودہ حاذق الملک حکیم اجمل خان صاحب کے بڑے بھائی حکیم عبدالمجید خان کے لئے کسی موزوں و مناسب خطاب کا مسئلہ گورنمنٹ آف انڈیا کے زیر غور تھا۔ میں اس زمانہ میں گورنمنٹ آف انڈیا کے سکرٹریٹ کا ایک عہدہ دار تھا۔ اور وہ شخص میں ہی ہوں۔ جس نے گورنمنٹ آف انڈیا کو مشورہ دیا تھا کہ حکیم عبدالمجید خان کے لئے خطاب حاذق الملک ہی مناسب و موزوں ہوگا۔ جو سابق گورنمنٹ نے حکیم عبدالمجید خان کے ایک بزرگ خاندان کے لئے تجویز کیا تھا پس بہتر نہ ہوگا کہ یہ ہی شاہی خطاب حکیم عبدالمجید خان کو دیا جائے۔۔۔۔۔“

آگے چل کر لفٹیننٹ گورنر بہادر نے کہا کہ مجھے خوشی یہ ہے کہ حکیم اجمل خان کو گورنمنٹ نے وہی خطاب حاذق الملک دیا ہے جو ان کے خاندان کا تاریخی خطاب ہے۔“

انگریزی حکومت نے بذریعہ خطابات غلام قوم کو مزید غلام بنانے کے لئے عجیب و غریب طریقہ اختیار کئے تھے۔ جن میں کچھ خرچ نہیں ہوتا تھا بلکہ آمدنی ہی ہو جاتی تھی۔ شاہی زمانہ میں خطابات کے ساتھ جاگیریں بھی عطا کی جاتی تھیں تاکہ خطاب یافتہ خطاب کے وقار کو برقرار رکھے ساتھ ہی وفاداری کا بھی مظاہرہ کرتا رہے۔ لیکن انگریزی حکومت دو چار حرفوں یا لفظوں پر ہی اکتفا کیا کرتی تھی۔ ہندوستانی خطابات میں بھی تفریق تھی۔ ابتدائی انگریزی عہد میں صرف دو چار ممتاز شخصیتیں انگریزی خطاب از قسم ”سیر“ یا ”سی۔ آئی۔ ای“ سے نوازی گئیں جو براہ راست لندن سے آتا تھا۔

البتہ گورنر جنرل کو بھی ”خانصاحب“ ”خان بہادر“ ”رائے صاحب“ ”رائے بہادر“ ”راؤ صاحب“ ”راؤ بہادر“ کو بھی عطا کرنے کا اختیار تھا۔

اور اس طرح ۱۹۰۸ء میں مدرسہ طیبہ تانہ کا قیام عمل میں آیا۔ شفاء الملک کے خطاب یافتہ طبیب تو پور سے ملک میں پھیلے ہوئے تھے لیکن ”حاذق الملک“ کا خطاب صرف حکیم اجمل خاں کے گھرانہ کے لئے مخصوص تھا۔ دہلی میں حکیم رضی الدین خاں بہادر شفاء الملک تھے اور حکیم حافظ محمد اجمل خان حاذق الملک۔ حکیم اجمل خاں نے حکومت کا یہ خطاب ۱۹۲۰ء میں حکومت کو واپس کر دیا۔ جس کا تاریخی پس منظر یہ ہے پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر اوڈا سیر اور فوجی افسر جنرل ڈائیر نے پہلی عالمی جنگ میں بھرپور مدد کا ہندوستانیوں کو یہ معاوضہ دیا کہ جلیا نوالہ باغ میں اپنی سفاکی سے خون کی وہ ندیاں بہائیں جس سے پورا ملک لرز گیا۔ جنگ میں فتح کے غرور نے ہندوستان کو یہ خون انعام دیا اور مسلمانان عالم کو خلافت اسلامیہ پر ضرب دے کر مشتعل کیا۔

مسلمانان ہند کو یہ دوسرا صدمہ پہنچا اور قومی تحریک حکومت کے خلاف شروع ہو گئی جس کا آغاز خطابات کی واپسی سے شروع ہوا چنانچہ حکیم محمد اجمل خاں

مرحوم و مغفور نے اپنا خطاب ”حاذق الملک“ و ”تمغہ قیصر ہند“ حکومت کو یہ کہہ کر واپس کیا کہ

”عطائے توبہ لقاے تو“

اس کے بعد ہی وہ تحریک ترک موالات کے رہنمائے اعظم بن گئے جو مہاتما گاندھی کے زیر قیادت چلی تھی۔

چونکہ اس وقت دستور تھا کہ عوام الناس کے خطابات کے علاوہ فن دانوں عالموں اور پنڈتوں کو بھی وائسرائے کی جانب سے خطابات دیئے جاتے تھے مثلاً طبیوں کو شفاء الملک اور حاذق الملک۔ عالموں کو شمس العلماء اور پنڈتوں کو مہا مہو یادھیائے۔

شمس العلماء کے لئے ایک سو روپیہ سالانہ کا عطیہ بھی تھا تاکہ وہ معاش کی طرف سے بے نیاز ہو کر علم کی خدمت کر سکیں۔

الغرض ان خطابات کے حصول کے سلسلے میں امیدوار لوگ جدوجہد کیا کرتے تھے اور رقمیں بھی صرف کرتے تھے جو گویا صاحب ثروت ہوتے تھے وہ کامیاب ہو جاتے تھے۔ اور مبارک و سلامت کے موقع پر وہ اور بھی صرف کیا کرتے تھے۔ بہر حال شاہی خطابات صرف کرنے کے لئے ملتے تھے اور انگریزی خطابات صرف کر کے ملتے تھے۔

خطابات کی واپسی پر حکومت ہند کو یہ غور کرنا پڑا کہ حکیم مرحوم پر کیا وار کیا جائے جس سے بزرگ انگریز یا برطانیہ ممدوح مرحوم کو سبق ملے۔ سیاسیات ہند (انگریزی) نے یہ گویا مفید تدبیر سوچی کہ سردست حکیم صاحب کو مالی نقصان پہنچایا جائے جس کا واحد طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ ریاستوں میں بحیثیت طبیب بلائے جانے پر پابندی لگادی جلتے تاکہ حکیم صاحب کو ایک ہزار روپیہ روز کا نقصان پہنچے۔ کیونکہ سہی ان کی روزانہ فیس تھی۔ جو اس زمانہ میں کسی بڑے سے بڑے ڈاکٹر یا طبیب کی نہیں تھی۔ غرضکہ محکمہ سیاسیات نے ایک گشتی (سرکلر) ریاستوں کو بھیجا کہ حکیم محمد اجمل خاں دہلوی کو کوئی ریاست ہماری اہانت کے بغیر نہ بلائے۔ حکیم صاحب کی طبی خدمات سے متاثر ہو کر انگریزی حکومت نے ان کو تمغہ



تعمیر کے لئے مطالبہ بھی سر فراز کیا تھا۔

جناب حکیم صاحب نے تحریک میں موالات میں شامل ہونے کے بعد اپنا خطاب نافق الملک اور غفرت مجید ہند نے واپس کر دیا تھا اس لئے وہاں ہاؤس نے ان کو اپنے ایک جلسے میں مسیح الملک کا خطاب دیکر حکیم صاحب کو مرہوم و مغفور کی مسیحانی کا اعلان کر دیا۔ جیسا کہ مرہوم و مغفور کی لہجی اور سیاسی زندگی کے ثابت کیا۔

## کانگریس کی صدارت پر

۱۹۲۱ء کا پہلا ہندوستان کے لئے بڑا انقلاب انگیز تھا اس وقت تحریک ترک موالات اس قدر عہد کی تھی کہ حکومت انگریزی پریشان ہو گئی حکومت برطانیہ نے اس تحریک کی غیر معمولی قوت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے اس بڑے مدبر کو ہندوستان بھیجا جس نے امریکہ کو محاربہ یورپ میں شریک کر کے جرمنی کو شکست دی تھی۔ لارڈ چیفورڈ ابتدا میں اس تحریک سے اغماض و تضحیک کرتے رہے مگر جب اس نے خطرناک صورت اختیار کر لی تو اس پر ہاتھ ڈالنے سے گھبرانے لگے۔ لارڈ ریڈنگ نے آتے ہی مقابلہ شروع کر دیا اور چالیس ہزار ہندوستانی قوم کو جیل میں بھر دیا مگر اس پر بھی یہ تحریک کم نہ ہوئی ایک اور دفعہ یہ ہوئی کہ حکومت نے کانگریس اور خلافت کے پرچوش رضا کاروں کو خلاف قانون قرار دیا۔

۱۹۲۱ء کے آخر میں احمد آباد میں کانگریس کا جلسہ ہوا اس جلسہ کی صدارت سی۔ آر۔ داس کو کرنی تھی مگر ان کے قید ہو جانے کی وجہ سے اجلاس کی صدارت حکیم اجمل خان کو کرنی پڑی۔ اس جلسہ میں مولانا حسرت موہانی کے آزادی کے رزولوشن کی وجہ سے سخت اختلاف تھا مگر حکیم صاحب اور مہاتما گاندھی کے اثر و رسوخ کی وجہ سے معاملہ زیادہ نہیں بڑھا۔

حکیم صاحب نے کانگریس کے فوائض صدارت انجام دینے کے بعد اپنے وقت کا بڑا حصہ اس تحریک میں صرف کرنا شروع کر دیا تھا۔

۱۹۲۲ء کے شروع میں مہاتما گاندھی نے واقعہ چورا چوری کی وجہ سے باردولی میں عدم ادائے محصولات (Non-cooperation) کی تحریک کو روک دیا اسکے

بعد ہی دہلی میں کانگریس کمیٹی کی میٹنگ ہوئی جس میں اطراف ہند کے رہنما آئے ہوئے تھے۔ مہاتما کے فیصلے بار دہلی کی وجہ سے ایک عام مایوسی کی فضا پھرا گئی تھی اور سب اسے مہلک غلطی قرار دے رہے تھے اس وقت حکیم صاحب نے مہاتما گاندھی کے ساتھ اس مایوسی کو دور کرنے کی سعی کی۔

بار دہلی کے التوا کی وجہ سے تحریک ترک موالات میں جو ضعف پیدا ہو گیا تھا اسے حکومت نے غنیمت جانا اور مہاتما گاندھی پر مقدمہ چلا کر انھیں چھ سال کے لئے جیل میں بھیج دیا اس وقت تمام تحریک کا بار حکیم صاحب کے کندھوں پر آن پڑا۔ تحریک کی قیادت ہاتھ میں لیتے ہوئے حکیم صاحب نے مہاتما گاندھی کو ایک یادگار خط بھیجا اور اس میں انھیں یقین دلایا کہ وہ ان کی طرح ہندوستان کی کامیابی کے لئے عدم تشدد اور ہندو مسلم اتحاد کو ضروری سمجھتے ہیں۔

ستمبر ۱۹۲۲ء میں وہ پنجاب پیراڈنشل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے اس میں انھوں نے اہل پنجاب کو نصیحت کی کہ وہ آپس میں نہ جھگڑیں ورنہ خلافت اور سوزاج کے مسائل حل نہ ہوں گے۔

اسی سال اس امر کی تحقیقات کے لئے کمیٹی بنائی گئی کہ اہل ہند پر اس قانون شکنی کے لئے آمادہ ہیں یا نہیں۔ اس کمیٹی میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری پنڈت نہرو اور مسٹر پٹیل وغیرہ شریک تھے حکیم اجمل خان اس کمیٹی کے صدر تھے یہ کمیٹی کئی ماہ تک ہندوستان میں دورہ کرتی رہی اور آخر میں اس نے ایک رپورٹ مرتب کی۔ الٹین مجلس میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا حکیم صاحب پنڈت نہرو اور مسٹر پٹیل نے یہ رائے دی کہ قوم پرستوں کو مسٹر داس کے پروگرام کے مطابق کونسلوں پر قبضہ کر کے حکومت کے کاموں میں رکاوٹ ڈالنی چاہیے۔ ڈاکٹر انصاری اور مسٹر مہر اس تجویز کے خلاف تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے تحریک ترک موالات کو نقصان پہنچے گا۔ اس رپورٹ کے بعد ہندوستان میں سخت خلیفتا شروع کیا اور کانگریس کے دو گروہ ہو گئے۔ بعض تو داخلہ کونسل کے خلاف تھے اور بعض اس کے حامی تھے۔ ناگپور کانگریس میں بھی یہ کش مکش رہی آخر دہلی کے خاص اجلاس میں مولانا ابوالکلام اور مولانا محمد علی کی کوششوں سے یہ قضیہ طے پایا گیا اور سورا جیوں کو

داخلہ کونسل کی اجازت مل گئی۔

تحریک ترک موالات میں غیر معمولی انہماک اور صرف وقت و دماغ کی وجہ سے حکیم صاحب کی صحت بہت خراب ہو گئی۔ اور وہ بہت کمزور ہو گئے اور ان کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ مجبور ہو کر حکیم صاحب نے مسوری ایبٹ آباد وغیرہ میں کچھ وقت صرف فرمایا اور آنکھوں کا آپریشن کرایا جس سے آرام ہو گیا۔

## طبیبہ کالج کا افتتاح :-

۱۹۱۶ء میں لارڈ ہارڈنگ نے طبیبہ کالج کا سنگ بنیاد رکھا تھا اس کے بعد سے ہی حکیم صاحب نے کالج کی عمارت بنوانی شروع کر دیں۔ یہ عمارت کی تعمیر پانچ چھ سال میں مکمل ہوئی اس وقت ان عمارت پر سات آٹھ لاکھ روپیہ صرف آچکا تھا۔ کالج کی عمارتیں نہایت وسیع شاندار اور خوش وضع تیار ہوئیں۔

دور سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے خاندان مغلیہ کی شاندار عمارت کا وسیع سلسلہ ہے۔ کالج کی عمارت کو دیکھ کر بے اختیار حکیم صاحب کی بلند مرتبہ شخصیت کا احساس ہوتا ہے۔

اگر حکیم صاحب نے اور دیگر کوئی کام بھی نہ کیا ہوتا تو یہ طبیبہ کالج ہی ان کو زندہ جاوید رکھنے کے لئے کافی تھا۔

عمارات مکمل ہوجانے کے بعد ۱۹۲۱ء میں گاندھی جی نے اس کالج کا شاندار افتتاح کیا۔ ہندوستانی دو خانہ کو اپنے تمام خاندانی مجربات دے کر وقف کر دیا اور اس کی آمدنی سے کم و بیش تمام اخراجات پورے ہوتے رہے۔

جامعہ ملیہ دہلی کے وہ امیر (وائس چانسلر) ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک اس کے اخراجات کے کفیل بھی تھے۔ ایک ایسا وقت بھی آیا جب اساتذہ کی تنخواہ دینے کے لئے انھیں اپنے پیسے کی قیمتی انگوٹھی بھی فروخت کرنی پڑی۔ جامعہ ملیہ کے علاوہ مسلم یونیورسٹی ندوۃ العلماء، دارالمصنفین اعظم گڑھ، نظارۃ المعارف دہلی مسلم ایجوکیشنل کونسل وغیرہ کے استحکام اور ترقی میں ہمیشہ سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ آخری ایام میں حکیم صاحب کا ارادہ تھا کہ صحت کے ذرا اچھا ہونے پر وہ

جامعہ کے لئے بمبئی اور رنگون وغیرہ کا دورہ کریں گے۔ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ جس طرح طبیبہ کالج کو ہندوستانی دواخانہ سے مستقل آمدنی کا ذریعہ ہو گیا ہے اسی طرح جامعہ ملیہ کے لئے کوئی سبیل نکال دیں مگر افسوس ہے کہ ان کی موت نے اس اسکیم اور آرزو کو پورا نہیں ہونے دیا۔

### طبی کا نفرنس رام پور :-

اوائل ۱۹۲۷ء میں حکیم صاحب نے طبی کا نفرنس رام پور میں عظیم الشان جلسہ کرایا نواب رام پور اس جلسہ کے صدر تھے۔ حکیم صاحب نے اس جلسہ میں بھی اطباء کو اصلاح و تجدید کی جانب متوجہ کیا اور نصاب پر نظر ثانی کے لئے دہلی لکھنؤ و لاہور میں تین کمیٹیاں بنائیں۔

### آخری ایام :-

دسمبر ۱۹۲۷ء کے پہلے ہفتہ میں وہ رام پور تشریف لے گئے مگر اس مرتبہ وہاں ان کو قلب کے ساتھ شدید دورے پڑے جس سے وہ مزید ناتواں ہو گئے۔ دہلی واپس آئے تو کمر میں چک آگئی۔ جس سے تین روز تک شدید تکلیف رہی درد کی۔ اس حال میں بھی ہمت کا یہ حال تھا کہ روزمرہ کے مشاغل انجام دیتے رہے بلکہ آل انڈیا مسلم لیگ کمیٹی کے جلسہ میں بھی شریک ہوئے۔

انہی دنوں امیر افتخار تان بمبئی تشریف لارہے تھے۔ جامعہ ملیہ اور خلافت کمیٹی کی طرف سے امیر صاحب کی خدمت میں ایڈریس پیش کرنے کا پروگرام پہلے ہی پاس ہو چکا تھا اور اس غرض سے حکیم صاحب کا بمبئی جانا ضروری تھا چنانچہ سفر کی تیاری شروع ہو چکی تھی مگر شدید درد کی وجہ سے دو روز کی تاخیر ہوئی تیسرے دن درد کے باوجود حکیم صاحب نے سفر کا ارادہ کیا۔ چند اجاب نے سفر نہ کرنے کا بھی مشورہ دیا لیکن حکیم صاحب بمبئی تشریف لے گئے۔

حکیم صاحب اس وقت بہت کمزور ہو چکے تھے۔ کئی روز سے انھوں نے غذا بھی نہیں کھائی تھی۔ مگر کے درد کی وجہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتے تھے اور

گاڑی میں بھی وہ دو آدمیوں کے سہارا دینے سے بیٹھ سکتے تھے۔

منی میں دو روز تک قیام پذیر رہے انھوں نے جامعہ ملیہ کی طرف سے امیر صاحب کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا اور مختلف تقریبات میں شریک ہوئے۔ پھر وہاں سے جامعہ ملیہ کے لئے ریاست ہالین پور میں تشریف لے گئے۔ اس مرتبہ انھیں دو مرتبہ درد کا دورہ ہوا مگر بدستور مشاغل میں مصروف رہے اور ۲۵ دسمبر کو دہلی لوٹ آئے۔

۲۵ دسمبر کی صبح کو حکیم صاحب بمبئی سے دہلی تشریف لائے۔ صبح ۹ بجے سے ۱۱ بجے تک ڈاک دیکھتے رہے جو اس دوران میں بڑی تعداد میں اکٹھی ہو چکی تھی پھر ان مریضوں کا معائنہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے جو دو دروازے آئے ہوئے تھے۔ شام کو بجے واپس آئے اور مطب میں بیٹھ گئے اور شب کو ۹ بجے تک آخری مطب فرمایا ساڑھے گیارہ بجے کی گاڑی سے رام پور تشریف لے گئے رام پور میں طبیعت خراب رہی۔ صرف ایک انڈے کی زردی غذا کرتے رہے۔ ۲۸ کی شام کو حسب معمول بلیڈ کھیلے رہے۔ گیارہ بجے تک نواب رام پور سے باتیں کرتے رہے پھر آکر سو رہے۔ بارہ بجے نواب صاحب نے یاد کیا۔ خدمت گزار نے بیدار کر کے عرض کیا کہ بھرکار یاد فرماتے ہیں۔ چونکہ طبیعت خراب تھی۔ اس لئے فرمایا کہ چوبدار سے کہہ دو کہ طبیعت اچھی نہیں ہے۔ چوبدار ابھی واپس نہیں پہنچا تھا کہ خود نواب صاحب تشریف لے آئے۔ حکیم صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک نواب صاحب بعض اہم معاملات کے متعلق مشورہ فرماتے رہے معاملاً بمقامتہ کہ اس عرصہ میں حکیم صاحب تکلیف محسوس کرتے رہے مگر غیر معمولی ضبط کی وجہ سے اسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

## وفات

پولہ دہلی کے نواب صاحب تشریف لے گئے۔ ان کے ساتھ چیف سکریٹری صاحب بھی تھے۔ حکیم صاحب نے ان کو کچھ ضروری باتوں کے لئے اپنے پاس ٹھہرا لیا کوئی پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ حکیم صاحب نے قلب پر ہاتھ رکھ کر زور سے دبا دیا اور گہرا سانس لیا۔ چیف سکریٹری صاحب نے گھبرا کر کہا کہ حکیم صاحب کیا تکلیف ہے۔ فرمانے لگے کہ قلب کے مقام پر تکلیف ہے۔ سکریٹری صاحب نے کہا آپ آرام فرمائیں میں صبح حاضر

ہو جاؤں گا۔ مگر حکیم صاحب نے ان کو پھر روک لیا۔ پانچ سات منٹ کے بعد پھر سخت دورہ ہوا اور حکیم صاحب کے منہ سے خفیف سی چیخ نکلی اور فرمایا کہ جلد ڈاکٹر عبدالحکیم خاں صاحب کو بلائیے۔ چیف سکریٹری صاحب نے خدمت گار کو ڈاکٹر صاحب کو بلانے کے لئے بھیجا اور دوسرے خدمت گار کی مدد سے حکیم صاحب کو مسہری پر لٹا دیا۔ کچھ وقفہ کے بعد پھر دورہ ہوا۔ فرمایا کہ گرم پانی لاؤ مگر ڈاکٹر اور گرم پانی کے آنے سے پہلے شب کو دو بجے تین بجکیاں لیں اور دہلی کا یہ بے تاج بادشاہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

ہزبائی نس نواب صاحب کو اطلاع ہوئی تو وہ تشریف لائے اور بے اختیار ہو کر فرمایا کہ حکیم صاحب نہیں مرے میں مر گیا۔

صبح کو نواب صاحب رام پور کے کئی تار دہلی پہنچے کہ حکیم صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ایک تھلکہ مچ گیا سارے شہر دہلی میں ۳ بجے میت موٹر کے ذریعہ دہلی پہنچی۔ ۴ بجے جنازہ آخری آرام گاہ کی جانب روانہ ہوا۔ جنازہ کے ہمراہ مسلمان ہندو سکھ پارسی اور عیسائی غرضکہ ہر فرقہ کے لوگ موجود تھے اور ہزار ہا مخلوق ساتھ تھی۔ چاندنی چوک سے شریف منزل تک اس قدر ہجوم تھا کہ گزرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی ہر آنکھ اشک بار تھی۔

دہلی کی جامع مسجد میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ بعض احباب کی رائے تھی کہ مصلح قوم سرسید کی طرح حکیم صاحب کی تدفین بھی ان کی محبوب اور عظیم طبقی درسگاہ طیبہ کالج قزول باغ میں عمل میں آئے لیکن متعلقین کی منشاء اور حسب دستور حکیم صاحب کے جسدِ خاکی کی تدفین حضرت خواجہ سید حسن رسولنا قدس سرہ جن کا مزار پہاڑ گنج سے آگے ہے اور جہاں حکیم صاحب کے والد۔ دونوں بھائی مدفون ہیں عمل میں آئی۔

جب حکیم صاحب کے انتقال کی خبر دہلی سے باہر دیگر مقامات پہنچی تو ہر جگہ شدید رنج و غم کا اظہار کیا گیا کلکتہ اور لاہور میں مسلم لیگ کے ایسے وقت میں اجلاس ہو رہے تھے ان اجلاس میں تعزیت کی قرارداد پاس ہو کر اجلاس ملتوی ہو گئے۔

تمام ہندوستان نے ایک عرصہ دراز تک اپنے محبوب لیڈر کا غم منایا۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا شہر ہوگا جہاں حکیم صاحب کے لئے تعزینی جلسہ یا قرارداد نہ پاس کی گئی ہو۔

تمام انگریزی، اردو، نیز ہندی کے اخبارات نے اس حادثہ پر مضامین سپرد قلم کئے۔ اس وقت دہلی میں موجود والسہ رائے لارڈارون اور سابقہ رائے لارڈارنگ حکومتِ افغانستان، حکومتِ مصر، سلطانِ مستقط اور متعدد والیانِ ریاست نے ہمدردی کے پیغامات ہندوستان نیز ہندوستان سے باہر یورپ، امریکہ، افریقہ اور ایران وغیرہ کے معروف لوگوں کے تعزیت نامے ملے اور جلسے بھی بعض مقام پر ہوئے۔

اسی موقع پر مدراس میں کانگریس کا جلسہ ختم ہی ہوا تھا۔ جیسے وہاں خبر پہنچی تو صدر کانگریس ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے کہا کہ۔

”اس قدر کامیابی کے بعد اس خبر نے میرے دل کو توڑ دیا ہے“

گاندھی جی نے اپنے مضمون میں لکھا۔

”حکیم اجمل خان کی موت نے مجھ سے صرف ایک دانشور اور

ثابت قدم شریکِ کار ہی کو نہیں چھین لیا بلکہ میں نے ایک ایسا دوست بھی

کھو دیا ہے کہ جس پر میں ضرورت کے وقت بھروسہ اور اعتماد کر سکتا تھا۔ ہندو

مسلم اتحاد کے معاملہ میں وہ میرے مشیر اور رہنما تھے۔ وہ انسانی فطرت کو

خوب پہچانتے تھے اور اسی صلاحیت نے انہیں صحیح قوتِ فیصلہ عطا کی تھی۔

وہ ایک خیالی قسم کے انسان نہ تھے بلکہ وہ اپنے خوابوں کو حقیقت میں تبدیل

کرنے کی پوری قوت رکھتے تھے“

سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا کہ۔

”جو لوگ حکیم اجمل خان سے اپنے مرض کا نسخہ لینا چاہتے ہیں جو اپنی

ملازمت کی سفارش کے خواہاں ہیں جنہیں اپنے عزیز کی شادی کے لئے

روپیہ درکار ہے۔ جن بیواؤں کی روٹی ان کی توجہ سے چلتی تھی۔ جن تیمیوں

اور ناداروں کی تعلیم کے لئے ان کے خزانہ سے رقم ملتی تھی ان کی تعداد

سیکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں تک پہنچتی ہے ان کا اجمل خاں رحمت

ہو گیا گریٹ قدیم کا مجدد اور طبی تعلیم کا رہنما آج بھی زندہ ہے اور

ہمیشہ زندہ رہے گا“

## پسماندگان :-

حکیم صاحب نے اپنے انتقال کے بعد دو دختران اور ایک صاحبزادے کے ساتھ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں عقیدت مندان چھوڑے تھے۔

## تصانیف :-

حکیم محمد اجمل خاں کی مصروف سیاسی و سماجی زندگی نے ان کو تصنیف و تالیف کا موقع کم دیا تاہم فن طب میں جو کچھ بھی لکھا وہ اہم ہے۔  
قیام رام پور کے زمانے میں حکیم صاحب نے متعدد کتابیں لکھیں چونکہ تصنیف و تالیف کا شوق ابتدا سے ہی تھا لہذا زمانہ تعلیم ہی میں ایک رسالہ عربی میں القول المرغوب فی الماء المشروب تحریر کیا جسے بعد میں کسی قدر ترمیم و تنسیخ کے ساتھ مجلہ طبیبیہ میں شائع کرا دیا تھا اور اس رسالہ میں پانی کے جزو بدن نہ ہونے پر بحث کی گئی ہے۔  
۹۶ - ۱۸۹۵ء میں جب ہندوستان میں طاغون کی وبا پھیلی تو اردو میں ایک محققانہ رسالہ لکھا جس میں طاغون کے تاریخی حالات اسباب اور علامات درج کیے تھے اور آخر میں علاج کے طریقے نہایت تفصیل سے تحریر کئے تھے۔ یہ رسالہ کئی بار چھپا۔ اس کے علاوہ الشحفة الحمادیہ فی الضاعۃ الکلیۃ الفاظ العان فی انعالیط غایۃ الاستحسان اوراق منظرہ اور البیان الحسن بشرح المعجون المسے، اکیرالدین شائع کیں۔ ان میں سے النخذ لحمادیہ میں کثرت جات کے استعمال کا جواز اور ان کے فوائد پر بحث کرتے ہوئے ان لوگوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے جو کثرت جات کے استعمال پر معترض ہیں۔ ایفاظ النمسان میں حکیم عبدالعزیز صاحب لکھنوی کے ان اعتراضات کے جوابات ہیں جو انھوں نے حاذق الملک حکیم عبدالعزیز خان صاحب کے فتوئے عدم حین جوہر دماغ پر کئے تھے۔ البیان الحسن میں علاج الامراض کی معجون لنا کے معنی کو نہایت خوبی کے ساتھ حل کیا ہے۔ اوراق منظرہ میں بعض طبی استفسارات کے جوابات فصاحت کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ البیان الحسن کا ایک حصہ فارسی میں ہے۔ جس سے حکیم صاحب کی فارسی دانی پر روشنی پڑتی ہے۔



رسالہ فی ترکیب الادویہ واستخراج اللغات الطبیہ۔ اس میں مرکبات کی تیاری اور مفردات کی پہچان کی تفصیل موجود ہے۔ شرح اسباب کا حاشیہ بھی لکھا تھا۔ اگرچہ حکیم صاحب کی تمام تالیفات ان کے زمانہ شباب کی ہیں تاہم ان میں حسن استنباط۔ اجتہاد فکر اور اعتدال رائے کے وہ تمام اجزا پائے جاتے ہیں جو ایک بہترین تصنیف کے ضروری ارکان ہیں۔

### حاذق :-

حکیم صاحب کی یہ طبعی تصنیف دراصل طب یونانی کا خلاصہ اور خاندان شرفی کا مکمل دستورالعلاج ہے اس کتاب میں حکیم محمود خاں، حکیم عبدالمجید خان اور خود طبیب اعظم حکیم اجمل خاں کے خاص الخاص نسخے اور طریقہ ہائے علاج درج کر دیئے گئے ہیں حکیم صاحب کا نقطہ نظر طب میں بہت وسیع تھا وہ شفا بخش نسخوں کو سینہ بہ سینہ پوشیدہ رکھنے کی مشرقی روایات کے خلاف تھے۔

حاذق بلاشبہ طبی تجربات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔

### شعرو شاعری :-

حکیم اجمل خان کو شعرو شاعری سے طبعی مناسبت تھی۔ شیدا تخلص فرماتے تھے چونکہ قدرت نے شاعری کی خداداد صلاحیت بخشی تھی اس لئے کسی استاد کی ضرورت نہ پڑی۔ حکیم صاحب کی کوٹھی پر ادیبوں اور شاعروں کا ہجوم رہتا تھا۔ سائل دلبوی اور زباباں دلبوی دونوں بھائی شہانہ مخفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ کبھی کبھی رات تک شعر و سخن کی بزم آرائی رہتی۔ حکیم صاحب نے زندگی کے مختلف ادوار میں اور خاص طور پر پیامِ رام پور کے زمانے میں کبھی کبھی اشعار کہے ہیں۔ کبھی کبھی سفر میں بھی شعر کہتے تھے۔ جب سیاسی اور قومی سرگرمیاں زیادہ پڑھ گئیں۔ تو شعر گوئی کا سلسلہ گویا بالکل ترک ہو گیا۔ تاہم جو کچھ تھا وہ بھی محفوظ نہ رہا۔ اور کلام کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔

ان کے کلام کا کچھ حصہ دیوان شیدا کے نام سے ۱۹۲۶ء میں پہلی بار ٹائپ میں

جرمنی سے شائع ہوا تھا دوبارہ یہ مارچ ۱۹۶۶ء میں ہندوستانی دواخانہ کی جانب سے چھپا تھا۔ جرمنی والے نسخہ کی طباعت ڈاکٹر ذاکر حسین کی کوشش کا نتیجہ تھی۔ اس شعری مجموعہ کا مقدمہ مشہور — ادیب اور حکیم صاحب کے سکریٹری قاضی عبدالغفار نے یکم نومبر ۱۹۲۵ء کو تحریر کیا ہے۔

غزل کا نمایاں پہلو عشقیہ اشعار ہوتے ہیں۔ شاعر کا دل جب تک سوز عشق اور اندرونی شوق و التہاب کا شکار نہ ہو۔ وہ ایک معیاری شاعری نہیں کر سکتا ہے۔ کہتے ہیں۔

چرچا ہمارا عشق نے کیوں جا بجا کیا      دل اس کو دے دیا تو بھلا کیا بڑا کیا  
وہ خواب ناز میں تھے مرادیدہ نیاز      دیکھا کیا اور ان کی بلائیں لیا کیا

گم کردہ راہ آتے ہیں وہ آج میرے گھر  
آہ میری آہ نیم شبی تو نے کیا کیا

اگر عرض تمنا کا کسی دن امتحان ہوگا      جبیں ہوگی کسی کی اور کسی کا آستان ہوگا  
آخر بوں تک آہی گئی آرزوئے دل      کھو بیٹھے آج ہاتھ سے ہم آبروئے دل

یہ دیوان چھوٹی تقطیع کے سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں فارسی کی ۲۳ اشعار

اور اردو کی ۲۶ اشعار غزلیں ہیں۔

دیوان شہیدا کا انتساب خواجہ عبدالمجید شیخ الجامعہ اور اساتذہ جامعہ دہلی کے نام ہے۔ دیوان میں دو باب ہیں۔

معرب کے :-

حکیم صاحب کے لاتعداد ایسے واقعات ہیں جو تاریخی ہیں اور ان کے علاج و معالجہ کی ویسے کئی کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔ چند واقعات درج ذیل ہیں۔

دہلی کے قریب ایک رئیس کی بیوی نے حکیم صاحب کو نبض دکھائی اور حکیم صاحب سے اپنی کیفیت بیان کی۔ مریضہ حاملہ تھی۔ لیکن حکیم صاحب نے فرمایا کہ یہ حمل نہیں بلکہ تم میں رسولی پیدا ہوگئی ہے۔ لیڈی ڈاکٹروں کو دکھایا گیا سب نے حمل قرار دیا۔ بالآخر گیارہ ماہ کی مدت گزر جانے پر آپریشن کرایا گیا۔ آپریشن میں رسولی برآمد ہوئی۔

نواح بلگرام ضلع بہاروئی کی رہنے والی ایک مریضہ بغرض علاج دہلی وارد ہوئیں ان کو سنگ مدارہ یعنی پتہ میں پتھری کی شکایت تھی۔ تمام بدن پر بھوڑے پیدا ہو گئے تھے اور بدن کا رنگ سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں تیرگی اور پیشاب سیاہ ہوتا تھا۔ لکھنؤ میڈیکل کالج میں اور دوسرے ڈاکٹروں و طبیبوں کا مدت تک علاج کرایا گیا۔ لیکن مطلق فائدہ نہیں ہوا۔ ڈاکٹروں نے بالاتفاق آپریشن کی رائے دی اور کہا کہ اس کے علاوہ اور کوئی صورت علاج کی نہیں ہے۔ چونکہ مریضہ کمزور تھی اس لئے آپریشن بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ مریضہ سب طرف سے مایوس ہو کر دہلی آگئیں۔ اور یہاں دو ماہ تک حکیم اجمل خاں کے زیر علاج رہیں اور بالکل تندرست ہو کر واپس گئیں۔ واپسی پر لکھنؤ میں سول سرجن صاحب کو پھر دکھایا تو ان کو کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ ایسا مرض بغیر آپریشن کے دور ہو گیا۔

اسی طرح حکیم صاحب کے پیرس اور لندن کے کئی واقعات ہیں جو انتہائی تعجب خیز

ہیں۔

حکیم صاحب غرباء کا خاص طور پر علاج زیادہ دلچسپی سے کرتے تھے۔ ایک بہت ہی غریب مریض آپ کے پاس آیا جس کو کئی دنوں سے خون کا پیشاب آ رہا تھا اور وہ بہت پریشان تھا۔ حکیم صاحب نے اس کو کچھ پیسے دیئے اور کہا کہ بازار سے ملتانی مٹی لے کر آؤ۔ ایک تولہ روزانہ صبح و شام بھگو کر دھچکان کر پی لیا کرو۔ اپنی معمولی دوا کے استعمال سے مریض چند ہی دنوں میں مرض سے نجات پا گیا۔

# لقمان الملک شاہی طیب حکیم نابینا حکیم عبدالوہاب انصاری عرف نابینا حکیم

۱۲۸۷ — ۱۳۶۰ھ ۱۸۶۸ — ۱۹۴۱ء

تاریخ میں ایسی بے شمار ہستیاں پیدا ہوتی ہیں جو اپنے علم و فن۔ کمال و مہر کی بدولت ہمیشہ ہمیش کے لئے زندہ جاوید ہو گئی ہیں۔ ایسی ہی ہستیوں میں ایک مایہ ناز طیب کی ہستی حکیم عبدالوہاب انصاری عرف نابینا حکیم کی بھی ہے۔

نظام قدرت ہے کہ انسان و جانوروں کے اندر قوت مدافعت موجود ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ اپنی دیکھ بیکھ حفاظت۔ نشوونما کرتا ہے اور یہ تمام افعال اس میں موجود قوتوں کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی ایک قوت کمزور ہو جاتی ہے یا ختم و فنا ہو جاتی ہے تو دوسری قوتیں زیادہ طاقتور ہو جاتی ہیں۔ مثلاً قوت باصرہ اگر کمزور یا ختم ہو گئی ہے تو دیگر قوتیں جیسے قوت لامسہ۔ قوت ذائقہ۔ قوت شامہ۔ قوت سامعہ۔ قوت باصرہ۔ قوت مدركہ۔ قوت محرکہ۔ قوت منعیہ۔ قوت غازیہ۔ قوت نامیہ یہاں تک کہ قوت حیات بڑھ جاتی ہے۔

حکیم عبدالوہاب انصاری عرف نابینا حکیم ہمارے ملک کے حد درجہ ماہر۔ صاحب علم۔ بہت بڑے تباہ اور نہایت حاذق و مشہور حکیم ہوئے ہیں۔ سابق ریاست نظام آباد کے طیب خاص یا معالج خصوصی کی حیثیت سے اور فن طب میں اپنی خلافت بلاغت و قوال طیب ہونے کی بنا پر ان کو سارے ہندوستان میں شہرت اور عزت حاصل تھی۔

حکیم عبدالوہاب انصاری عرف نابینا حکیم تحریک آزادی کے اہم ستون و سپاہی  
 باکمال سرجن ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ ایم۔ ڈی۔ ایم۔ ایس (لندن) کے برادر تھے۔  
 حکیم نابینا کے برادر خورڈاکٹر مختار احمد انصاری ہندوستان کی وہ ماہی ناز  
 ہستی سے جو ماہر سرجن ہونے کے باوجود طبی طریقہ علاج کو بڑی قدر و عزت کی  
 نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ اور جب کوئی ایسا مریض ان کے دروازے میں آجاتا جس کے  
 بارے میں وہ یہ سمجھتے کہ یہ مریض یونانی طبی طریقہ علاج سے ٹھیک ہو سکتا ہے تو بلاوجہ  
 اس کو کبھی بھی آپریشن کی میز پر نہ لٹاتے تھے۔ اور ایسے مریضوں کو وہ اپنے بڑے  
 بھائی حکیم عبدالوہاب انصاری عرف نابینا حکیم یا انگلستان کے ملاقاتی جنگ آزادی  
 کے سپاہی اور ماہر طبیب حاذق مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی خدمت میں بھیج دیا  
 کرتے تھے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کہا کرتے تھے کہ سرجن کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ ہم  
 انتہائی مجبوری کی حالت میں اپنا شتر استعمال کرے اور جب اچھے اچھے یا فزیشنین  
 بے بس ہو کر جواب دے دیں تو پھر سرجن کو دیانتداری کے ساتھ اپنا کام کرنا چاہیے  
 یعنی ایک باکمال معالج یا فزیشنین کا قدم جہاں جا کر رک جاتا ہے۔ وہاں سے پھر ایک  
 ماہر سرجن اپنا قدم اٹھاتا ہے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری بڑے وسیع النظر اور عالی ظرف  
 انسان تھے۔ وہ اپنے پیشہ کی بڑائی اس بات میں سمجھتے تھے کہ دوسرے علوم و فنون کا  
 بھی پاس و لحاظ رکھا جائے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی وسعت قلبی اور بالغ نظری کا اندازہ اس حقیقت  
 سے لگایا جاسکتا ہے کہ۔

ہندوستان کے عروس البلاد شہر بمبئی میں آل انڈیا میڈیکل ایسوسی ایشن  
 کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۲۲ء میں انھوں نے ایک تجویز منظور کرائی جس میں  
 یہ مطالب کیا گیا تھا کہ وہ طب یونانی اور فن آیور وید پر بھرپور توجہ دیکر ان طبوں  
 کی حوصلہ افزائی کرے۔ کیونکہ یہ طریقہ علاج اس ملک کے اہم طریقہ علاج ہیں اور  
 ہندوستان میں دسی طریقہ علاج کے لئے میدان کافی ساڑھا رہے کیونکہ دسی  
 طریقہ علاج میں دسی دوائیں استعمال کی جاتی ہیں۔ جو اندرون ملک پیدا ہوتی ہیں

اور ملک کی ہی بنی ہوتی ہیں۔ اور ہمارے ملک کے باشندوں کے مزاج کے موافق ہوتی ہیں۔ مزید برآں یہ سب سے بڑھ کر ان دیسی دواؤں کے مخالف اثرات بالکل نہیں ہوتے ہیں۔

## خاندان :-

حکیم عبدالوہاب انصاری حکیم نابینا کے نام سے مشہور تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ کا خاندان علم و عزت اور دولت کے اعتبار سے ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ سلاطین مغلیہ کے عہد میں اس خاندان کے افراد اپنے اعلیٰ کارناموں کی وجہ سے خاص امتیازات سے سرفراز ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ آپ کے جد امجد شیخ شہاب الدین احمد انصاری لعہد شاہ عالم غازی منصب ہفت ہزاری و جاگیر سے سرفراز ہوئے تھے اور یہ جاگیر آج تک ان کے خاندان کی وراثت میں چلی آرہی ہے۔

آپ کے والد ماجد الحاج حکیم عبدالرحمن انصاری جو بہت مشہور طبیب اور صاحب کمال عالم گذرے ہیں ساتھ میں ستیاح ممالک اسلامیہ اور طبیب حاذق ہونے کے علاوہ شیخ طریقت بھی تھے۔ جو بعد انتقال حیدرآباد ہی میں درگاہ حضرت نور الدین شاہ صاحب قدس سرہ میں مدفون ہیں۔

## پیدائش :-

حکیم نابینا بمقام یوسف پور ضلع غازی پور میں اسی ممتاز، منفرد و اعلیٰ گھرانے میں تولد ہوئے تھے۔ آپ کی دونوں چشم بعارضہ چیپک اوائل عمری میں تھیں اب ہو گئی تھیں جس کے بعد خدا نے بصارت لے کر بصیرت عطا کر دی تھی۔

## تعلیم و تربیت :-

ابتدائی تعلیم گھر کے ادبی و تعلیمی ماحول میں شروع ہوئی۔ ان کے والد نے بچہ کی ذہنی صلاحیت، قوت ادراک، تحصیل علم کی جستجو میں انہماک کو دیکھ کر محلہ کے اچھے

اچھے علماء و فضلاء سے تعلیم دلوائی۔ طالب علم کو نئے افق کی تلاش میں سرگرداں دیکھ کر والد قبلہ حکیم عبدالرحمن نے ایسے لائق و فائق بچے کو اعلیٰ تعلیم سے مزین کرنے کا فیصلہ کیا اور ایسی حالت میں دارالعلوم دیوبند میں آپ نے عربی میں مولوی ذوالفقار علی دیوبندی اور فارسی کی تعلیم مولوی فیض الحسن سہارنپوری سے حاصل کر کے عربی فارسی و حدیث کی تعلیم سے بہرہ یاب ہونے کے بعد اپنے مقصد حیاتِ علمِ طب اپنے والد سے حاصل کرنے میں رجوع ہوئے۔

اس کو حکیم نابینا نے خود بھی بیان کیا ہے۔ اپنی گراں قدر تصنیف اسرارِ شریانیہ مع اجزاتِ انصاریہ میں لکھتے ہیں۔

اضعف العباد بعون اللہ تحریر لسانِ عرب میں ماہر اور تجربہ کار ہے۔ علومِ درسیہ ادبِ ہیرا بھی بڑے بڑے کلماء اور ادباء مثل مولوی ذوالفقار علی صاحب دیوبندی و مولوی فیض الحسن صاحب سہارنپوری سے فیضیاب ہے لیکن مادری زبان اہل ہند کی چونکہ اُردو ہو گئی ہے لہذا مضامین اقرب الی الفہم ہونے کے لئے اُردو میں تحریر کیا۔ جیسا کہ ہادی مطلق نے اشارہ و اندھ لفظی ذوالاولین میں فرمایا ہے۔ علومِ مضامین ہیں نہ لسان۔

والد قبلہ سے تعلیمِ طب حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کے مشہور خانوادہ طب و علمِ خاندان شریفی کے مسلم الثبوت و ماہر تعلیمِ طب حکیم محمود خاں و حکیم عبدالجبار خان سے تعلیمِ طب کی تکمیل کی اور آخر الذکر سے سند حاصل کی۔

## خدمات :-

تعلیم سے فراغت کر کے اپنے والد ماجد کے آبائی دواخانے میں مطب کرنا شروع کیا۔ وہ تھوڑے ہی عرصے میں چہار جانب شہرہ ہو گیا۔ والی ریاست حیدرآباد ہزاری نس میر محبوب علی خان د نظام دکن نے، ان کی حذاقت و حکمت کا چرچا سنکر اس جو اہر پارہ کو اپنی ریاست میں مطب کرنے اور خدمتِ خلق کے ذریعہ عوام الناس کو فائدہ پہنچانے کے لئے دعوت نامہ اور سرکاری وظیفہ کی پیشکش کی۔ یہاں حکیم صاحب المعروف بہ حکیم نابینا۔ کافی عرصے تک شاہی طبیب کے

عہدہ پر مقیم رہے پہلے حیدر آباد جا کر حضرت غفران مکان کے عہد میں چالیس سال تک بمقام پتھر گلی مطب کرنا شروع کیا تھا جہاں آپ کو بہت مقبولیت ملی اور جب عالیجاہ حضرت نظام حیدر آباد کے طبیب خاص مقرر ہو گئے تو بحیثیت شاہی معالج ڈیوڑھی مبارک میں عوام کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے طبی خدمات انجام دیں۔ میر محبوب علی خان والی ریاست حیدر آباد کے وہاں کوئی بچہ نہ ہوتا تھا۔ اور نواب حیدر آباد جانشین تخت کے لئے بہت پریشان اور متفکر رہتے تھے۔ نواب صاحب کے وہاں ان کے علاج و معالجہ سے دو صاحبزادے پیدا ہوئے نواب حیدر آباد کی حکیم عبدالوہاب انصاری المعروف بہ حکیم نابینا پر بہت نوازشیں تھیں۔ یہاں تک کہ ریاست کے نظم و نسق میں بھی نواب صاحب حکیم صاحب سے صلاح و مشورہ لیتے رہتے تھے۔

میر محبوب علی خاں کے جانشین میر عثمان علی خاں سے نظریاتی و ذہنی اختلاف ہو جانے کے باعث حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا حیدر آباد چھوڑ کر ہندوستان آ گئے۔ سب سے پہلے پونا میں پھر عروس البلاد شہر بمبئی میں اور آخر میں دہلی میں مطب کرنا شروع کیا۔

قیام دہلی میں ۱۹۲۵ء میں جامع مسجد کے سامنے جہاں پیاب ہوٹل تاج ہے ایک پوری بلڈنگ خرید کر دو خانہ مطب و قیام گاہ کی تعمیر کرائی۔ حکیم صاحب ماہر نباض ہونے کے ساتھ ساتھ مدفون پوشیدہ خزانوں کے بتانے میں ملکہ رکھتے تھے جس کی بنا پر ارباب علم و ہنر کا اندازہ تھا کہ حکیم عبدالوہاب علم ریل و جفر کے ساتھ ساتھ علم نجوم کے ماہر تھے جب کہ عوام یہ تاثر رکھتے تھے کہ حکیم صاحب کا اتنے ماہر نباض ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حکیم صاحب کے قبضہ میں کوئی جن ہے اور حکیم نابینا عامل ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان کی نباضی کا بھرم قائم ہے حکیم صاحب نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ جامع مسجد کے سامنے والے مکان میں ایک خزانہ پوشیدہ ہے دوسرے دن حکیم نابینا صاحب نے وہ نیا تعمیر شدہ مکان کھدوانا شروع کر دیا تھا۔

ان کی نباضی کا شہرہ سن کر دو دراز سے علاج کے لئے مرزا ان کی خدمت



میں حاضر ہوتے تھے۔ خدا نے ان کے ہاتھ میں صرف شفا ہی عطا نہ کی تھی بلکہ فن نباضی کا وہ جوہر عطا کیا تھا کہ وہ مریضوں سے کچھ پوچھے بغیر محض نبض سے ان کے امراض کی تشخیص کر لیتے تھے اور وہ تشخیص ایسی صحیح ہوتی تھی کہ مریض اپنا مرض اور واقعات سن کر حیران رہ جاتے تھے۔

اردو ادب کے درخشاں ستارے خواجہ حسن نظامی اقل نے ۱۲ ستمبر ۱۹۲۲ء کے روزنامے میں حکیم عبدالوہاب انصاری حکیم نابینا کا ایک واقعہ نبض تحریر کیا جس سے حکیم صاحب کی نباضی کا معترف اور حکماء کے فن کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

”حکیم نابینا صاحب مہاراج سرکشن پرشاد کے بچوں کی نبض دیکھنے کو کھٹی پر تشریف لے گئے۔ میں (خواجہ حسن نظامی) حیران ہو گیا کہ رانیوں اور بیگمات اور بچوں کی نبض دیکھنے کے بعد حکیم صاحب نے کسی کا حال نہیں پوچھا، خود ہی سہ بیمار کی مفصل کیفیت نبض پر ہاتھ رکھ کر بتادی اور بہ بیمار نے تصدیق کی کہ بیشک یہی حال ہے۔ اس وقت مہاراجہ نے ایک قصہ بیان کیا کہ ایک دفعہ حیدرآباد میں ان حکیم صاحب کو میں نے اپنے گھر پر بلایا۔ رانی صاحبہ کی نبض دکھانی تھی مگر بجائے رانی صاحبہ کے میں نے نبض دکھا دی۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھتے ہی مسکرا کر فرمایا: ”یہ نبض تو مہاراج کی ہے“ میں نے (خواجہ حسن نظامی) اپنی زندگی میں ایسا کمال کسی طبیب میں نہیں دیکھا۔

### خصوصیاتِ دواخانہ :-

اطباء اور حکماء عام طور پر مریض کو مرض کے ازالہ کے لئے بالعموم پینے کے لئے قہجے دیا کرتے ہیں۔ لیکن حکیم نابینا نے طبی طریقہ علاج میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ ان کی دوائیاں مقدار میں بید قلیل ہوتی تھیں۔ مگر قہجوں سے زیادہ مؤثر۔ مشہور تاریخ داں اور مترجم ضیاء الدین برکی فرماتے ہیں کہ ”ان کے صاحبزادوں کے ساتھ میرے دوستانہ روابط تھے وہ (حکیم صاحب) مجھے بھی اپنے بچوں جیسا سمجھتے تھے۔ مجھے متعدد دفعہ ان سے علاج کرانے کے مواقع ملے اور ہر دفعہ میں ان کی غیر معمولی خداقت کا اثر لے کر آیا۔ انہوں نے مجھ سے کبھی دوا کی قیمت

نہیں لی اور ہمیشہ قیمتی سے قیمتی دوائیں اپنے پاس سے عنایت فرمائیں۔ ان کی تیار کردہ ادویہ کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ صحیح اجزاء پر مشتمل ہوتی تھیں۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ موتیوں کے بجائے ان میں سیپ ڈال دیئے گئے ہوں یا ان کے اوزان میں کمی کر دی گئی ہو۔

خواجہ حسن نظامی نے انھیں ”لقمان الملک“ کا خطاب دے رکھا تھا۔ ان کے مطب میں گل چالیش یا پچاش دوائیں ہوتی تھیں اور وہ سب ان کے صندوقچہ میں بند رہتی تھیں۔ مرضاء کو یقین تھا کہ اگر حکیم صاحب نے اپنے صندوقچہ سے دوا دے دی تو شفاء یقینی ہے۔ عام طور پر اس صندوقچہ میں کشتہ جات رہتے تھے۔

اکثر ایسا ہوا کہ عطاروں سے کشتہ بنانے اور بنا کر دکھانے کو بتایا۔ حسبِ ہدایت عطار کشتہ بنا کر لایا حکیم صاحب نے ہاتھ لگایا اور ہدایت کی کہ کشتہ میں یہ کمی ہے۔ کبھی کبھی ان عطاروں نے بغرض امتحان پھر وہی کشتہ سابقہ حالات میں لا کر دے دیا اور کہا کہ تیار ہو گیا ہے۔ حکیم صاحب نے دیکھتے ہی کہا کہ ابھی سابقہ حالت پر ہے۔ حکیم عبدالوہاب انصاری نابینا ہونے کے ماوجود فن کشتہ سازی میں ماہر تھے اور اسی علم کی بدولت کیمیا بنانے کا شوق تھا۔ بقول شوکت علی فہمی مدیر دین دنیا دہلی اس شوق کی جلا کے لئے حکیم عبدالوہاب انصاری عرف نابینا حکیم نے سونا بنانے کے لئے جرمنی سے کوئی کیمیکل بھی منگایا تھا۔

حکیم عبدالوہاب انصاری المعروف بہ حکیم نابینا نے ایک عمارت طبیبہ بلڈنگ کے نام سے ایک لاکھ روپے کے مصارف سے مدینہ فنڈ کے لئے تعمیر و وقف فرمائی جس کی رسم افتتاح ۲۸ فروری ۱۹۳۲ء کو حضرت اقدس و اعلیٰ علیہ السلام و سلطنت نے اپنے دست مبارک سے ادا فرمائے اور حکیم نابینا کے فرزند اکبر حکیم عبدالحی انصاری ناشر اسرار شریانیہ مع مجربات انصاریہ نے سپاس نامہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔

طریقہ علاج :-

آپ اپنے مریض کو پہلے ایک ہفتہ کی دوا بلا قیمت دیتے تھے پھر فائدہ ہونے پر

سابقہ اور موجودہ ہفتہ کی دوا کی قیمت لے لیتے تھے۔

حکیم عبدالوہاب انصاری کے عطارِ خصوصی بنام غالب تھے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری حکیم صاحب موصوف کے برادرِ خورد جب انگلستان سے واپس آئے تو ان کے عطار غالب صاحب کے لئے ایک جوڑا بھی لائے تھے۔ غالب صاحب وہ نیا جوڑا پہن کر حکیم نابینا صاحب کے ساتھ کسی دیگر ریاست میں مریض دیکھنے گئے۔ راستہ میں جوتے نے کاٹ لیا۔ متعدد علاج ہندی یونانی و انگریزی کرنے پر بھی فائدہ نہ ہونے کی صورت میں کلکتہ بغرض علاج لے جائے گئے۔ وہاں بھی افاقہ نہ ہونے کی صورت میں غالب صاحب کی ٹانگ کاٹی گئی اور وہیں اسی عارضہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

حکیم صاحب موصوف صبح  $8\frac{1}{4}$  بجے سے  $12\frac{1}{4}$  بجے تک مطب کرتے تھے اور اس کے بعد کسی بھی مریض کو کسی بھی صورت سے نہ دیکھتے تھے۔

فیس :-

عام طور پر مریض سے اس کی حیثیت کے مطابق دس روپے، سو روپے اور ہزار روپے فیس تھی۔

انتقال سے کچھ عرصہ قبل آپ نے کنٹ پبلش میں ایک وسیع و عریض بلڈنگ تعمیر کرائی تھی جہاں آپ کا آخری وقت گذرا۔

آپ نے مسلمان نرسوں کی تعلیم کے لئے گراں قدر پچیس ہزار روپے کا عطیہ بھی دیا تھا۔

مذہبی رجحانات :-

حکیم نابینا صاحب مذہبی معاملے میں پکتے تھے۔ بقول ضیاء الدین احمد برنی ”وہ بہت مذہبی آدمی تھے ان کا خالی وقت درود و وظائف میں صرف ہوتا تھا“ ۱۳۵۷ھ میں بغرض حج بیت اللہ شریف تشریف لے گئے تھے اور وہاں سے وظائف پڑھنے کے لئے ایک ہزار روپے بھی لائے تھے انھوں نے کنٹ پبلش

نئی دہلی میں جو جائیداد بنوائی تھی اس کی آمدنی کا ایک حصہ (مذینہ بازار کا) مذینہ کے مساکین کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی ہندو اور سکھا گردی میں اس مکان کو بھی لوٹ لیا گیا۔ حالانکہ وہاں تحریک آزادی کے امام اور کانگریسی رہنما ڈاکٹر انصاری کے بھتیجے حکیم عبدالحی رہتے اور مطب کرتے تھے۔

غرض کہ حکیم صاحب حد درجہ متقی اور دیندار و پرہیزگار شخص تھے۔ اور آپ حاجی، حافظ، محدث ہونے کے علاوہ طبی دنیا میں خاص شہرت کے حامل ہیں۔

## تصانیف :-

آپ نے موضوع "نبض" جس پر آپ کو خدا نے خدا داد صلاحیت و دیعت فرمائی تھی، پر اسرار شریانیہ مع مجربات انصاریہ کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ جو آپ کے غیر معمولی حافظہ اور مجربات دو خانہ و مطب نیز رموز نبض اور نباضی پر مشتمل ہے۔

آپ ماہر نباض کے طور پر طبی دنیا میں خاص شہرت کے مالک ہیں۔ اور آپ حکیم نابینا کی نبض شناسی کا شہرہ تمام ہندوستان میں ہے۔

## وفات :-

آپ کا انتقال پرملاں بمقام دہلی، ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ مطابق نومبر ۱۹۴۱ء کو ہوا۔ اور ہزاروں اشخاص کی دعاؤں کے ساتھ انھیں سپرد خاک کیا گیا۔ ۷  
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے  
مرحوم حکیم صاحب بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے ان میں خدمت الناس کی غیر معمولی لگن تھی۔ زبان پر ہمیشہ اللہ اور رسول کا ذکر رہتا تھا۔

## پسماندگان :-

الحاج حکیم عبدالرحمان صاحب انصاری کے ۳ فرزند اکبر تھے۔  
(۱) حکیم عبدالوہاب انصاری جن کا تذکرہ درج بالا ہے۔

(۲) ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ یہ حکیم صاحب معفور کے برادر خورد۔ ہندوستان کے مشہور و معروف ڈاکٹر اور کانگریس پارٹی کے روح رواں تھے۔ حکیم اجمل خاں کے تمام سیاسی سماجی اور طبقاتی کاموں میں شریک کار تھے۔ چنانچہ طبیہ کالج دہلی کی داغ بیل ڈالنے میں آپ کا سب سے بڑا حصہ تھا۔

(۳) عبدالرزاق انصاری یہ نواب رضا جنگ مرحوم کے سررشتہ مال میں ترقی کرتے ہوئے اورنگ آباد کی صوبہ داری پر فائز ہوئے تھے۔

حکیم عبدالوہاب انصاری نے بین صاحبزادے اپنے بعد اپنی یادگار چھوڑے تھے۔ حکیم محمد عبدالکئی انصاری جو حکیم صاحب کے ساتھ اور بعد میں حکیم کی مسند پر بیٹھے۔ حکیم عبدالقادر جو تقسیم سے پہلے لاہور چلے گئے تھے۔

حکیم مولوی عبدالغنی المعروف نسوہ شاہ نظامی جو حیدرآباد میں دو انخانہ و مطب کرنے لگے تھے۔

حکیم عبدالوہاب انصاری کے انتقال پر نہ صرف طبی دنیا میں بلکہ ہندوستان بھر میں افسوس کیا گیا۔

ادب اور شعراء نے نذرانہ عقیدت پیش کیے اور قطعاً تاریخ وفات و مادہ تاریخ رحلت تحریر اور شائع کیا۔

پیشگاہ حضرت نزل سبحانی سے اخبار صبح دکن مورخہ ۸ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ کو حسب ذیل مادہ تاریخ شائع کیا۔

انتقال حکیم عبدالوہاب انصاری دہلی۔

ما حکیم موصوف را خوب می دانستیم کہ او فی الحقیقت در فن طب بیدار  
طلوئی داشت و ہم محدث و زاہد و متقی بود خصوص در فن نباضی مشہور بود  
بہر حال بہ زبان ماست۔

مادہ تاریخ رحلت

بہ دار طب علی دبی سینا بیدار  
مریضان این نعمت گفتند عثمان  
ہماں جائیکہ نابینا بیدار  
چہ ماتم بینا اے دار بیدار

(درمیان ما) ۱۹۴۱ء

## رائے استادِ جلیل :-

یہ لاجواب مادہ تاریخ نکلا ہے حکیم صاحب کے خاندان کو اس پر ناز کرنا چاہیے۔  
از صبح دکن مورخہ حکیم تیز ۱۲۵ ف

## طبی معرکے :-

حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا نے حیدرآباد پونا، بمبئی اور دہلی میں ایسے ایسے معرکے کے علاج کئے ہیں کہ اگر وہ سب معرض تحریر میں آجائیں تو اچھی خاصی کتاب بن جاتے۔ ان کی بدولت ہر جگہ یونانی طب کا نام بہت روشن ہوا حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی وفات سے ہندوستان میں طب یونانی کا آفتاب غروب ہو گیا۔

اردو شاعری کی آبرو علامہ اقبالؒ کو بھی ایک بار مصاۃ الکلیہ (گردے کی پتھری) کا عارضہ ہو گیا۔ ہندوستان کی نامی گرامی شخصیتیں حکیم صاحب کے علاج سے مستفید ہو چکی تھیں اور حکیم صاحب موصوف کے صندوقے کے علاج کا بڑا شہرہ تھا۔

ڈاکٹروں کی رائے میں آپریشن کے سوا دوسرا کوئی طریق کار نہ تھا۔ اور آپریشن کے لئے بھی یہ طے پایا کہ ویانا (آسٹریا) میں ہو تو بہتر ہے۔ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے چند احباب کے مشوروں سے یہ طے پایا کہ حکیم صاحب کا علاج شروع کیا جائے۔

علامہ اقبالؒ حکیم صاحب کے مطب میں حاضر ہوئے اور اپنی نبض دکھائی حکیم نابینا کی دور بین نظروں نے سمجھ لیا کہ کثرت سے مے نوشی اور گوشت خوری کے سبب سے گردہ میں (URIC ACID) کے جماؤ سے پتھر ہو گئے ہیں دوسرے روز حکیم صاحب نے قارورہ کا بغور معائنہ فرمایا اور علاج شروع کیا گیا۔ حکیم صاحب نے پتھری نکالنے والی دوائیں استعمال کرائیں اور اپنے صندوقے خاص سے کشتہ حجر الیہود عقربی (بچھو والا) دینا شروع کیا۔ خدا کے فضل سے علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی ساری پتھریاں نکل گئیں دوبارہ ایکسری میں نظر نہ آئیں حکیم صاحب نے درج بالا پرہیز کی ہدایت کی اور علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ہمیشہ ہمیش کے لئے اس مرض سے نجات پائی۔

اپنی آخری بیماری میں بھی ڈاکٹر اقبال حکیم صاحب کے زیر علاج تھے۔ جب کہ ڈاکٹر سی علاج سے ڈاکٹروں کو ان کی حیات کی کوئی امید نہ تھی۔ علامہ اقبال کے پسماندگان بھی مایوس ہو چکے تھے۔ ایسی حالت میں حکیم صاحب نے اپنے صندوق چمے کی خاص دوا روح الذہب اور روح الفضار جو بتدریج سونے اور چاندی کے محلول کا مرکب ہوتا تھا، کی چند خوراک علامہ اقبال کی خدمت میں بھیجی۔

تیز اثر دوانے اپنا کام خدا کی مرضی سے حسب اُمید کیا اور مریض صحتیاب ہو گیا۔ علامہ اقبال نے حکیم صاحب کی دوا روح الذہب کے بارے میں ۱۹۲۷ء میں حسب ذیل قطعہ لکھ کر روانہ کیا بطور اظہار تشکر۔

ہے دور وحوں کا نشیمن پیکرِ خاکی مرا

رکھتا ہے بیتاب دونوں کو مرادوقِ طلب

• ایک شعریوں بھی ہے۔

ہے دور وحوں کا نشیمن یہ تنِ خاکی مرا

لیک میں ہے سوز و مستی ایک میں ہے تاب و تب

ایک، جو اللہ نے بخشی مجھے صبحِ ازل دوسری وہ آپ کی بھیجی ہوئی روح الذہب

ایسے تھے پہلے زمانہ کے قابل ذہن اور ولی اللہ صفت حکیم اور یہ تھے ان کے

کمال۔

اسی لئے اطباء قدیم کا یہ مشفقہ فیصلہ تھا کہ علم طب کے اسرار و رموزات کتابی شکل میں عام نہ کئے جائیں۔ اور ان کو سینہ بہ سینہ منتقل کیا جاتا رہے۔ تاکہ یہ علم باصلاحیت، خلیقِ عمیم، اور فہم متقیم ہی کو ملے۔ اسی لئے اکثر سلفِ روحانی اس طرز طریقہ کو کامل طور پر حاصل کیا کرتے تھے۔

سقراط و بقراط اور افلاطون وغیرہ سب کے سب مؤحد اور بڑے پیمانے پر مجاہدہ باطنی کیا کرتے تھے بسا اوقات افلاطون دور آبادی سے عشقِ الہی میں غرق ہو کر گریہ و زاری اور آہ و بکا اس قدر شدت آواز کیا کرتے تھے کہ ایک ایک میل دور تک ان کے رونے اور خدا کے حضور میں گڑگڑانے کی آواز جاتی تھی۔ اور ان کے شاگردِ رشید اس آواز کی وجہ سے ان کو تلاش کر لیا کرتے تھے۔

غرضکہ انسان کی بنیائی کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر بصارت نہ بھی ہو تو بصیرت ضرور ہونا چاہیے۔

---



# حکیم حاجی قاضی سید کرم حسین قادری

جون ۱۹۲۵ء

۱۸۷۰ء بابت ۱۲۸ھ

تصوف و سلسلہ عالیہ و قادریہ کا نقیب

خاندان :-

مسلمانوں کے عہد عروج و اقتدار میں ایک نئے اُفق کی تلاش شوق تبلیغ اور اس نخطہ ارض کی مخصوص کشش کی وجہ سے وسط ایشیا، اور اس کے قریبی علاقوں سے جوق در جوق قافلے ہندوستان آئے۔ ان واردان ہندوستان میں حکیم سید کرم کے اجداد بھی تھے جنہوں نے سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں جنگلہ خانہ کے کشت و نون نیز غارت گری سے گھبرا کر اورٹ پھنک کر سرزمین ہند کا رخ صرف اس لئے کیا تھا کہ یہاں ایک وسیع اور پائیدار نہ صرف اسلامی حکومت قائم تھی بلکہ ہر چہار جانب امن و امان تھا بلکہ زرخیزی بھی تھی۔

ان کے اجداد ہمیشہ سے دارالقضاء، افتا اور محتسب کے عہدوں پر فائز رہے تھے اس لئے قاضی کے خطاب سے عوامی طور پر پہچانے جانے لگے۔ ان کے والد قاضی سید امداد علی ۱۸۰۹ء کو قصبہ ساکرس میں پیدا ہوئے۔ جب حکیم سید کرم علی کے دادا کی عمر ۶ سال تھی تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسی بنا پر حکیم کرم علی کے والد نے ساکرس ضلع گڑگاؤں کو راجا ہریانہ میں (چھوڑ کر تجارہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ حکیم کرم علی کے والد قاضی امداد علی نے ناگپور میں مہاراجہ بھونسلے کے وہاں فوجی خدمات انجام دیں۔ وہاں ان کو عزیزوں کا رسالہ مع تقارہ

سٹو سواروں پر مشتمل تھا۔ حاکم وقت کے ساتھ تنازعہ ہو جانے پر حکیم کرم علی کے والد اپنے احباب و عیال کے ساتھ تجارتی کاروبار واپس آ گئے۔

## پیدائش :-

۱۲۸۷ھ میں تجارتی کاروبار راجستھان کا ایک حصہ تھا۔ وہاں سادات گھرانے میں ان کی پیدائش ہوئی۔ ان کا اصل نام سید محمد سلیم الدین تھا لیکن گھریلو نام جوان کی عمتہ محترمہ صدیق النساء بنت غلام عسکری نے (آقائے نامدار کے بھانجے حضرت حسین کے نام پر رکھا تھا کیونکہ حضور کو اپنی آل سے جتنی محبت تھی وہ اظہار من الشمس ہے) کرم حسین رکھا۔ بھوپال سے حافظ غلام احمد فروغی نے جن سے ان کے خاندان کے قریبی مراسم تھے انھوں نے ایک تاریخی نام بلند اختر تجویز کیا تھا اور واقعی خدا کا کرم ایسا ہوا کہ یہ مانند ستارہ دنیا میں چمکے۔

حکیم سید کرم کی پیدائش کے وقت غدر کا پر آشوب دور دورہ گذر چکا تھا جس کی بنا پر عظیم تبدیلیاں رونما ہو گئی تھیں۔ خصوصاً مسلمانوں کے ذہنوں میں ان دنوں میں عظیم انقلاب کے دور رس اثرات مرتب ہونے لگے تھے۔ ان کے والد کی پیرانہ سالی اور نو مولود کی صغر سنی۔ گردشِ دوراں۔ وقت کی نزاکت کا احساس۔ ان تمام عناصر نے مل کر کرم حسین کی خصوصی تعلیم و تربیت پر ان کے والدین کو مجبور کیا کہ وہ اپنے خاندان کے واحد چراغ کو تعلیم کے زیور سے مزین کریں۔

## تعلیم و تربیت :-

دستورِ زمانہ کے مطابق سید کرم حسین کی تعلیم و تربیت کا آغاز بھی گھم سے ہی ہوا اور بچہ ۴ سال ۴ ماہ ۴ دن رسم بسم اللہ ادا ہوئی۔ چونکہ ان کے والد ماجد خود بھی عربی و فارسی کے استادِ کامل تھے اور درس و تدریس سے سابقہ تھا۔ جس کی بنا پر فارسی کے ابتدائی اسباق والد گرامی سے پڑھے۔ اس کے بعد تجارتی کاروبار کے دوسرے اساتذہ سے فارسی و عربی کی مزید تعلیم کی تکمیل کی۔ ان کے شفیع استاد مولوی حسین الدین مدرس راج مدرسہ تجارتی تھے۔ جن کی تربیت اور حسنِ انطباع سے سید کرم حسین نے

بہت کچھ سیکھا تھا۔ تجارہ کے سرکاری مدرسہ میں درسی کتب کی تکمیل کی۔  
 دورانِ تعلیم جب ان کی عمر بمشکل ۹ سال کی تھی کہ ان کے والد قاضی سید امداد علی  
 دراع مغارت دے گئے۔ ایسے مشکل دور میں شفیق ماں فیاض النساء نے جس طرح  
 ان کی تعلیم و تربیت اور تعلیم دلائی وہ نہ صرف لائق ستائش ہے بلکہ انھیں کا حصہ تھا۔  
 ان کی والدہ ماجدہ فیاض النساء کو شادی کے صرف دس سال بعد شوہر کی جدائی  
 کا حادثہ جانکاہ برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس غم و اندوہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی بصارت  
 جاتی رہی۔ بصارت سے ضرور محروم ہو گئی تھیں لیکن بصیرت کی دولت سے مالا مال  
 تھیں۔ فہم و فراست۔ سلیقہ مندی نیز حسن اخلاق کا نمونہ تھیں ان کی سوجھ بوجھ کا اندازہ  
 مندرجہ ذیل واقعہ سے بخوبی ہو جائے گا۔ انھوں نے کرم حسین کی شادی کے کچھ عرصہ  
 بعد سہو کو سینے کے لئے کپڑا دیا۔ کپڑا اسی کر جب وہ خوش دامن صاحبہ کے پاس لے  
 گئیں تو انھوں نے سیون اور ٹرپن کی تعریف کی لیکن کہا کہ۔ بہو تم اٹنا کپڑا اسی لائی ہو۔  
 بہو (حکیم النساء) نے بیان کیا ہے کہ وہ کپڑا ایسا تھا جس کے اُلٹے سیدھے کی کوئی تمیز  
 نہیں ہو سکتی تھی۔ دونوں جانب سے کپڑا ایک سا معلوم ہوتا تھا۔ خوش دامن صاحبہ  
 کے کہنے پر جب غور سے دیکھا تو احساس ہوا کہ انھوں نے بجا فرمایا ہے۔  
 بچوں کی تربیت جس اخلاق سے ماں نے کی وہ لائق تعریف ہے۔ حکیم کرم حسین  
 اپنی اوج و رفعت کو دیکھ کر کہتے تھے کہ آج ان کو جو قدر و منزلت اور بامِ عروج حاصل  
 ہوا ہے وہ سب ان کی ماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

۱۸۹۷ء میں جب حکیم کرم حسین مطب کرنے لگے تھے تو ایک صاحبِ حیثیت  
 مریض ان کے دواخانے میں ہاتھی پر سوار آیا تو انھوں نے اپنی والدہ سے اس مریض  
 کا ذکر کیا تو انھوں نے دعا دیتے ہوئے فرمایا۔ ”بیٹا خدا نے چاہا تو خود تمہارے یہاں  
 ہاتھی ہوں گے۔“ باری تعالیٰ نے ماں کی یہ دعا قبول کی اور واقعی کرم حسین کے یہاں  
 ہاتھی جھولے۔ اسی طرح جب کرم حسین اپنی والدہ سے مطب میں آنے والے مریضوں  
 اور حاکم وقت کے بارے میں بتاتے تو والدہ عرض کرتیں کہ یہ کیا ہے۔ اس سے بھی  
 بڑے آئیں گے۔ خدا نے فیاض النساء جیسی صابرہ و شاکرہ ماں کی یہ دعا بھی قبول کی  
 اور بڑے سے بڑے حاکم مریض بن کر دواخانے میں آئے۔ جن میں انگریز وزیر اعظم

اور والی ریاست ہزاریئ نس مہاراج جے سنگھ کا نام نامی اسم گرامی قابل ذکر ہے اور یہ سب مادر گرامی کی دعاؤں کا نتیجہ تھا۔

طبی تعلیم :-

چھ سال کی ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد عمر ۱۴ سال ان کی اعلیٰ و ارفع تعلیم کا مسئلہ ماں کے پیش نظر تھا۔ ایسے وقت میں ایک جانب سر سپر اپنے رفقاء کے ساتھ قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھائے تھے تو دوسری جانب قدیمی اخبارات کے مسلمان انگریزی تعلیم و تربیت کے خلاف محاذ آرائی کیے ہوئے تھے۔ ایسے پُر آشوب دور میں ماں نے کرم حسین کو جدید تعلیم حاصل کرنے کے بجائے طب کی تعلیم دلانا زیادہ مناسب خیال کیا۔ ان کے اس فیصلہ میں خاندان کے دیگر بزرگوں کا مشورہ تو داخل ہی تھا، کرم حسین کے نانا حکیم غلام حسین کا مشورہ بھی پیش پیش تھا جو ایک کامل و حاذق طبیب تھے۔ یہ فیصلہ ایسے وقت میں ماں نے کیا تھا جب کہ شوہر کے انتقال کو صرف پانچ سال کا وقفہ گذرا تھا۔ کرم حسین اپنے خاندان کے اکلوتے چشم و چراغ تھے، گھر میں گذر بسر کے لئے بفضل تعالیٰ اتنا کچھ تھا کہ آسانی سے فکر معاش کا مسئلہ حل ہو جاتا۔ لیکن ماں نے غم و حوصلہ اور دور اندیشی کو بروئے کار لاتے ہوئے تیزی سے بدلتی ہوئی انقلابی تبدیلیوں کے پیش نظر سیکڑوں سال سے ورثہ میں مل رہی قصبہ ساکرس کی قضاہ پر قناعت نہ کرتے ہوئے بیٹے کو طبی تعلیم کے لئے میرٹھ غازم سفر کیا۔ جہاں یہ مشہور و معروف طبیب حکیم محمد حسن حاذق کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ قیافہ شناس اور لائق و فائق استاد نے شاگرد کے چہرے پر ذکاوت و ذہانت کے آثار نمایاں پائے۔ کمال بہمدردی سے گلے لگایا اور ان کی ذہنی و فنی تربیت میں پورے انہماک سے اپنی صلاحیتیں صرف کیں۔ حکیم محمد حسن سے طبی درسیات کی تکمیل اور فنی رموز و نکات کے علاوہ مطب اور نسخہ نویسی کی تعلیم حکیم بلدیو سہا سے حاصل کی۔ میرٹھ اس زمانے میں۔ طبی و علمی اعتبار سے حکیم محمد حسن حاذق اور عملی و معالجاتی اعتبار سے حکیم بلدیو سہا تے کو خاص امتیاز اور ملکہ حاصل تھا جن کے مطب میں دور دور سے طلباء نسخہ نویسی کی مشق کے لئے حاضر ہوتے تھے۔

ایک بالکمال شاکرد کی طرح حکیم سید کرم نے بھی اپنے استاد اعظم حکیم بلدیو سہانے کو شراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے۔

حکیم علوق در بلدیو سنگھ  
سرچرخ پر ان کا ذہن رسا  
مذہب سے تریا تک فہم میں  
نہیں ان کا ہم کوئی دوسرا

تجارہ میں فن خطاطی کا علم چونکہ سیکھ چکے تھے۔ جس کی جلا میرٹھ میں ہوتی۔ وہاں پر نستعلیق اور نسخ دونوں میں کمال حاصل کیا جو ان کی آئندہ زندگی کے لئے ترقی کا زینہ ثابت ہوئی۔ ان کی تحریریں خطاطی کا بیش قیمت ورثہ معلوم ہوتی ہیں میرٹھ میں ان کے استاد طب حکیم محمد حسن حاذق جو ایک کثیر کتب کے مصنف تھے ان کی بیشتر کتب کی کتابت دیپ تعلق اور عقیدت کی بنا پر خود حکیم کرم حسین نے کی۔ یہ بڑے شغف ایثار اور ذوق علم کی علامت تھی۔ حکیم کرم حسین نے اپنے استاد طب کی جن کتب کی کتابت کی وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) معجون حیات مطبوعہ ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۱ء۔

(۲) ترجمہ افسرانی " شبان ۱۳۰۹ھ مطابق مارچ ۱۸۹۲ء

(۳) توضیح الادویہ " ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء

(۴) ترجمہ قرابادین اعظم مطبوعہ ۱۸۹۳ء

ان کی کتابت شدہ کتاب معجون حیات میں آپ کی کتابت کی شان میں مشہور شاعر گوہر علی میرٹھی نے مندرجہ ذیل اشعار کہے ہیں۔

ہیں رئیس تجارہ قاضی جی کاتب اس کے شان و ماشوکت

نام نامی کرم حسین ان کا نیک خو۔ خوب رو خوب صفت

رشتک بوسف لکھوں اگر ان کو تو زینا کو آنے کی غیرت

کیا ہی خوشخط لکھا ہے اور واضح

آپ نے نسخہ یہ بصد صحت

توضیح الادویہ جس کی کتابت بھی کرم حسین نے کی تھی ان کی کتابت کی شان میں درج ذیل الفاظ تحریر کئے گئے ہیں جو کتاب میں شامل ہیں۔

از سرمایہ بلا نعت پیرایہ فصاحت گوہر درج فضل و کمال فرخندہ سیرت

حمیدہ نحصال مقبول دارین قاضی حکیم سید کرم حسین صاحب ناطق رتیس تجارتہ متعلقہ ریاست الور سلمہ اللہ تعالیٰ۔

اسی طرح قرا بادین کے ترجمہ میں جوان کے استاد محترم کی تحریر کردہ تھی۔ اس کتاب میں بھی اسی طرح ان کی کتابت کی تعریف کی گئی ہے۔

میرٹھ میں حکیم سید کرم حسین کا ۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۲ء تک یعنی دس سال قیام رہا۔ درسیات طب کی تعلیم کے علاوہ وہاں انھوں نے چند سال طبیب کے فرائض بھی انجام دیتے۔ خصوصاً منشی اعجاز علی کے دواخانے میں کچھ عرصہ انھوں نے مریضوں کی بھی دیکھ رکھی۔

میرٹھ میں دس سال قیام اور مطب کے نتیجہ میں وہاں ان کا ایک وسیع حلقہ بن گیا تھا جس میں بے تکلف احباب کے علاوہ مرزا کی بھی ایک خاصی تعداد تھی۔ طبی محافل اور علمی و ادبی مجالس میں ان کی شرکت برابر رہتی تھی۔ عام شاعروں سے ان کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن مخصوص شعری نشستوں میں ضرور شریک ہوتے تھے۔ نہ صرف کلام سنتے تھے بلکہ اپنا کلام بھی سناتے تھے۔ سیرت اور دیگر موضوعات پر مذہبی تقریروں کی وجہ سے انھیں مذہبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ان کے میرٹھ کے خاص دوستوں میں منشی احتشام علی قابل ذکر ہیں۔

میرٹھ میں حکیم صاحب سے مستقل قیام کا اصرار رہا خود ان کا ایسا ہی ارادہ تھا لیکن والدہ نیز دیگر اغزاء کی فرمائش کے آگے یہ خیال ترک کر کے ۱۸۹۲ء میں وطن واپس آگئے۔ اور تجارتہ میں مطب شروع کیا۔ تشخیص و تجویز پر ملکہ اور دست شفا کی وجہ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی شہرت آس پاس کے علاقوں تک پھیل گئی اور بہت جلد ان کا مطب مرجع مرزا بن گیا۔

حکیم کرم حسین کے مزاج میں نفاست اور پاکیزگی حد درجہ تھی ملازمت کی بندشیں انھیں کہاں گوارا ہو سکتی تھیں۔ لہذا ملازمت کی جو بھی پیشکش انھیں ملیں وہ انھوں نے قبول نہیں کیا۔ حافظ غلام احمد فدوی جنھوں نے ان کا نام بھوپال سے بلند اختر تجویز کر کے روانہ کیا تھا۔ انھوں نے بھوپال کے صفیہ طبابت میں بحیثیت سرکاری طبیب کی پیش کش کی۔ حکیم سید کرم علی ۱۸۹۵ء میں بھوپال گئے ضرور لیکن چند یوم قیام کر کے

حافظ غلام احمد سے معذرت کر کے واپس آگئے کیونکہ ان کو اپنے فن پر بھرپور اعتماد اور ان کے بلند حوصلہ کا یہی تقاضا تھا جسے انھوں نے طبی تعلیم کے دوران منتہائے نظر بن رکھا تھا۔

تجارہ میں مطب میں نمایاں کامیابی ملنے کے بعد ۱۹۶۶ء میں انھوں نے پہلے دواخانہ حکیم کرم حسین پھر دواخانہ شفاء الامراض کے نام سے دواخانہ کھولا۔ یہ دواخانہ انھوں نے تازہ معیاری اور عمدہ دوائیں مریضوں کو فراہم کرنے کی غرض سے کھولا تھا۔ اس دواخانہ کی تیار کردہ دوائیں۔ آسام، بنگال، بہار، پورٹ بلیئر، سیلون، عدن، مانگ کانگ، نیپال، کلکتہ، حیدرآباد، سندھ و دکن کراچی سکھ بلوچستان میں کونٹہ چین۔ افغانستان میں بنوں۔ کوہاٹ۔ پشاور۔ دروش۔ مالاکنڈ۔ چترال اور ریاستوں میں جموں و کشمیر۔ پونچھ۔ بیٹوال۔ بہاول پور۔ گوالیہ۔ بنارس۔ جے پور۔ قزوی۔ جادرہ۔ بڑودہ۔ بھوپال۔ کوچین وغیرہ جایا کرتی تھیں۔

کھیرپل ریلوے اسٹیشن جو تجارہ سے سترہ میل دور تھا پھر بھی مریض کافی تعداد میں آتے تھے۔ قصبہ تجارہ میں حالانکہ ایک ڈاکخانہ پہلے بھی تھا لیکن چونکہ حکیم سید کرم حسین کے دواخانہ کا کام اتنا زیادہ بڑھ گیا تھا کہ مزید ایک ڈاکخانہ کی ضرورت ہوئی۔ مٹر بولڈ سپرنٹنڈنٹ جو بعد میں سرکل پوسٹ ماسٹر جنرل ہوئے دواخانہ آئے اور ان حضرات کی سفارش پر ایک نیا ڈاک خانہ دواخانہ کے کام کے لئے دواخانہ میں ۱۹۲۰ء میں قائم ہوا جو آزادی کے وقت تک رہا۔

حکیم سید کرم حسین اپنے وقت کے نامور اطباء، ہند سے جیسے شفاء الملک حکیم حافظ اجمل خان۔ شفاء الملک حکیم عبدالرشید۔ مولانا حکیم سید عبدالغنی حسنی حکیم حافظ عبدالنولی لکھنؤ کے حکیم مولوی احمد حسین۔ الہ آباد کے حکیم امیر سنگھ۔ دہلی کے بابائے طب حکیم فرید احمد عباسی۔ شفاء الملک حکیم دلبر حسن خاں پٹیالہ۔ حکیم احمد الدین۔ حکیم فیروز الدین۔ حکیم غلام محی الدین لاہور کے۔ حکیم عبدالقادر خان افسر الاطباء بھوپال اور حکیم سید عبدالحمید (مرجع البحرین) بھوپال کے شفاء الملک حکیم حبیب اللہ خان اجمیر۔ شفاء الملک حکیم عبدالحمید دریا آبادی۔ حکیم فقیر محمد چشتی لاہور حکیم بادی رضا لکھنؤ حکیم وہاب الحق۔ حکیم خواجہ کمال الدین لکھنؤ۔

حکیم محمد حسن قرشی۔ حکیم محمد شریف لاہور۔ حکیم غلام کبریا خان۔ حکیم محمد الیاس خان۔ حکیم محمد فضل الرحمان۔ حکیم محمد کبیر الدین۔ حکیم مصطفیٰ خان۔ میرٹھ۔ حکیم حبیب الرحمن خان ڈھاکہ۔ طبیب نواب صاحب ڈھاکہ، سے قریبی و درپینہ مراسم تھے۔

بوقت انتقال حکیم اجمل خان سے خصوصی تعلق کی بنا پر ۱۹۲۷ء میں حکیم صاحب کے انتقال پر ملال پر جو وفات کی تاریخ نکالی وہ مندرجہ ذیل ہے اور اس قطعہ کو انھوں نے اپنے رسالہ "مسبائے زماں" کی اشاعت میں مضمون کے ساتھ درج کیا تھا۔

ناطق سے تاریخ ہوا غلطاں و پچپال

بائف کی ندا آئی کہ ہو الغفر لہ

۱۲۲۶ھ

ان کو جتنا کتب کی خریداری کا شوق تھا اتنا ہی کتب بینی کا۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں دس ہزار نادر کتب کا ذخیرہ تھا۔ اور اس ذخیرے میں کئی سو قیمتی مخطوطات کے علاوہ تصوف، مذہبیات، تاریخ، تذکرہ، فراہن شاہی، علماء و مشائخ کی بعض نادر تحریریں۔ پرانے جرائد، نیز رسائل وغیرہ کے فائل تھے۔

## شعری و ادبی ذوق :-

اطباء کا تعلق نہ صرف شعر و ادب سے بلکہ سیاست، سماج، مذہب نیز ادب کے ساتھ قریبی رہا ہے۔ یہ روایت ہر دور کے اطباء کے ساتھ وابستہ رہی ہے۔ خواہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے یا پھر ہند کے۔

حکیم سید کرم حسین جو اطباء قدیم کی طبی، شہدہی اور ادبی روایات کے اس تھے۔ شعر و ادب کا بڑا نکھر اذوق رکھتے تھے۔ اور ناطق تخلص فرماتے تھے۔ اشعارت علی خان صدق میرٹھی ان کے استاد سخن تھے۔ حکیم سید کرم حسین نے استاد کی شاعرانہ خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے۔

کہ اس فن میں شاگرد ہوں، ہوں صدق کا

قیام میرٹھ میں جہاں علمی و ادبی نہ صرف ماحول تھا بلکہ شعر و ادب کا مرکز تھا۔ حکیم سید کرم حسین نے وہاں خاصی تعداد میں غزلیں اور نظمیں کہیں۔ لیکن تجارہ و ایسی پر



تصوف کی جانب رجحان۔ تفسیف و تالیف کا شوق نیز مصرع و نسیب و درخانہ اس شوق میں مانع ہوتے گئے۔

حکیم کرم حسین نے تمام اعنائت تن میں طبع آزمائی کی ہے جن میں بڑی شعریت و سادگی روانگی اور عنانی موجود ہے۔ اگر ان کی نظموں کا شعری و معنوی محاسن کا تجزیہ کیا جائے تو باسانی ان کے مرتبے کا تعین کیا جاسکتا ہے وہ سیدھے سادے لفظوں میں اپنا مافی الضمیر کمال قدرت کے ساتھ ادا کر دیتے ہیں۔ نظمیں پورے حسن و التزام کے ساتھ کہی گئی ہیں۔ اور ایک اچھی نظم کے لئے جتنی چیزیں درکار ہوتی ہیں، کلام ناطق میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

ایک طویل نظم میں فضائل حج کا بیان جس طرح کیا ہے وہ کتنا خوش کن ہے۔

ہو اگر مقدر روزِ ادرِ راہ کا  
یوں ہے ارشادِ رسولِ کردگار  
مالدارنی کچھ نہ پہنچائے گی سیر  
زور و زرجب دے دیا اللہ نے  
کا فروں میں ان کا ہوتا ہے معمول  
زندگی دور زندگی ہے دوستو!  
یوں کہا حضرت غمِ شے تین بار  
جانتا ہوں حکمِ دہوں ان کے لئے  
ایسے لوگوں کو اگر دیکھوں ابھی  
بعض اصحابِ رسولِ کبریا  
بعض رہے زورِ مفلسوں کا ہے یہ حال  
نہ سواری ہے نہ زادِ راہ ہے  
منعِ قرآن میں خدا نے کر دیا

فرض تم پر حج ہے بیت اللہ کا  
حج نہیں کرتے جو مومن مال دار  
حشر میں ہوں گے نصاریٰ و یہود  
پھر رہیں محروم جو اس فرض سے  
ڈال ایسی زندگی پر ناک و دھول  
موت سے پہلے کھڑی غافل نہ ہو  
حج ادا کرتے نہیں جو مال دار  
جزیہ دیں وہ کافروں کے طور سے  
گھر جلا دوں ہے قسم اللہ کی  
سخت نفرت ان سے رکھتے تھے سدا  
چل دیئے کر کے توکل کا خیال  
کہتے ہیں رزاق بس اللہ ہے  
منع کرتے ہیں حبیبِ کبریا

من رکھو ایسے توکل پر قدم

دوسروں پر بار بننا ہے ستم

غرض زبان و بیان اور لب و لہجہ کے اعتبار سے ان کے ادب پارے اپنے

دور کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کو حسین سانچہ میں ڈھالنے اور ادب و شاعری کے گلشن کو بھونڈے اور بھٹے الفاظ سے پاک کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ مختلف مواقع پر قطعات تاریخ بھی کہتے ہیں۔  
 ہیں میرے استاد مسیحائے زمان  
 نام سے ان کے شفا کو ہے فردا  
 اگر محمد ہو سرتاج حسن  
 ایسی کچھ ادویہ کی تو صبح کی  
 وصف میں جس کے زبانِ نطق لال  
 اپنے دیکھے ہی نہیں صاحب کمال  
 نام روشن ان کا ہر بے قیل و قال  
 تھا بہت مشکل اگر کیجئے خیال

س اگر تاریخ کا پوچھے کوئی

۶۱۸۹۲

کہتے ناطق نسخہ لامثل و مثال

مصرعہ کی چستی اور کلام کی پختگی ایک ایک شعر سے نمایاں ہے۔ تیسرے شعر میں مصنف کا نام (محمد حسن) اور چوتھے شعر میں کتاب کا نام (توضیح الادویہ) کس خوب صورت انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

حکیم صاحب نے صوفیانہ اور مذہبی خیالات کے علاوہ طبی مسائل کو بھی نظم کی زبان میں قلم بند کیا ہے۔

قرایا دین ہے نام اس کا جڑا  
 پڑا رہتا تھا بیچ میں مدرعا  
 کیا اردو کر کے پھر اس کو بتا  
 ہر اک فقرہ آئینہ پر ضیاء  
 مگر ہم کے حق میں کریں سب سب  
 کہ اس میں میں شاکر دو ہوں صدق  
 پے نسف پرانا جو اعظم کا ہے  
 زبانِ شہر میں تھا جلوہ لکھن  
 خیال آگیا بیٹے بیٹے جو کچھ  
 فصاحت چلتی ہے ہر لفظ سے  
 کیا سخت مشکل کو کیا سہول تر  
 خیال آتا تاریخ اس کی لکھوں

ندا آتی ناطق سے تاریخ سے

مسیحائے اعظم کو زندہ کیا

۱۲۱۲ھ

ایک منسلوم طبقی رسالہ نصاب الطب جو ان کی اور ان کے استاد طب کی مفت کا

شمرہ ہے۔ اس میں ادویہ مفردہ کے مترادف نام اور طبی اصطلاحات بیان کی گئی ہیں۔

گوکھڑ ہندی تازی ہے خشک  
فارسی خار خشک بے شبہ و شک  
کہتے ہیں آلو بخارا جس کو سب  
بولتے اجاص ہیں اس کو عرب  
عشتر تازی۔ ہندی ہے آکھ اور مدار  
فارسی میں جان ترک ابے موشیار  
ہے انگن ابخرہ اے رشک ماہ  
دلیسی اجواشن سمجھ تو نائحوواں  
سے میاں جوہی۔ چنبیلی یا سلمین  
ورزا تر ہے گل سرخ اے حسین  
سمیوتی نسہ بن ہے اے باخبر  
کیوڑہ کو جان کا ذمی اور کدر

اسی طرح کتاب اصول صحت میں امراض کا علاج نظم کیا گیا ہے۔

پوست خشخاش رکھ لے پسین کر  
بہ تپ لرزہ کو نافع بیشتر  
نیم ماشہ نیم ماشہ تین بار  
فاصلہ سے تو کھلا قبل از بخار  
پھر تپ لرزہ نہ آئے گی کبھی  
دسے پلا تھوڑا سا آب گرم بھی

## شاگردی۔

یوں تو حکیم سید کرم حسین کے شاگردان رشید کی فہرست طویل ہے لیکن شعر و ادب کے میدان میں فرحت علی فرحت نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔

## مذہبی رجحانات :-

مخصوص دلیلی ماحول میں پرورش کا حکیم صاحب کی نشوونما پر گہرا اثر پڑا۔ اوائل عمری میں عام طور پر مذہبی اعمال کی جانب زیادہ توجہ نہیں ہوتی اور اکثر کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں۔ حکیم سید کرم حسین عمر کے اس ابتدائی دور میں بھی فرائض کی انجام دہی سے کبھی غافل نہیں رہے۔ اعمال صالحہ اور نماز کی پابندی کا خاص اہتمام فرماتے۔ اس کی ادائیگی میں انہیں ایک خاص سرور حاصل ہوتا تھا۔ وقت سے پہلے اس کی تیاری کرتے اور بڑے نشوع و خضوع سے اس میں مصروف رہتے۔ یاد الہی ان کے نزدیک جزا بادشاہی سے بہتر تھی۔ اٹھاون سال کی عمر میں بھی ان معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یہ سب والدین کی پرورش و پرداخت نیز گھر کے علمی ادبی

نیز مذہبی ماحول کے نمایاں اثر کی بنا پر تھا۔

حکیم سید کرم حسین اپنے صوفی مسلک اور مذہبی رجحانات کی حامل ایک ایسی شخصیت تھی جس کے سب مذاح تھے۔ حکیم صاحب اپنے مشرب میں صلح کل و صلح عام کے قائل تھے اور خدا کی رحمت عام کا تصور ان کے دل میں شدت سے موجزن تھا۔ علماء کے باہمی قضایا اور اختلافات سے ان کو تکلیف ہوتی تھی۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ”مسلمانوں کی بڑی صلاحیتیں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے میں صرف ہوتی ہیں باہمی اتحاد و اتفاق کی اس قدر کمی ہے کہ جگہ جگہ اس اختلاف کے مظاہرے سامنے آتے رہتے ہیں۔ والصلح خیرا اور تغلوا باللہ پر کوئی عمل نہیں کرتا۔“

پھر ایک مقام پر تحریر کیا ہے کہ ”کیسے علماء ہیں کہ اپنے آپ کو وارث الانبیاء کہتے ہیں۔ کیا انبیاء کرام ایسے ہی تھے کہ خدا کے ارشادات کے خلاف اپنے بیان اور اپنے اقوال کو ترجیح دیں؟“

مناظرہ بازی اور ایک دوسرے کے خلاف الزامات اور علماء کے باہمی جھگڑوں پر وہ کڑھتے تھے۔ مزاج میں شدت اور غلو نہیں تھا۔ قادری نسبت اور صوفیانہ نظریات سے وابستہ ہونے کے باوجود وہ جہاں محفل سماع میں شریک ہوتے تھے وہاں علماء دیوبند سے بھی نہ صرف ذاتی مراسم تھے بلکہ مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا عبدالشکور وغیرہ کی تصانیف ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔

حضرت شاہ عبدالرزاق۔ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی۔ مولانا عبدالحمیم شرر۔ مولوی عزیز مرزا۔ فرنگی محل کے مولانا مفتی محمد یوسف فرنگی محلی حضرت مولانا الیاس بانی تبلیغ۔ مولانا سعید احمد دہلوی۔ مفتی کفایت اللہ اور شاہ محمد یعقوب نقشبندی مجددی سے حکیم سید کرم حسین کے مخلصانہ روابط تھے۔ تصوف کے دلدادہ ہونے کی بنا پر مذہبی مدارس میں تصوف کی تعلیم کو لازمی گردانتے تھے۔

حکیم سید کرم حسین نے حضرت میاں سلام اللہ شاہ سے بیعت کی اور دوستا خلافت سے مزین ہوئے۔ اسی طرح آپ کا سلسلہ عابدی سے گہرا اور قریبی تعلق قائم ہوتا گیا۔

پیر جی شاہ عبداللطیف سے خصوصی مراسم تھے حکیم صاحب کی اہلیہ حکیم النساء

انہی پر چمکے بہت تھے۔

حکیم صاحب کے دل میں مزید سرین کی خاطر ہی اور حج کا بے پناہ اشتیاق تھا۔  
 ۱۹۴۳ء میں نفل میلاد کے بعد حرمین شریفین کی زیارت اور حج کی سعادت کے لئے نصوصی  
 دعا لائی۔ دعا نے ان کی یہ دعا قبول کی۔ ۱۹۴۴ء میں حج کا بابرکت فریضہ ادا کیا ایک  
 مرتبہ نواب یہ بھی اعلیٰ درجہ کے درویشوں کی زیارت نصیب ہوئی اس حج میں تجارہ سے  
 بہت بے افراز رہنے کے ساتھ اسے حکیم شتیق القادر۔ نوجوہ حکیم النساء۔ ہشیدہ نور دانوی  
 گیم نوجوہ کمال الدین۔ قاضی سعید الدین۔ ضعیفہ خاتون کو بچری پا کر رکاب تھے۔  
 مگر مکران سے وہ درجہ کمبخت اور مدینہ منورہ سے دو چوڑ فرمایا کافی احراجات  
 سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ جو باری تعالیٰ کے اوصاف حمیدہ کی نعمہ سرانی کرتی  
 رہتے تھے۔

روضہ پاک کی حاضری پر کیا خوبیاں تھیں۔

میرت کے کھلنے بولے ہاں۔ • وال کے نکال ہاں۔ شہل ہاں۔ خاک  
 اپنی توڑ کھا جاتا۔ بوضو ہاں۔ اور  
 دعا کرو عاصی کی ہر جگہ قبول

کوئی رشتہ نہیں ہے۔

تھیں اور فوجی ٹینکوں سے بھی کو باری تعالیٰ دنیا میں عزت اور آخرت  
 میں سعادت کو تو جانتے ہیں۔ اور ان کی توفیق اور اس کے دل میں ولولہ  
 نہایت باری پیدا کر دیتا ہے۔ بڑے سے بڑے انسان پر نظر ڈالی جاسکتے تو اس  
 کی بڑائی اور اتارے کا ایسا جو سب بڑے کا یعنی خدمت خلق اللہ۔ وہ اور بہت سی  
 نعمتیں اور لائق تھیں ہیں جو وہ کو توڑی خدمت کے لئے وقف کر دیں یا کم از کم  
 اپنے رگڑتے حل سے بجا ہوا وقت خدمت خلق میں صرف کریں۔

حکیم صاحب پیدارم حسین کے نہ صرف اپنی حیات میں بلکہ آگے والی نسلوں کے  
 لئے وہ بیش بہا خدمات کر سکتے ہیں کی بنا پر آج بھی لوگ ان کو یاد کرتے ہیں۔

اس انجمن خدام الاسلام پر ریاست الوری میں اس انجمن کے قیام میں حکیم کرم حسین کا

خصوصی تعاون رہا اور ان کی سرپرستی میں اس انجمن نے ریاست کے فلاح و بہبود کے لئے کافی کام کیا۔

## ۲۔ جمیعتہ مرکزیہ تبلیغ الاسلام :-

اس تنظیم کا تعلق اسلام کی اشاعت اور تبلیغ سے رہا۔ بعد میں اس انجمن کا دفتر انبالہ سے کانپور راقم کے گھر کے قریب منتقل ہو گیا۔

## ۳۔ جامع مسجد تجارہ :-

۱۹۲۳ء میں اس مسجد کی توسیع کرائی اور اخراجات میں مسجد کو خود کفیل بنایا۔ خود مکرانہ جا کر سنگ مرمر اور ۶ کاریگر ساتھ لائے ان معماروں نے حکیم صاحب کے گھر رہ کر اس کا صدر دروازہ تعمیر کیا۔ حکیم کرم حسین اس مسجد کے متولی بھی تھے۔ تجارہ کی فلندری مسجد ولال مسجد اور دہلی کی مسجد مچھلی والان اردو بازار کی تعمیر میں بھی بڑھ چڑھ کر تعاون کیا۔ خالقاہ عابدی (الور) کی تعمیر میں بھی وہ پیش پیش رہے۔

اسی طرح اسلامپہ اسکول تجارہ جو حکیم صاحب کی حویلی میں ۱۹۱۵ء میں قائم ہوا تھا خبر گیری کرتے رہتے تھے۔

اسی طرح ملی رفاہی کاموں میں اپنی حیثیت کے مطابق ہمیشہ خرچ کرتے رہتے تھے۔

## وفات :-

تجارہ سے فسادات جو کہ تقسیم ملک کا باعث تھے حکیم صاحب نیز ان کے خاندان کے دیگر افراد ترک سکونت کر کے بھوپال آ گئے تھے۔

۸۳ سال سے زیادہ عمر ہو گئی تھی پھر بھی اعضاء حد درجہ معمول کے مطابق کام کر رہے تھے۔

۲۵ جون ۱۹۵۳ء کو وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ بوقت انتقال غفلت و نیم بیہوشی کے عالم میں وہ کبھی سر کا مسج کرتے۔ کبھی کہنیوں کو دھونے کی سعی کرتے۔

یعنی وضو کی کوشش تھی اور انگلیاں جو تسبیح کی عادی تھیں وہ بغیر تسبیح کے اسی طرح جلتی رہیں۔

اس کے انتقال پر شہداء شہداء نے مرثیہ ، و قطعات بطور نذرانے کے پیش کیے جس سے ان کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مشیتا قریب کرم سے کہرا العجبین راغب چھٹا رکھا ہے۔

کرم و قواشیں زجاجی کرم حسین جوتھے  
 شمار حضرت و ائمہ میں آج دنیا سے  
 خلقی قادر مطلق کہ فضل رحمان ہوں  
 غم فراق میں ہر اک کا دل ہوا دو نیم  
 نوید غیب چھٹا رکھا ہے نبی جوتھے سے راغب  
 کرم حسین ہوتے داخل پناہ کرم

از حقیر طے گھو پائی ہے۔

و از قولوں میں در ملامت ہوا کہ بکر حضرت  
 از آن پہاڑی ہاں آئے کہ گھو پائے تھے

از مرزا قمر شاہی گھو پائی ہے۔

و ان کا طے گھو پائی ہوا کہ بکر حضرت  
 از آن پہاڑی ہاں آئے کہ گھو پائے تھے  
 کرم حسین مسیحا کے نازق میوات  
 وہ جن سے نہیں پہنچتا تھا خلق کو دن رات  
 وہ جن کی طلب میں ہیں مقبول عام تصنیفاً  
 یہ کیا غضب ہوا اسے مرگ بازم لذات

کرم قواشیاں مطلق کہا میں پر اسے رستری

ہم ان کی لذات سے انحروم کر گئے یہ حیات

مندرجہ ذیل اشعار میں علامہ قمر شاہی نے پوری نے کتنے حسین پیرایہ میں منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

خوش وضع و خوش عذا و خوش خلق و خوش خصال	ح حاجی حکیم قاضی محمد کرم حسین
خود دار و خود شناس و خود آگاہ و خود نیال	ک کم خواب و کم خوراک و کم آمیز و کم سخن
ہر وقت ان کو رہتا تھا انفس کا خیال	ی یاد خدا سے یہ کبھی غافل نہیں رہے
ہر بات میں میانہ روی اور اعتدال	م مد نظر مقولہ تھا خیر الامور کا
ہر قول بے نظیر تھا ہر فعل بے مثال	ک کردار کے تھے مرد تو گفتار میں تھے فرد
علم عمیق و فضل کی دولت سے مالا مال	ر رہتے تھے شان و شوکت و دولت بے نیاز
یعنی ہر ایک علم میں آپ اپنی تھے مثال	م ماہر تھے آپ جملہ علوم و فنون کے
کب تک عروج رہتا ہے ہوتا ہے کب زوال	ح حالات انقلاب زمانہ سے باخبر
جو ان کے پاس آتا تھا ہو جاتا تھا نہال	س سائل نہ خالی ہوتا کرم کا یہ حال تھا
تشخیص لا جواب تھی تجویز بے مثال	یے یہ حال فن حکمت و طب میں تھا آپ کا
ایسے حکیم ہوتے ہیں دنیا میں خال خال	ن ناگفتہ حال نبض سے تشخیص جو کریں
حاصل تھا علم و فقہ و تصوف میں بھی کمال	ص صوفی حکیم ناظم و ناشر ادیب تھے
یکساں تھا ان کا ماضی و مستقبل اور حال	ا اول سے ایک وضع پر قائم رہے سدا
ایسے گئے ہیں پیش خدا ندر و الحلال	ح حمد خدا زباں پہ تھی اور دل میں یاد حق
حکیم سید کرم حسین صاحب	ب

طلبی معر کے :-

حکیم صاحب گونا گوں خوبیوں کے مالک تھے وہ بیک وقت شاعر ادیب تھے تو ناشر بھی۔ منتظر تھے تو مہتمم بھی۔ اور سب سے بڑھ کر وہ ایک لائق و نائق طبیب تھے۔ ان کے علاج سے کتنے ہی لوگ فیضیاب ہوئے جن کی کوئی گنتی نہیں ہے۔ چند ایسے علاج جو تاریخ میں درج ہیں۔

ڈاکٹر خلیل احمد شمس آبادی کا بیان ہے کہ ماؤنٹ آبو میں حکیم صاحب کے دوران قیام ایک لالہ جی کا، یا ۸ سال کا اکھوتا لڑکا حکیم صاحب کی خدمت میں لایا گیا جس کو آپریشن آخری علاج تجویز کیا گیا تھا کیونکہ اس نے ایک پھوٹا چاقو نگل لیا تھا۔ لالہ جی اور ان کے گھر کے دیگر افراد کی پریشانی دیکھا دیکھ نہیں جاتی تھی۔ حکیم صاحب نے دو روایتیں



یکے بعد دیگرے (غالباً سفوف متفناطیس کسی مناسب مسہل کے ہمراہ) استعمال کرائیں۔ یہ چھوٹا چاقو سلا متی کے ساتھ دستوں میں نکل آیا۔

۱۹۳۶ء میں دھومی لال سنار کے پوتے کو پتھری کی شکایت ہوئی۔ الہ اور دہلی کے اسپتالوں میں آپریشن تجویز ہوا حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ حکیم کرم علی صاحب نے مولیٰ کے عرق میں حجر ایسود خوب سمجھ کر کرکشتہ تیار کرایا۔ اس کشتہ کے استعمال سے ۲ ماہ میں پتھری نکل گئی۔ بچے کو صحت ہو جانے کی خوشی میں دھومی لال سنار نے حکیم صاحب کو چاندی کا گلاس بنا کر دیا۔

تصانیف :-

ہر بڑے حکیم کی طرح حکیم سید کرم حسین نے بھی تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھا اور مندرجہ ذیل کتب تحریر کیں۔

(۱) تحفہ جہاں معروف بہ کیمیائے عشرت :-

یہ جنسیات کے موضوع پر ایک ضخیم و معلوماتی کتاب ہے جس میں جنسی مسائل پر مستند کتابوں کے حوالے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب عوام و خواص میں حد درجہ مقبول ہوئی اور پہلی اشاعت ۱۸۹۶ء سے لے کر ۱۹۵۰ء تک اس کے آٹھ ایڈیشن شائع ہوئے ہیں اس کتاب میں تین حصے ہیں۔

(۱) بزم خلوت -

(۲) بزم راحت -

(۳) بزم حسرت -

لیکن صرف اول حصہ بزم خلوت ہی زیور طباعت سے مزین ہو سکا جس کے تین سو سے زیادہ صفحات ہیں۔

(۲) نصاب الطب المعروف طبّی خالق باری :-

یہ ان کے استاد طب حکیم محمد حسن حاذق اور ان کی مشترکہ کاوشوں کا منظوم مجموعہ ہے

جس میں ادویہ کے فارسی عربی اور ہندی ناموں کے علاوہ امراض اور اصطلاحات طب کو نظم کیا گیا ہے یہ فارسی کی درسی کتاب خالق باری کے طرز پر ہے ۱۹۲۳ء میں دوسری بار زیور طباعت سے آراستہ ہوئی تھی جسے نامور طبیب حکیم اجمل خاں کے نام سے منسوب کیا گیا تھا۔

### ۳۔ رسالہ ام الصبیان :-

یہ کتاب زیور طباعت سے محروم رہی لیکن اس کتاب کی وجہ تصنیف کا ذکر حکیم سید کرم علی نے کیمیائے عشرت میں کیا ہے۔ چونکہ اس مرض ام الصبیان میں حکیم سید کرم علی کے پانچ بچوں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے رفاہ عام کے فائدہ کے لئے یہ کتاب تحریر کی تھی۔

### ۴۔ رسالہ حضاب :-

یہ بزبان فارسی تحریر کیا گیا ہے اس میں حضاب کے متعدد نسخے ہیں۔

### ۵۔ رسالہ خواص آکھ :-

آکھ جسے اکوڑہ یا مدار بھی کہتے ہیں اس کے فوائد پر ایک کتاب لکھی تھی اور پچیش کے لئے اس دوا سے ایک ایسی دوا تیار کی تھی جو ان کے تجربات میں سے تھی۔

### ۶۔ الحب معروف بہ من موہنی :-

یہ تین موصفات پر مشتمل ایک تعویذ و عملیات پر مشتمل ایک کتاب ہے جو کئی بار زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔

### ۷۔ رسالہ مقصود الاطباء :-

حضرت سید محمد عرف سید شمس الحق قادری دہلوی مرید حضرت شاہ محمد غوث قادری عازی پور زوانی و پیر مرشد حضرت سید شاہ آل احمد عرف اچھے صاحب قادری

مارہروی کے فارسی رسالہ مقصود الطالبین کا اردو ترجمہ ہے۔

۸۔ مفتاح الغیب :-

حضرت امام جعفر صادقؑ کی طرف منسوب کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں قرآن پاک سے فال نکلنے کا طریقہ بیان کیا ہے۔

۹۔ تسخیر خلائق ترجمہ کتاب عقد المحبت :-

اس کتاب میں قرآنی آیات کا فارسی زبان میں مطلب بیان کیا گیا تھا۔ حکیم سید کرم حسین نے اس کا اردو ترجمہ کر کے حاشیے میں ان کے فوائد تحریر کئے ہیں۔

۱۰۔ مفتاح الصلوٰۃ :-

نماز کا یہ رسالہ ۱۹۱۱ء میں کتب حنفیہ سے تیار کیا گیا ہے جس میں نماز کے احکام اور نماز سے متعلق دیگر احکامات بھی بیان کئے گئے ہیں۔

۱۱۔ معراج المؤمنین :-

یہ کتاب بھی نماز کے بیان میں جس میں نماز کی فضیلت اور اس کو پڑھنے کی رغبت دلائی گئی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے سلسلہ اول کے طور پر یہ کتاب ۱۹۲۹ء میں چھپی ہے۔

۱۲۔ رمضان المسلمین :-

یہ کتاب منظوم طور پر روزوں کی فضیلت اور ان سے متعلق ضروری بیان کے مسائل میں ہے۔ اسلامی تعلیمات کے سلسلہ دوم کے طور پر یہ کتاب بھی ۱۹۲۹ء میں چھپی ہے۔

۱۳۔ رسالہ فضائل الراج :-

اسلامی تعلیمات کے سلسلہ کا یہ تیسرا رسالہ ہے جو طبع نہیں ہو سکا تھا اور منظوم

ہے۔

## ۱۴۔ چہل کاف :-

ایک مشہور دعا ہے جس کا اثر اب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی طرف ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۰ء میں طبع ہوئی تھی۔

## ۱۵۔ درود مستغاث :-

اس درود کو حضرت امام جعفر صادقؑ کی سند حاصل ہے ۱۹۰۴ء میں حضرت سیال سلام اللہ شہداء نے حکیم سید کرم حسین کو اس درود کو پڑھنے کی ترغیب دی تھی جو آخر زندگی تک بعد نماز فجر حکیم صاحب کے معمولات میں شامل رہا۔ حکیم صاحب نے اس کتاب کی ابتدا میں احادیث اور معتبر ماخذ کی روشنی میں درود کی فضیلت پر علمی حیثیت سے لکھا ہے۔

## ۱۶۔ حرز مرقیہ معروف بہ دعائے سینفی :-

۱۳۲۶ھ میں یہ کتاب دہلی سے چھپی تھی۔ یہ ایک بابرکت اور مقبول دعا ہے ۱۹۲۸ء حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کی تلقین فرمائی تھی۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے اس کے فوائد اور برکتوں کے علاوہ اس کو بہت سے ناموں سے موسوم فرمایا ہے۔

## ۱۷۔ دربار سلطان الہند :-

اس رسالہ میں خواجہ ہندالولی کے روحانی دربار کی منظر کشی کی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۲۳۹ھ میں دہلی سے چھپی تھی۔ ۱۹۲۱ء

## ۱۸۔ شان صابر بدیہ نظیر :-

حکیم سید کرم حسین کا حضرت علاء الدین صابر کلیری کے مزار پر بہ سلسلہ مرثیہ دربار جانا ہوا۔ بارگاہ حضرت صابر کلیری میں مختلف شعراء نے جو منظوم نوحہ عقیدت پیش کی ہے۔ حکیم صاحب نے اس کو یکجا کر کے ۱۹۲۸ء میں چھپوایا۔

## ۱۹۔ ارشادِ واحدی :-

ایک بزرگ حضرت حافظ قاری میاں واحد علی شاہ کے ملفوظات ارشادِ واحدی کے نام سے مرتب کئے ہیں۔

## ۲۰۔ تذکرہ احباب :-

اپنے دو صاحبزادوں کی تعلیم پر ہوتے جشن میں احباب و متعلقین کے احساسات و خیالات کو یکجا کر کے ۱۹۳۰ء میں شائع کیا تھا۔

## ۲۱۔ جشن مولود :-

۱۹۲۹ء میں حکیم صاحب کے پہلے نبیرہ کی پیدائش پر تجارہ میں جو جشن مسرت منایا تھا ایسے موقع پر حکیم صاحب نے پیش کئے گئے قصیدہ قطعات ایک مقام پر یکجا کر کے شائع کیا تھا۔

## ۲۲۔ سورہ یسین :-

۱۹۲۵ء میں سورہ یسین اور اس کا اردو ترجمہ مع خواص و فوائد پیش کیا تھا۔

## ۲۳۔ میلادِ خیر العباد :-

میلادِ شریف یعنی حضور پاک کی سیرت پر مشتمل یہ کتاب تھی۔

## ۲۴۔ کتاب المعالجات

اس کتاب میں اسباب، علامات اور تشخیص امراض پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اپنے اساتذہ کے مجربات درج تھے۔ اس کتاب کو عرفیت کے طور پر وہ کبھی کبھی مزاحاً دو بیماریوں کا دلی چین "بھی کہا کرتے تھے۔

۲۵۔ بیاضِ طب۔ اس کتاب میں انھوں نے بزرگوں کے تجربات اپنے

تجربات اور مریضوں سے دواؤں کی کیفیات کو سن کر تین حصوں میں قلم بند کیا تھا۔ اس کے علاوہ چند کتب اور بھی تحریر کی تھیں جیسے شرح قصیدہ نمونہ - ثنوی نظیں رسالہ قدم شریف وغیرہ۔

حکیم صاحب نے طب کے میدان میں جو کارہائے نمایاں اور خدمات کی تھیں وہ سنہرے حروف سے لکھنے کے قابل تھیں۔ حکیم سید کرم حسین نے غریب عوام کی عام معلومات کے لئے تجارہ جیسے دور دراز مقام سے ۱۹۲۷ء میں ایک رسالہ ماہنامہ میجائے زمان کے نام سے بھی جاری کیا تھا جس کی تعداد اشاعتِ قریب پانچ ہزار تھی۔

# شمس الاطباء خان صاحب حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی انصاری

۱۹۲۶ء

۱۸۶۲ء

## ممالکِ غیر میں طبِ یونانی کا نقیب

طبِ یونانی جو اپنے ابتدائی دور سے ایک خوش آمد مستقبل کی ضمانت اور طبِ ہسپتال بھی ابتدائی دور میں ہندوستان میں مشاہیرِ اطباء کی آمد منگلیہ دورِ حکومت میں سرزمینِ ایران سے شروع ہوئی۔ ہند کے بیشتر طبیبی خاندانوں اور اطباء کا سلسلہ تلمذ بھی ان ہی گرامی قدرا سا تازہ تک جا پہنچتا ہے۔ خاندانِ شریفی دہلی اور خاندانِ عزیز پوری لکھنؤ کے بزرگ بھی ایرانی اطباء کے تربیت یافتہ تھے۔ لہذا اس وقت ملکِ ایران طبعی شعبے میں سربراہ اور وہ طبعی حیثیت کا مالک تھا۔

خاندانِ ۔۔

حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب کا خاندان برصغیر کی غنیم و نمایاں ہستیوں پر مشتمل ایک اعلیٰ خاندان تھا۔ ان کے اجداد ایران سے ہجرت کر کے واردان ہند میں سے تھے۔ آپ کے خاندانی حالات آپ کی علمی قابلیتوں سے متاثر ہو کر انگلینڈ کے ایک نامور سیاح سیوت ہنری لنڈوز ( *Swcj Henry Landose* ) نے اپنے سیاحت نامہ ”ایران و ترکیستان“ میں تحریر کئے ہیں جو لاہور کی پبلک لائبریری میں محفوظ ہے۔

پیدائش ۔۔ آپ کی پیدائش تعلیم کی دولت سے مالا مال علم و فن سے مزین



شمس الاطبا حکيم غلام جيلاني مرحوم



ایک اعلیٰ انصاری خاندان میں ۱۵ مئی ۱۸۷۳ء کو لاہور میں ہوئی تھی۔ آپ ایک اعلیٰ انصاری خاندان میں اس وقت تو لد ہوئے جب ہندوستان کے سیاسی و سماجی افتق پر عظیم تبدیلیوں کے دور رس اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ ایک جانب قدیم ذہن کے علماء پر مشتمل طبقہ اسلام کی بقا کے لئے جدوجہد کر رہا تھا تو دوسری طرف جدید علوم سے روشناس کرانے کے لئے اور دنیا میں مسلمانوں کو سرخرو کرانے کے لئے سرسید جیسے علماء پر مشتمل ان کے رفقاء برسرِ پیکار تھے۔

## تعلیم و تربیت :-

ایسے پر آشوب دور میں والدین نے اپنے فرزند ارجمند کے لئے حسبِ قاعدہ ابتدائی تعلیم کی ابتدا گھر سے کی۔ عربی فارسی نیز انگریزی کی تعلیم کی تکمیل مدارس میں کر کے نورمل مڈل اسکول لاہور سے مڈل پاس کیا۔

## طبی تعلیم :-

چونکہ ان کے والد حکیم سلطان محمود انصاری اپنے وقت کے نہ صرف ایک جید عالم ہی تھے بلکہ عالی مرتبت حکیم بھی تھے۔ اور جو باقاعدہ لاہور میں ایک کامیاب مطب و درواخانہ کے مالک بھی تھے۔ طب کی تعلیم نہ صرف اپنے والد سے بلکہ دیگر باکمال اطباء سے بھی حاصل کی۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں تحصیل تعلیم کے بعد لاہور کے میڈیکل کالج میں داخل ہو کر علم و عمل ڈاکٹری کی تعلیم کی شروعات کی۔ اس وقت ہندوستان میں جدید طب یعنی ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم صرف ڈپلومہ تک محدود تھی۔ لہذا حکیم غلام جیلانی صاحب نے ۱۸۹۵ء میں۔ اپریل۔ ایم۔ ایس کا ڈپلومہ یعنی سند حاصل کی اور اسی سال سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔ اور چند سال تک پنجاب کے کئی سرحدی مقامات پر مامور رہنے کے بعد آپ اپنی علمی و عملی لیاقت کے سبب منتخب ہو کر ملک ایران کو روانہ کئے گئے جہاں آپ کو نہایت عزت و شہرت ملی۔

ابتدا میں آپ گورنمنٹ برطانیہ کے قوانین یعنی سفیر متعینہ قوانین و کمرمان کے

ڈاکٹر مقرر ہوئے۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد آپ بمقام برجنند دار الحکومت تہران (فائنا) ایران میں برٹش ایجنٹ مقرر کئے گئے۔ جہاں آپ اپنی طبی قابلیت کے سبب نہایت ممتاز خیال کئے جاتے تھے۔ چنانچہ جب جلالت مآب عمدة الامراء العظام امیر شوکت الملک حکمراں ولایت قایناات (نمائندہ حکومت) نے آپ کو اپنا طبی مشیر مقرر فرمایا۔ اس کے ایک سال بعد آپ دولت عظمیٰ برطانیہ کے قونصلوں خانہ (سفارت خانہ) سیستان کے میڈیکل آفیسر مقرر ہوئے وہاں پر بھی آپ کی طبی لیاقت کی نہایت قدر ہوئی۔ چنانچہ جلالت مآب عمدة الامراء العظام امیر شوکت الملک حکمراں ولایت سیستان نے بھی آپ کو اپنا طبی مشیر مقرر فرمایا جہاں آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔

اعلیٰ حضرت ملک معظم کے کئی ایک محترم قونصلوں یعنی سفیروں نے جن کے ماتحت غلام جیلانی صاحب کو اپنے دوران قیام ایران میں طبی خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔ اپنے عنایت ناموں یا تصدیق ناموں میں جو حکیم غلام جیلانی صاحب کے پاس موجود تھے۔ آپ کی طبی قابلیت خدمات و حذاقت کی بہت تعریف کی تھی۔ نیز عالیجناب سر میک موہن صاحب بہادر کے۔ سہا۔ ایس۔ آئی نے (جو ۱۹۰۲ء میں سرحد افغانستان و ایران کے حاکم مقرر ہوئے تھے اور جن کے نام پر آج بھی میک موہن لائن بنی ہوئی ہے) نیز لارڈ رولڈ شے صاحب بہادر جیسے امیر الامراء نے انگلینڈ نے بھی جن کو ۱۹۰۰ء میں دوران سیاحت ایران میں آپ سے علاج کمرانے کا اتفاق ہوا تھا اپنے تصدیق ناموں میں جو حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی کے پاس آخر وقت تک تھے۔ آپ کی طبی قابلیت کی تعریف کی ہے۔

تقریباً عرصہ آٹھ یا نو سال تک مختلف مقامات ایران میں کام کرنے پر ۱۹۰۲ء میں آپ کی حسن خدمت کے صلہ میں حکومت ہند نے بطور ذاتی اعزاز کے آپ کو خان صاحب کا خطاب عطا کیا تھا۔ اس کے قبل دوران قیام ایران میں حکومت ایران نے بھی آپ کی بہت عزت افزائی کی اور ۱۹۰۲ء میں آپ کو شمس الاطباء کے معزز خطاب سے نوازا اور ۱۹۰۳ء میں اعلیٰ حضرت منظر الدین شاہ مرحوم و مغفور شاہ ایران نے شیر و خورشید کا ایک ممتاز تمغہ آپ کو مرحمت فرمایا۔ پھر ۱۹۰۴ء میں مملکت

ایران کی شاہی مجلس حفظ الصحۃ نے آپ کو اپنا ممبر منتخب فرمایا۔  
۱۹۰۶ء میں آپ اپنے وطن مالوٹ لاہور میں رخصت پر نشہ لینے لائے۔ اور  
بعض خانگی امور کے سبب ۱۹۰۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور  
تب ہی سے آپ لاہور میں مطب کرنے لگے۔ لیکن زیادہ تر آپ طبی تصنیف و تالیف  
میں مصروف ہو گئے۔

ڈاکٹری و طبی کتب کے مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا آپ کو ابتدا ہی سے  
شوق تھا۔ چنانچہ انڈین میڈیکل ریکارڈ کلکتہ جو کلکتہ کا ایک معروف انگریزی رسالہ  
تھا اس میں آپ کے کئی اعلیٰ مضامین شائع ہوئے اور دوبارہ آپ کو رسالہ مذکور  
کے انعامی مضامین انعامات مع سندات ملے جو ایک ہندوستانی طبیب کے  
لئے باعث افتخار تھا۔

## علمی و ادبی کارنامے :-

بعض مشہور اردو رسائل و جرائد مثلاً پیسہ اخبار، وطن اور وکیل میں بھی آپ کے  
علمی مذاکرہ مباحث اور اردو طبی رسائل مثلاً مجلہ طبیہ دہلی و اخبار حکمت لاہور  
اور خصوصاً رفیق الاطباء میں آپ کے کئی علمی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔  
حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب کی طبی تصنیفات کو جو مقبولیت اور شہرت  
حاصل ہوئی وہ اس دور میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو ان کی مخزن حکمت  
جس کا دوسرا نام ”گھر کا حکیم و ڈاکٹر“ ہے بے حد مقبول ہوئی۔ مقبولیت کا اندازہ  
صرف اس بات سے ہو جائے گا کہ اب تک دونوں جلدوں کے چودہ پندرہ ایڈیشن  
شائع ہو چکے ہیں۔ اکثر پڑھے لکھے گھروں میں گھر کے اس حکیم و ڈاکٹر کی دونوں  
جلدیں موجود ہوتی ہیں۔ کتنے ایسے ہیں جو صرف ان دو کتابوں کو پڑھ کر ہی ڈاکٹر  
و حکیم بن گئے ہیں۔

مخزن حکمت کی مقبولیت کو دیکھ کر اسی طرز پر کئی اور کتب شائع ہوئیں لیکن کسی  
کتاب کو بھی وہ قدر و منزلت نہ ملی جو ان کی تصنیف کو حاصل ہوئی۔  
بلاشبہ حکیم غلام جیلانی میں تصنیف و تالیف کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

اور تصنیف و تالیف کی خداداد صلاحیت تھی۔ مختلف طبیہ کالجوں اور پنجاب یونیورسٹی کے طبی امتحانات کے آپ اکثر ممتحن ہوتے تھے تاہم علاج و معالجہ سے پوری دلچسپی رکھتے تھے مطب میں وقت مقررہ سے حاضر ہوتے تھے۔

چنانچہ آپ کی تصانیف کی ایک ایک جلد ازراہ قدردانی انڈیا آفس لندن اور برٹش میوزیم لندن کے سرکاری کتب خانوں میں بھی رکھی گئی تھی۔

## تصانیف :-

مخزن الادویہ ڈاکٹری بن یا میدیا میدیکا با تصویر۔  
اس کتاب کی دو جلدیں ہیں جلد اول کی ضخامت تقریباً ایک ہزار ایک سو صفحات پر مشتمل ہے جلد دوم کی ضخامت تقریباً ایک ہزار چار سو بیس صفحات کی ہے۔ ڈاکٹری کی علم الادویہ پر یہ ایک نہایت ہی جامع و مفید کتاب ہے اس کتاب میں امریکہ کی تمام ڈاکٹری مفرد و مرکب ادویہ کی تحقیق اور ان کی لاطینی انگریزی یونانی عربی فارسی سنسکرت ہندی اور اردو ناموں کی صحیح تطبیق کی گئی ہے اور ان کے مفصل افعال و خواص کے علاوہ تقریباً ہر ایک دواء کا طریقہ استعمال بھی لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب علم طب میں درحقیقت ایک نہایت ہی مفید اضافہ ہے۔ چنانچہ ملک کے اکثر نامی گرامی ڈاکٹروں و حکیموں نے اس کتاب کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

اس کتاب کی ایک ایک جلد نہ صرف انڈیا آفس لندن برٹش میوزیم شاہی کتب خانوں نیز امپریل لائبریری کلکتہ شاہی کتب خانہ کلکتہ اور میڈیکل کالج لاہور کی زینت بنی ہیں۔ جو درحقیقت باعث امتیاز و افتخار ہیں۔

## ۲۔ مخزن حکمت یا گھر کا ڈاکٹر و حکیم :-

طب خانگی پر اردو زبان میں یہ ایک لاجواب و بے مثال کتاب ہے جس کے پندرہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کی ضخامت ایک ہزار سو صفحات ہے۔

۳۔ تاریخ الاطباء :- اس کتاب میں مشرق و مغرب کے متقدمین و متاخرین

مشاہیر اطباء یعنی حکیموں و تیبوں اور ڈاکٹروں کی زندگی کے دلچسپ طبی حالات طبی خدمات و تجربات نیز انکشافات کا بالوضاحت بیان ہے۔ اس کتاب کی ضخامت تقریباً نو سو صفحات ہے۔

- ۴۔ علاج بالمفردات یونانی و ڈاکٹری :- چھ سو صفحات کی ضخامت ہے۔
- ۵۔ ہندوستان کی جڑی بوٹیاں :- ایک ہزار صفحات کی ضخامت ہے۔
- ۶۔ لغات الادویہ :- سات یا آٹھ سو صفحات کی ضخامت ہے۔
- قاموس طبی ۔ عربی و فارسی یونانی لغات طبیہ کی ایک جامع کتاب۔

## وفات :-

افسوس کہ فوری ۱۹۲۶ء کو آپ اس عالم فانی سے رگڑا سئے عالم جاودانی ہوئے۔

## طبی معرکے :-

آپ کے لاہور تہ ان نیز دیگر مقامات کے مجربات و شاہکار علاج کی فہرست طویل ہے۔ مندرجہ ذیل واقعہ لاہور کا ہے۔

ایک مرتبہ یہ لاہور کے ایک لیڈر صاحب کو دیکھنے کے لئے ان کے گھر تشریف لے گئے جو تین چار ماہ سے جوڑوں کے درد میں مبتلا اور چلنے پھرنے سے بالکل معذور تھے۔ آپ نے ان کو بغور دیکھنے کے بعد نبض دیکھی۔ ہاتھ اور پیر کی انگلیوں کے جوڑ گھٹنے اور گھٹنی کے جوڑ سب سوجے ہوئے تھے۔ درد اور ہلکا سا بخار بھی رہتا تھا۔ پیاس زیادہ لگتی تھی۔ بھوک بہت کم قبض مسلسل رہتا تھا۔ رفع حاجت کے لئے بھی دو روز کے محتاج نظر تھے۔ حکیم غلام جیلانی صاحب نے ”وجع مناعمل بسبب قبض و ریاح“ قرار دیکر سب ذیل نسخے تجویز کیا۔ اور مندرجہ ذیل ادویہ کو ایک بڑے پیلے میں یکوا کر مریض کو اس میں یعنی ٹب میں پانی گنگنا کر کے بھایا۔

- سورنجان ایا راج ۔ شیطرج ہر ایک ۲ تولہ۔
- ترید نقشہ ۔ تخم منطل سناہ مکی ہر ایک ۲ تولہ
- افلیسوں اینوں ۔ تخم گرشہ ہر ایک ۲ تولہ۔

مقل دس ماشہ سب ادویہ کو باریک کوٹ چھان کر آب گنگنا میں چنے کے برابر گولیاں بنائیں اور یہ پانچ ماشہ گولیاں رات کو سوتے وقت گرم پانی سے کھالیا کریں۔ اور مندرجہ ذیل روغن مالش کے لئے دیا۔

## روغن اکسیر و جمع مفاصل :-

سورنجان تلخ ۵ تولہ - قط تلخ فوہ - زرد چوب - دارہلا - ہر ایک ۳ تولہ - فوج ترکی عود صلیب - دارچینی - سبل الطیب یا یونہ ہر ایک ۲ تولہ سب دواؤں کو باریک کوٹ کر ۲ سیر پانی میں دو دن بھگو دیں پھر اتنا پکائیں کہ پانی آدھا رہ جائے۔ اس کو تل کر چھان لیں اور اس میں تل کا تیل پچاس تولہ شامل کر کے خوب جوش دیں۔ جب پانی جل جائے اور صرف تیل رہ جائے تو چھان کر بوتل میں بھر لیں۔ کا فور ۲ تولہ روغن تارپین دس تولہ میں حل کر کے اسی تیل میں شامل کر کے حفاظت سے رکھ لیں یہ تیل گرم گرم مالش کر کے گرم گرم روٹی باندھنے کی ہدایت کی گئی۔

ترش و سرد غذاؤں سے پرہیز بتایا گیا۔ ایک ہفتہ کے بعد دوبارہ حکیم صاحب نے مریض کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پہلے سے بہتر ہیں۔ درد کم ہے۔ اجابت روز ہو جاتی ہے، اٹھ کر بیٹھنے میں اب پہلی سی تکلیف نہیں ہے۔

یہی دوا تین دو ہفتے مزید جاری رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ تیسرے ہفتہ خود مریض حکیم صاحب کے مطب میں حاضر ہوئے۔ خوشی کا اظہار فرمایا۔ اور مبارکباد دی کہ اتنے تکلیف دہ مرض پر آپ نے اتنی جلدی اور آسانی سے قابو پالیا۔ طاقت کی دوا کی فرمائش کی۔

ایک ہفتہ کے بعد حکیم صاحب نے یحییٰ سے معجون اذراقی ۵ ماشہ صبح و شام کھانے کو مزید بتا دی۔ اس کامیاب علاج سے لیڈر صاحب صحت یاب ہو گئے۔ اور انہوں نے حکیم غلام جیلانی صاحب کے طریقہ علاج اور دستِ شفا کی بہت تعریف کی۔

آخر میں آپ کو اعزازی طور پر آپریٹور ویدک اینڈ یونانی طبی کالج دہلی کے بورڈ آف ایگزامینرز مجلس منتخنین کے ممبر نیز کالج مذکور کی ٹیکسٹ بک کمیٹی و مجلس معین

نصاب تعلیم کے ممبر اور جماعت ہائے مدرسہ طینیہ دہلی کے ممتحن اور جماعت زہدہ الحکماء  
 و عمدة الحکماء و حکیم حاذق متعلقہ اسلامیہ کالج لاہور کے بھی ممتحن رہے  
 تھے۔



# شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن خاں خونزادہ

۶۱۹۲۷  
ھ۱۳۶۶

اُردو ادب بنگال کا

۶۱۸۸۱  
ھ۱۲۹۷

تابندہ ستارہ

حکماء طب یونانی کے عام طور پر جید عالم و فاضل اور انھوں نے میدان طب میں کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں تو زندگی کے دوسرے شعبوں اور علوم دیگر میں بھی کمال حاصل کیا ہے یعنی دستارِ فضیلت اور خرقہٴ شیخت دونوں ایک جسم پر آراستہ رہے ہیں۔

ایسی شخصیتوں میں ایک نمایاں شخصیت شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن خاں آنخون زادہ ڈھاکہ کی بھی ہے۔ جس نے طب کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں بھی تاریخ ساز کام کیا ہے۔

خاندان :-

آپ کا خاندان نسباً فاروقی اور وطناً یاغستانی علاقہ صوبہ سرحد کے مشہور قبیلہ پوسف زئی کے پٹھان طبقہ سے متعلق تھا۔ ان کے والد محترم الحاج مولانا محمد خان شاہ آنخون زادہ جنکلہنی واقع صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے اور مولانا عبدالحمی فونگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے تھے جو لکھنؤ سے ہجرت کر کے ڈھاکہ اپنے ماموں محمد نعمان کے وہاں بنگال تشریف لائے اور ڈھاکہ میں شادی کر کے نوبد و باش اختیار کر لی تھی اور اس تقریب سے سرحد ہند کی یہ



دولت بنگال کی قسمت میں آئی تھی۔

پیدائش :-

جادو نگار ادیب اور نادرہ روزگار طبیب حکیم حبیب الرحمان خاں آنخون زادہ کی ولادت باسعادت ۲۳ مارچ ۱۸۸۱ء کو مطابق ۲۹۸ھ کو ڈھاکہ میں اس تاریخی قبیلہ کے گھرانہ میں ہوئی تھی۔

تعلیم و تربیت :-

مولانا ظفر احمد تھانوی کے مطابق آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے پدر بزرگوار کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ مزید تعلیم کے لئے سرکاری مدارس کی شکل دیکھی۔ اور بعد میں تکمیل تعلیم کے لئے صوبہ بونپ کے مشہور شہر کان پور کا سفر کیا۔ ابتدائی صرف و نحو کے لئے کچھ اسباق حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے جب وہ کان پور میں دے رہے تھے حاصل کی جس کا خاتمہ ۱۳۱۵ھ میں ہوا۔ زیادہ تر درسیات و تعلیم مولانا محمد اسحاق بردوانی سے حاصل کی۔ معقول مولانا احمد حسن کان پوری اور مولانا عبدالوہاب بہاری سے پڑھیں۔ جب کہ یہ علماء کان پور میں مدرس تھے۔ حدیث مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی سے اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے ایک شاگرد سے حاصل کی اور اجازت لی۔ اس کے بعد آگرہ میں مزید تعلیم حاصل کر کے عربی اسلامیات، منطق فلسفہ اور دیگر علوم میں واقفیت بہم پہنچائی۔ لیکن بقول پروفیسر حسن معصومی لیکچرار فلسفہ اسلام ڈھاکہ یونیورسٹی کے حکیم حبیب الرحمن کی تعلیم آگرہ اور بہار میں ہوئی۔

تعلیم طب :-

طب کی تعلیم مدرسہ طبیبہ دہلی میں حکیم عبدالمجید خان دہلوی المتوفی ۱۹۰۱ء سے حاصل کر کے کمال حاصل کیا۔

۱۹۰۴ء میں تعلیم حاصل کر کے ڈھاکہ واپس آئے اور طبیب کی حیثیت سے

اپنی زندگی شروع کی۔ طبابت کے پیشے سے وابستہ ہونے کے بعد ان کی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے دور دور تک شہرت پھیل گئی۔ اس شہرت اور عظمت کی وجہ سے نواب بہادر سرسليم اللہ آف ڈھاکہ نے آپ کو اپنا طبیب خاص مقرر کر دیا۔ نواب صاحب کو حکیم صاحب سے اس قدر دلی محبت پیدا ہو گئی کہ نواب صاحب کے اپنے ذاتی مسائل کیا سیاسی۔ سماجی مسائل میں حکیم صاحب سے مشورہ لیا کرتے تھے اور اکثر و بیشتر ان کی رائے پر عمل کیا کرتے تھے۔ حکیم حبیب الرحمن کے یہ ذاتی مراسم ڈھاکہ کے دیگر وارثین نواب حبیب اللہ الحاج خواجہ ناظم الدین خواجہ شمس الدین وغیرہ سے گھریلو رہے اور یہ ڈھاکہ کے نوابین جیسا کہ آگے کی تحریر سے معلوم ہو گا کہ ان کے تحریری و ادبی کام میں بہت معاون رہے۔

حکیم صاحب کی تعلیم تمام تر پرانے طرز کی ہوئی تھی مگر فطرت کے خزانے سے وہ ایک ذہین اور لطیف دماغ اپنے ساتھ لائے تھے۔ اپنے اس فطری و فکری ذوق کی مدد سے تاریخ و ادب کی کتابیں پڑھیں اور طب کے بعد جن فنون سے ان کو ذوق رہا وہ بھی تاریخ و ادب تھے۔ اور اسی سلسلے سے وہ مولانا شبلی کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے تھے۔

چنانچہ ۱۹۰۶ء ان کی زندگی کے لئے بڑی اہمیت کا سال ہے اسی سال مولانا شبلی سے جب وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے سلسلے میں ڈھاکہ تشریف لے گئے تھے ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں حکیم صاحب نے مولانا شبلی کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ حاجی خلیفہ کی کشف انسطوں کی طرز پر ہندوستان کے ہر صوبہ کی تصنیفات پر ایک محققانہ کتاب لکھی جائے۔ مولانا نے ان کے اس خیال کی تحسین کی اور بنگال کا حصہ ان کے سپرد کیا۔

بقول علامہ سید سلیمان ندوی "حکیم صاحب کے اکثر خطوں میں ان کی اس تصنیف کی بابت تذکرے ہوا کرتے تھے۔"

سیاسی، سماجی و ادبی خدمات:-

۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام بمقام شاہ باغ ڈھاکہ عمل میں آیا۔

نواب وقار الملک اس کے اول صدر تھے۔ نواب رسولیم اللہ اس کے اول سکریٹری اور حکیم حبیب الرحمن خاں اس جماعت کے اول جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے۔ حکیم صاحب کو اوائل عمری سے آخری دم تک دوسروں کے مفاد کا خیال رہا۔ چنانچہ ڈھاکہ کے مسلمانوں کی اہم خدمات انجام دیں۔

۲۲-۱۹۲۲ میں حکومت بنگال نے ایک کمیٹی بنائی جس کے سکریٹری کرنل حساں سہروردی مرحوم تھے حکیم صاحب اس کمیٹی کے سرگرم رکن رہے۔ اس کمیٹی کا کام یونانی طریقہ علاج پر غور کرنے کے بعد حکومت کو رپورٹ پیش کرنا تھی کہ کلکتہ اور ڈھاکہ میں طبیہ کا قیام سود مند ہو گا یا نہیں۔

کمیٹی کی سفارشات کے بعد حکومت نے طبیہ کالج کے قیام کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا لیکن حکیم صاحب کو لگن لگی تھی اور جذبہ سہروردی رگوں میں موجزن تھا۔ مدارس عربیہ کے تعلیمیافتہ نوجوانوں کے مستقبل کا بھی احساس تھا جس کے لئے حکومت کی راہیں مسدود تھیں۔ چنانچہ ان وجوہ کے پیش نظر انھوں نے بڑی ہمت کر کے جواں مردی اور جذبہ ایثار کی آڑ لے کر ۱۹۲۰ء میں طبیہ حبیبیہ کالج کے نام سے ایک کالج کراہیہ کی عمارت میں قائم کیا۔

اس کالج کے پاس شدہ اطباء، بنگلہ دیش ہندو پاک میں جا بجا مقام پر پھیلے ہوئے ہیں۔ حکیم صاحب کے اخلاق اور علم طب کی قابلیت سے متاثر ہو کر اس کالج کے سالانہ جلسوں میں ملک کی بڑی بڑی اور مایہ ناز ہستیاں نہ صرف شریک ہوتیں بلکہ معاونت بھی فرماتی۔ جن میں سرجون ہوہرٹ۔ مسٹر اے۔ کے فضل الحق مرحوم۔ خواجہ ناظم الدین مرحوم نواب خواجہ حبیب اللہ بہادر مرحوم۔ مسٹر ایچ۔ ایس سہروردی مرحوم خواجہ شہاب الدین مرحوم قابل ذکر ہیں۔ بحیثیت طبیب حکیم حبیب الرحمن آخون زادہ کی سارے ملک میں شہرت تھی چالیس برس تک آپ نے طبابت کی اور لاکھوں لوگوں کو آپ نے فائدہ پہنچایا۔

حکومت ہند نے ۱۹۳۹ء میں حکیم حبیب الرحمن خاں آخون زادے کی طب یونانی کی خدمات اور شہرت دیکھ کر شفاء الملک کا خطاب عطا کیا جو بعد میں آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی ہدایت کے بموجب حکومت کو واپس کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ آپ نے انجمن اطباء مشرقی بنگال و آسام کے نام سے ایک تنظیم اطباء کی قائم کی تھی جس کے آپ تاحیات صدر رہے۔  
۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کی ملی جلی حکومت انٹریمنٹ گورنمنٹ کے دور میں دہلی میں طب یونانی کے فروغ کے لئے وزارتِ صحت نے جوہر کنی کمیٹی بنائی تھی اس کے ایک رکن شفاء الملک مرحوم بھی تھے۔

حکیم حبیب الرحمن کی ادبی حیثیت کا آغاز بھی ۱۹۰۶ء سے ہوتا ہے۔ اس سال انھوں نے ڈھاکہ سے "المشرق" کے نام سے ہفتہ وار رسالہ نکالا۔ پھر "جادو" کے نام سے ایک اور ادبی و علمی رسالہ جاری کیا اس کے ساتھ ہی ساتھ "معارف" کے ابتدائی پرچوں میں بھی ان کے مضامین چھپے تھے۔  
مرحوم حکیم صاحب کے قلم میں بڑی لطافت تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد کی نقالی کسی سے نہ ہو سکی۔ لیکن تھوڑی بہت اگر کسی سے ہوتی ہے تو عجیب بات ہے کہ وہ بنگال ہی کے جادوگر ان ادب سے ہو سکی ہے ان میں پہلا نام نصیر حسین خاں کلکتہ کا اور دوسرا نام حبیب الرحمن ڈھاکہ کا ہے۔

ان کو اردو ادب اور بنگال کی تاریخ سے خاص ذوق تھا اور اس مقصد کے تحت مرحوم نے انجمن ترقی اردو مشرقی بنگال و آسام کے نام سے ایک ادبی ادارہ قائم کیا تھا۔ اس ادارے کے تحت طبیبہ حبیبہ کالج میں برابر مشاعرے اور جلسے ہوا کرتے تھے جن میں ممتاز شعراء ادیب اور عمائدین شہر برابر شرکت کیا کرتے تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ حکیم شفاء الملک صاحب مرحوم آل انڈیا ریڈیو سے بنگال کی خصوصیات پر برابر تقاریر نشر کرتے تھے۔ حکیم صاحب ان تقاریر کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے مگر شرط یہ تھی کہ محکمہ نشریات ان کو کتابی شکل میں شائع کرے گا جس سے آئندہ کی نسلوں کو فائدہ ہو۔ حکیم صاحب کی آل انڈیا ریڈیو سے جن موضوعات پر نشریات ہوتیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ڈھاکہ اب سے پچاس سال پہلے۔

(۲) مساجد ڈھاکہ۔

(۳) کچھ پرانی باتیں۔

(۴) تاریخ شعراء اولیائے بزرگان دین۔

(۵) ڈھاکہ کی عمارات۔

(۶) ڈھاکہ کے قدیم خاندان اور ان کے رسومات۔

(۷) شائستہ خان کا بند دروازہ۔

## تصانیف :-

سر بڑے حکیم اور ادیب کی طرح حکیم صاحب نے بھی متعدد شاہکار سپہ قلم کئے ہیں۔ بنگال کی تاریخ اور اس کے جغرافیائی خصوصیات اور نقشے پر حکیم صاحب کو مکمل عبور حاصل تھا۔ بنگال سے متعلق "ثلاثہ غسالہ" کا نام انھوں نے حافظ شیرازہ کی اس نغزل سے کیا تھا جس کو حافظ شیرازہ نے سلطان بنگالہ کے نام لکھ کر بھیجا تھا۔

سے زمین فندپارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اسی نغزل کا ایک ٹکڑا ہے "ثلاثہ غسالہ می رود" الفاروق اور "حیات سقراط ان کی طالب علمی کے رسالے ہیں۔ ان کی دیگر تصنیفات کے نام مساجد ڈھاکہ، ڈھاکہ اب سے پچاس برس پہلے، شعرائے ڈھاکہ وغیرہ ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری حصے میں انھوں نے اپنی مشہور کتاب "آسودگان ڈھاکہ" تحریر کی تھی جو ۱۹۴۶ء کے آخر میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں ڈھاکہ کی سرزمین میں مدفون بزرگان دین کے مزارات کی تحقیق اور تذکرے ہیں اس کے بعد آسودگان ڈھاکہ کا مصنف خود ڈھاکہ کی خاک میں آسودہ ہو گیا۔ حکیم صاحب کو قدیمی سکوں کے جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ نومبر ۱۹۳۰ء میں دو سو گیارہ سکوں کا عطیہ ڈھاکہ کے عجائب گھر کو دیا گیا جو مہتمم عجائب خانہ نے ۱۹۳۶ء میں ایک کتاب سکوں کی با تصویر شائع کی اور بعد میں حکیم صاحب کی تصویر کے ساتھ ایک ڈاک ٹکٹ بھی شائع ہوا۔

حکیم صاحب کا ایک ذاتی کتب خانہ بھی تھا جس میں اردو عربی فارسی کی نایاب

اور بیش قیمت کتابیں تھیں۔ جوان کے انتقال کے بعد کچھ کتابیں ڈھا کہ یونیورسٹی کی لائبریری کو ڈاکٹر و جاہت حسین عندلیب شادانی پروفیسر شعبہ اردو و فارسی کی معرفت دے دی گئی تھیں۔ ان کی بیگم صاحبہ نے حکیم صاحب کی وصیت کے مطابق خاندان کے لوگوں کے سامنے بغرض اشاعت و طباعت حکیم صاحب کے تحریر کردہ کچھ کتب کے نسخے ڈاکٹر شادانی کو دے دیئے تھے بد قسمتی سے ڈاکٹر شادانی صاحب بھی کچھ عرصہ بعد مرحوم ہو گئے اور ان مسودات کا کیا حشر ہوا یہ نہ معلوم ہو سکا۔

## وفات :-

مگر آہ وہ مسیحا نفس جو دوسروں کو موت کے پنجے سے چھڑایا کرتا تھا آخر ایک دن وہ آیا جب وہ خود اس کے پنجے میں گرفتار ہوا۔ مرحوم کو کئی ماہ پیشتر اس آنے والے حادثہ کا علم جیسے ہو گیا تھا۔ بعض احباب سے تذکرہ اس بابت کر چکے تھے کہ میں جب جاؤں گا دفعتاً جاؤں گا۔ جس دن (۲۳ فروری) یہ واقعہ پیش آیا حسب معمول صبح کو بیدار ہو کر اپنے روزمرہ کے کاموں میں شریک ہوئے اور مطب میں مریضوں کو انہماک سے دیکھا۔ مغرب کے بعد نشست گاہ میں بیٹھ کر دوستوں سے باتیں کیں جو مختلف موضوعات پر تھیں۔ اثنائے گفتگو میں معلوم کیا کہ آج مولانا عثمانی ڈھا کہ میں تشریف نہیں رکھتے؛ ان کو اپنی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوچ کا وقت قریب ہے اس لئے کچھ وصیتیں بھی کر چکے تھے جن میں ایک یہ تھی کہ میری نماز مولانا ظفر احمد تھانوی پڑھائیں اور اگر وہ نہ ہوں تو پیر جی عبدالوہاب مہتمم مدرسہ اشرف العلوم پڑھائیں۔

شومی قسمت کہ مولانا عثمانی اس دن کہیں باہر تھے۔ ۳ تین بجے شب کو قلبی دورہ پڑا۔ طبیب کے لئے آدمی گیا ان کے آتے آتے مسافر عالم بالا کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ آنا فانا خبر شہر ڈھا کہ وگرد و نواح میں پھیل گئی۔ صبح کو تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ جنازہ میں مجمع اتنا کثیر تھا کہ شرکاء جنازہ و سامعین کہتے ہیں کہ شاید کسی کے جنازہ میں اتنا اثر دام رہا ہو۔ حسب وصیت نماز جنازہ پیر جی عبدالوہاب نے پڑھائی اور تدفین عظیم پور دائرہ شریف کے قبرستان میں انجام پائی۔ ان کی

قبر ان کے والد مرحوم کی پاننتی ہے۔ اس مقصد کے لئے یہ اپنی حیات ہی میں زمین خرید چکے تھے۔

ان کے جنازہ میں ہر طبقہ کے افراد شامل تھے اور سوگ میں ڈھاکہ کے ہر طبقہ کا بازار بند رہا۔

ادباء و شعراء نے اپنے اپنے طور پر قطععات، تاریخ و مرثیہ کہے۔ اور اہل قلم نے متعدد اخبار میں نذرانہ پیش پیش کیے۔

فروری آئی ہے پھر یادِ حبیب آنے لگی  
خدمتِ انسانیت کا ایک سہا پتھے حبیب  
کارِ بہدردی شفاء الملک کا تھا مشغلہ  
آپ کی مسکین نوازی دیکھ کر اقوامِ غیر  
ہے فنِ طب پر جو احسان آپ کا بنگال میں  
چشمِ پر غم رنج و غم سے اشک برسائے لگی  
بات جیسی تھی زبانِ خلق پر آنے لگی  
روحِ اہلِ خیر دیکھو و جد میں آنے لگی  
خلق ڈھاکہ آپ کے بہ وقت گن گئے لگی  
کیا بتاؤں غم سے بچکی پے بہ پے آنے لگی

دیکھو مزاب زبان کھولو نہ اپنی چپ رہو  
کالی کالی قلب پر غم کی گھٹا چھانے لگی

مصنف سیرۃ النبی سید سلیمان ندوی ماہر و فیات نے ان کی وفات پر لکھا کہ  
”جسبتی۔ دوستوں نے تمہارے لئے مرثیے لکھے۔ احباب نے  
تمہارے فراق میں آہ جگر سوز کھینچی۔ جاننے والوں نے تمہارے اوصاف  
گنائے۔ ماننے والوں نے تمہارے احسانات یاد کئے مگر تم اس دنیا  
میں ہو جہاں اس دنیا کی مدح و ستائش کی حکایتیں نہیں پہنچتیں مغفرت  
کی دعا میں تمہارے لئے ہیں غفور و رحیم ان کو قبول فرمائے۔“ آمین۔

پسماندگان :-

بعد انتقال ایک وسیع حلقہ احباب سوگواروں کا اور کچھ چار صاحبزادے  
و دو صاحبزادیاں حیات چھوڑی تھیں۔

1۔ الحاج حکیم ارتضیٰ الرحمن خان صاحب آنخون زادہ پرنسپل طبیہ حبیبیہ  
کالج ڈھاکہ۔

۲۰، حکیم حاتم الرحمن خان آخونزادہ۔ آپ طبیہ حبیبیہ کالج کے پرنسپل رہ چکے ہیں اور آپ کا مطب بڑا دواخانہ کے نام سے نیو مارکیٹ ڈھاکہ میں ہے۔  
 ۲۱، اجنباء الرحمن صاحب جو ایل۔ آئی۔ سی میں اعلیٰ عہدے پر تھے۔  
 ۲۲، اصطفاء الرحمن خاں۔

حکیم صاحب کا دستہ خوان بہت وسیع تھا۔ ہر کھانے کے وقت احباب کا مجمع لگا رہتا تھا۔ ان احباب میں مولانا ظفر احمد عثمانی خواجہ شہاب الدین سید محمد طیفور۔ ڈاکٹر محمود حسن سابق چیئر مین پبلک سروس کمیشن ڈاکٹر محمود حسین خاں قابل ذکر تھے جا بجا تذکروں میں حکیم صاحب مرحوم کے دستہ خوان کا ذکر بار بار آیا ہے۔ جس میں نہاری شب دیگ۔ حکیم قبولی۔ مرغ کباب۔ مرغ پلاؤ۔ زعفرانی۔ بل کباب۔ کشمیری سالن۔ شکاری سالن۔ حکیم صاحب کے دستہ خوان کی خاص ڈشیں ہوا کرتی تھیں جس کو وہ بڑے اہتمام سے پکواتے اور کھلانے میں مسرت حاصل کرتے تھے۔

معر کے :-

بعض دفعہ تو مریض کی تشخیص و تجویز اور علاج بلوگوں کو حیرت میں ڈال دیتا تھا۔ اکثر و بیشتر صورت دیکھ کر یا آواز سن کر اور وہ بھی ریڈیو کی آواز سن کر مریض کا مرض اور اس کا علاج بتلا دیا کرتے تھے اور مریض اس پر عمل کر کے صحت یاب ہو جایا کرتے تھے۔

مرحوم طبیب اور حاذق طبیب تھے قیافہ اور نباضی میں حد درجہ کمال رکھتے تھے۔

۱۹۴۴ء میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی علالت کا حال مولانا ظفر احمد عثمانی سے سن کر مرض کی تشخیص کی اور دوا تجویز کی۔ جب تھانوی سے خطرناک حالت کی اطلاع آئی تو کہا کہ اب دوا بیکار ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وقت آخر آ پہنچا اور آخر جیسا انھوں نے کہا ویسا ہی ہوا۔  
 ایک بار ان کے ایک مریض دہلی تشریف لے گئے اور اپنے مرض کے سلسلے میں



مسیح الملک جناب حکیم حافظ محمد اجمل خان سے رجوع کیا۔ حکیم صاحب نے فرمایا۔ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ جواب ملا کہ ڈھاکہ سے۔ اس پر مسیح الملک صاحب نے فرمایا۔ اباب حکیم حبیب الرحمن صاحب وہاں تشریف نہیں رکھتے۔ اس کے بعد انھوں نے نسخہ لکھ دیا۔ اس نسخہ میں اور حکیم حبیب الرحمن کے نسخے میں سب سے بڑا فرق نہیں تھا۔

حکیم صاحب کی طبی حذاقت کا ایک واقعہ خود علامہ سید سلیمان صاحب ندوی صنف سیرۃ النبی سے منسوب ہے۔ لکھتے ہیں کہ:-

”و کئی سال کی بات ہے۔ میں نے ریڈیو پر ایک تقریر کی۔ مرحوم نے ڈھاکہ سے لکھا۔ میں نے ریڈیو پر آپ کی آواز سنی جو آپ کے ضعف قلب کا اعلان کر رہی تھی۔ اس کی خبر جلد لیں۔ چنانچہ چند روز کے بعد ہی مجھے اسی قسم کے سخت مرض کا سانحہ پیش آیا جس سے اللہ تعالیٰ نے جانبری فرمائی۔“

غرض کہ ایسے ایسے قابل عالم فاضل طبیب گذرے ہیں جو ادب کا میدان دیباچہ کا۔ دونوں مقامات پر ان کی حیثیت امر مسلم ہے۔

# حکیم محمد ہادی رضا خاں ماہر

۶۱۹۲۳

۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء

(ماہر سرجن طبیب)

سرزمین لکھنؤ کو علوم و فنون علاج و معالجہ شع و ادب کی وجہ سے خصوصی مقام حاصل رہا ہے اور اسی مرکزیت کی وجہ سے دور دراز مقامات سے علماء و فضلا نیز اطباء ہجرت کر کے لکھنؤ منتقل ہوتے رہے تھے۔

خاندان :-

ان ہی اوقات میں حکیم محمد ہادی رضا خاں کے پردادا حکیم مولوی حاجی محمد علی رضا ۱۸۱۵ء میں ایک بہت مشہور زمانہ طبیب تھے جو کشمیر کی جانب سے لکھنؤ آکر آباد ہو گئے تھے۔ اور ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں و مہاراجاؤں کا کامیاب علاج کر کے خاص و عام میں بہت ہر دل عزیز ہو گئے تھے۔ ان کے صاحبزادے حکیم مولوی محمد حسن رضا ۱۸۲۵ء میں اپنی فنی قابلیت اور تجربہ کی بنیاد پر راجہ صاحب بنارس کے طبیب خاص ہو گئے تھے اور اپنے زمانے کے طبیب اعظم مشہور تھے۔ حکیم مولوی محمد حسن رضا کے دو صاحبزادے تھے۔

۱۔ حکیم مولوی احمد رضا خاں۔

۲۔ حکیم مولوی محمد حسین رضا خاں۔

آپ کے والد بزرگوار حکیم مولوی محمد حسین رضا خاں ۱۹۰۱ء میں والی ریاست



ماہر سرحد حکیم نعت دہادی رضا خان صاحب مرحوم

رام پور نواب کلب علی خاں صاحب بہادر کے طبیب خاص مقرر ہو گئے تھے اور ریاست  
رام پور میں نواب کلب علی خاں صاحب بہادر کے زمانے میں عرصہ تک افسر الاطباء  
یعنی ڈائریکٹر رہے۔ آپ کے بڑے بھائی حکیم محمد احمد رضا خاں کا مطب ریاست  
رام پور میں بہت کامیاب تھا اور مطب میں مرضاء کا مجمع لگا رہتا تھا۔

حکیم محمد رضا خاں نے بڑے معرکے کے علاج کئے تھے۔ ان معرکے کے علاجوں  
سے متاثر ہو کر ہی نواب صاحب نے ان کو رام پور کے سرکاری شفا خانوں کا ڈائریکٹر  
مقرر کیا تھا۔

حکیم مولوی محمد حسین رضا خاں کو درس و تدریس کا بڑا شوق تھا۔ آپ کے  
ذاتی مطب میں طالبان فن طب کا ہمیشہ مجمع رہتا تھا۔ دور دور سے شائقین فن طب  
تحصیل علم کی غرض سے حکیم حسین رضا کی خدمت میں آتے تھے۔ درس و تدریس کا  
حلقہ جب زیادہ وسیع ہو گیا تو ۱۹۰۲ء میں حکیم مولوی محمد حسین رضا نے صوبہ کے  
مرکزی مقام لکھنؤ میں ایک طبی درسگاہ ”بنام ”منج الطب کالج“ کی بنیاد رکھی اور  
باقاعدہ طلباء کے داخلے و تعلیم کا انتظام کیا۔ لکھنؤ کے مشہور و معروف طبی خانوادہ  
خاندان عزیز جھوائی ٹولہ کا آپ کے خاندان رضائی سے گہرا تعلق رہا ہے۔ خاندان  
رضائی کی کئی صاحبزادیاں خاندان عزیز میں منسوب ہو کر گئیں تھیں۔ چنانچہ لکھنؤ کے  
مشہور طبیب شفاء الملک حکیم عبد المعید صاحب مرحوم کی والدہ محترمہ حکیم محمد حسین رضا  
خاں کی ہمیشہ تھیں۔

پیدائش :-

آپ کی پیدائش یوپی کے مشہور شہر ادب لکھنؤ کے مرکز طب و علم جھوائی ٹولہ  
۱۳ اکتوبر ۱۸۸۸ء مطابق ۲۶ محرم ۱۳۰۶ھ بروز چہار شنبہ کو ہوئی۔

تعلیم و تربیت :-

حسب توقع تعلیم کی ابتداء گھر سے ہوئی۔ والد کے ریاست رام پور سے وابستہ  
ہونے کی بناء پر گھر پر ابتدائی اردو فارسی اور کچھ انگریزی کی تعلیم ہوئی۔ آپ بچپن

سے ہی بڑے ذہین چست اور محنتی ہونے کے ساتھ انتہائی باہمت و خداداد قابلیت کے حامل تھے۔ اردو فارسی انگریزی نیز قرآن پاک کی ابتدائی تعلیم سے فراغت کر کے پرائیویٹ طور پر انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۱ء میں انگریزی تعلیم ترک کر کے منطق، فلسفہ اور عربی و فارسی کی تعلیم کی جانب متوجہ ہوئے۔ مولوی غلام محمد پنجابی سے عربی حدیث و نحو اور فلسفہ کی تعلیم شروع کی اور بعض کتب ادب مولانا محمد طیب عربی مکتی سے پڑھیں۔ علوم عربیہ میں آپ کو فخر الاساتذہ حضرت مولانا محمد عبدالغفار مرحوم رام پوری اور اساتذہ مولانا حاجی حافظ ابوالفضل محمد فضل حق پرنسپل مدرسہ عالیہ ریاست رام پور سے تلمیذیت کا فخر حاصل کیا۔

طبی تعلیم :-

۱۹۰۳ء سے اپنے پیر محترم حکیم محمد حسین رضا خاں سے باقاعدہ علم طب کی تعلیم حاصل کی اور جو جو کتب طب آپ پڑھتے جاتے تھے وہ وہ کتب طب طبی طلباء کو پڑھاتے بھی جاتے تھے۔

۱۹۰۸ء میں آپ کی طبی درسیات ختم ہو گئیں اور آپ کے والد بزرگوار نے اپنے دست مبارک سے سند فراغت عطا کی۔ آپ نے ریاست کے سرکاری کتب خانے میں قلمی کتب طبیبہ و نحو اشغیغیہ مطبوعہ کا گہرا مطالعہ فرمایا۔ ۱۹۰۹ء میں آپ کے والد افسر الاطباء حکیم محمد حسین رضا خاں کا انتقال ہو گیا اور طبی درجہ کا مطالبہ کی ساری ذمہ داریاں آپ پر ہی آن پڑیں۔

نام :-

آپ کو حکیم نواب محمد بادی رضا خاں کے نام سے مخاطب کیا جاتا تھا۔

قومیت :- آپ نسبی طور پر کشمیری نسل ہیں۔

مذہب :-

آپ سنی حنفی العقائد تھے اور یہی مسلک آپ کے اجراء کا تھا۔

## شعری و ادبی ذوق :-

حکیم ہادی رضا کو شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ ماتہ تخلص فرماتے تھے اور بہت باذوق شاعر تھے۔ مرکز شعر و ادب لکھنؤ کی اہم علمی و ادبی نشستوں میں شہرت فرماتے تھے اور داد و تحسین سے سرفراز کئے جاتے تھے۔ حکیم ہادی رضا کا شعری مجموعہ ان کے صاحبزادے حکیم محمد صابر رضا ادیب کی کوششوں سے ان کے انتقال کے بعد کلام ماہر کے نام سے زیور طباعت سے مرتب ہوا جس پر تعارف یوپی کی معروف شخصیت الحاج حضرت مولانا افتخار چوہانی واریٹی نے اور کلام پربندہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صدر شعبہ اردو فارسی لکھنؤ یونیورسٹی نے کیا تھا۔ حکیم صاحب نے حمد و نعت نغزلیات قطعات قطعات تاریخ نیر سیاسی الہام سے نظمیں کہی تھیں۔ حکیم صاحب کے شعری مجموعہ کی اشاعت پر حکیم مولوی عبد الحلیم خان ہما فاضل و کامل بجنوری نے مندرجہ ذیل قطعہ کہا تھا۔

مہارت کاملہ کا بہتر نمونہ سمجھو "و کلام ماہر"

۶۱۹۶۹

## شاگرد :-

حکیم ہادی رضا نے شعر و شاعری میں کسب فیض سخن حضرت علامہ افتخار چوہانی سے حاصل کیا تھا۔ خان رام پور کا خاندانی لقب ہے اور خواجہ بوجہ والدین کے صحیح النسب کشمیری ہونے کے جواہل کشامرہ کا علمی و بزرگی و مسداری اہل علم ہے۔

حکیم ہادی رضا نے بہت تھوڑا کہا ہے اور جو کچھ کہا ہے وہ بہت کتب ماہرہ مقولہ ہے کہ وہ یہ دیکھو کیا کہا ہے یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا ہے اس کے بقول حکیم ہادی رضا اگر حمد باری میں دعا کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔

اور نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

اللہ اللہ در دل کی سے دوا  
اللہ اللہ ہے فقیروں کی صدا  
اللہ اللہ میں عجب دیکھی شفا  
اللہ اللہ ہے غریبوں کی ندا

اللہ اللہ سے بڑا مشکل کُشا اللہ اللہ سب کا بے حاجت روا  
اللہ اللہ باعث ایجاب وخلق اللہ اللہ سامع فریادِ خلق  
اللہ اللہ دین سے ایمان ہے اللہ اللہ تفرسیوں کی جان ہے  
شوق و محبت کے ساتھ ساتھ مدح صحابہ یارِ حسین منقبتِ عرضہ بہر میدان  
ہیں کچھ نہ کچھ کہا ہے اور خوب کہا ہے۔

متفرقات میں قطعاتِ رباعیات - قطعاتِ تاریخی بھی کہے ہیں۔  
سامنے مرے ذرا بیٹھے تو جائے کوئی نہ کرے بات تو صورت ہی دکھائے کوئی  
حال جو دل کا ہے کیا تم کو بتائے کوئی کس لئے جانِ مصیبت میں پھنسانے کوئی  
میں نے غیروں کو جو دیکھا تو کہا اس نے مرے گھراب نہ خدا کے لئے آئے کوئی  
جل کے بولے جو کیا میں نے سوال بوسہ تو وہ ہے تجھ سے تو بس منہ نہ لگائے کوئی  
شکوہ غیر پہ منہ پھیر کے ظالم نے کہا جو جلے ہم سے اسے کیوں نہ جلائے کوئی  
روزِ سہرا بتا ہے جو روٹھے والے ٹھہرا کیا کرے ایسے کو جس طرح منائے کوئی  
اپنی آنکھوں کو اٹھا کر یہ کہا غیب سے میری محفل میں خبر دار نہ آئے کوئی

تو ہی جب بھول گیا کوچہ جانانِ مسابہ  
تجھ کو دیوانہ سے جو راہ بتائے کوئی

۱۹۲۶ء میں منبج الطب طبیہ کالج کے سالانہ جلسہ کے مشاعرے میں ایک  
ایک مطلع پڑھا تھا جو اللہ والوں کے کام کا تھا اور بعض نے تو اسے مناجات میں  
شامل کر کے وظائف تک میں برابر استعمال کیا۔ جو مطلع پڑھا وہ مندرجہ ذیل ہے۔  
رحمتِ پکارتی ہے کہ دستِ دعا نہیں  
بابِ کرم کھلا ہے کوئی مانگت نہیں

اس سالانہ جلسہ و مشاعرے میں جب جلسہ تقسیم اسناد ہوا تو نواب سہرا احمد  
سعید خاں صاحب آف چیٹاری اسٹیٹ گورنریوں نے صدارت فرمائی تھی۔  
حکیم بادی رشتہ کے دیگر مشاغل میں شعرو شاعری کا شغل بھی داخل و شامل  
تھا جس سے وہ اکثر و بیشتر تفریحِ طبع بھی حاصل فرماتے رہتے تھے اور یہی ایک  
ایسا شغل تھا جو ان کی دوسری افکار و پریشانیوں کا ازالہ کھلائے جانے کا مستحق

ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

اپنے برادرِ نسبتی کے عقدِ سعید پر جو حسب دستور سہرا لکھا اور بموقعِ حاجت پڑھا تھا تو سنتے والے سنتے تھے اور سر دھنتے تھے۔

سر سے باندھا ہے جو ترے قدر کے برابر سہرا  
ڈھل گیا نور کے سانچے میں سہرا سہرا  
نہ بنے اُن سے بھی ہرگز ترا گزبھ سہرا  
زہرہ گاتی ہے خوشی سے جو فلک پر سہرا  
یوں ترے روئے درخشاں سے منور سہرا  
طرہ سہرے سے فزون طرہ سے بڑھ کر سہرا

اپنے سہرے کی گھڑی تجھ کو مبارک ہو رشید

تیرے ماترے نے کیا ختم دعا پر سہرا

حکیم ماترے کے زمانے میں لکھنؤ جو نہ صرف مرکزِ علم و ادب تھا بلکہ علوم و فنون اور علاج و معالجہ کا معتبر اور منفرد مقام تھا اس وقت وہاں زبانِ دانی پر زور طبع زیادہ صرف کیا جاتا تھا۔ اس کے نمونے جا بجا کلامِ ماہر میں موجود ہیں۔ مستند روایاتِ شعری سے انحراف ان کے یہاں قطعی نہیں ہے لیکن اس روایتی شاعری میں بھی باوجود مصروفیت کے حکیم ہادی رضا ماترے نے بعض اشعار نہایت روایتی تسلسل اور خوب صورت انداز میں پیش کئے ہیں۔

دنیا میں آ کے شانِ بشر کچھ نہ پوچھیے  
سب کچھ ہے اختیارِ نگر کچھ نہ پوچھیے  
(۲) رسائی میرے تخیل کی رنگِ دلوتک ہے  
مجھے حقیقتِ فصلِ بہار کیا معلوم

(۳) کیا جانے کسی امید کے پردے میں بے خودی

محو نظارہ ہو گئی بستی کے تو اب ہیں

(۴) ماہر اسی کا نامِ فہمِ حیات ہے انسان کو اپنی موت کی پروا ذرا نہیں

اگر حکیم ہادی رضا کی حیات کچھ اور وفا کرتی تو وہ اس چمنِ زار میں اور بھی خوب صورت گل کھلا سکتے تھے۔ کیونکہ کلامِ ماترے میں موجود ان کی غزلیاتِ نظمیں

قطعاً اور فنِ تاریخ گوئی اس بات کی غمازی کرتی ہیں اور شاید ہیں۔

حکیم ہادی رضا کو نہ صرف شعر و شاعری سے بلکہ ادبِ طب سے ایک گونہ



محبت تھی۔ پروفیسر ڈاکٹر نور الحسن برہنہ نے کہا تھا کہ وہ اس موسیقی کے ایک ممتاز فرد تھے۔ جب شعر گوئی اور سخن سنجی ہماری تہذیب اور شائستگی کا ایک جزو لاینفک سمجھی جاتی تھی۔ کوئی کسی علم و فن میں دستگاہ رکھتا۔ سخن گوئی کا ذوق یا سخن گوئی کا ذوق نہ رکھتا تھا۔ حکیم صاحب پیشہ کے اعتبار سے تو طبیب تھے لیکن طبیعت اور تہذیب سے کوئی مناسبت تھی۔ طبیعتی مناسبت نہ بھی ہوتی تو بھی وہ اس فن کو پیشہ پیش میں نامیابی کے لئے ضرور حاصل کرتے۔ کیونکہ یہ فن ایک علم مجلسی بن چکا تھا۔ حکیم صاحب نے بھی اپنی صداقت کے ساتھ ساتھ اپنی موزوں طبیعت کر کے کرشمے متعدد شعر و شاعری کی مجلسوں میں دکھائے۔ اور ان میں کامیاب بھی رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکیم بادی رضا تارخ طب میں اپنی حیثیت سے واقف تھے اور اپنی عظمت کو پہچان گئے تھے۔ ایسا بہت کم لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ اپنی عظمت رفتہ کو پہچان گئے ہوں۔

اپنی ایک نظم میں جس کا عنوان ”لمحات حیات ماہ“ ہے اپنے شب و روز کے اوقات مصروفیات قلم بند کئے ہیں جس سے ان کی شخصیت کو آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

منظور ہے ماہ سے ملاقات تو یارو  
پھر آخر شب اس کو اگر ڈھونڈیں گے احباب  
پھر وقت سحر ہوگا مصلے پہ نسیاں  
پھر صبح کو چارہ گر نوع بنی انساں  
دوپہر کو وہ مرد خدا تم کو مکاں میں  
سہ پہر کو پاؤ گے اسے درس میں مصروف  
پھر شام کو وہ زندہ خرابات محبت  
اور جمعہ کو مل جائے گا کہ وقت مشاغل  
دیکھو گے اگر اس کو حقیقت کی نظر سے  
جب دیکھو گے پاؤ گے اسے موت مناسبت  
القصہ اسے دیکھو گے بے جان کسی دن

وہ شب کو تمہیں خانہ ویراں میں ملے گا  
مصروف تلاوت انہیں قرآن ملے گا  
مصروف دعا، خانہ پیرداں میں ملے گا  
مصروف علاجات مریضاں میں ملے گا  
تدوین کتب حکمت یوناں میں ملے گا  
اصحاب سخن سنچ و سخن داں میں ملے گا  
وارفتہ جاں محفل خوباں میں ملے گا  
مصروف عمل خدمت انساں میں ملے گا  
ڈوب ہو اوہ بحر و عرفاں میں ملے گا  
کھویا ہوا جذبات کے طوفاں میں ملے گا  
یا اس کا نشاں شہرِ نموشاں میں ملے گا

جو مست ہے خوشبوئے مدینہ کے اثر سے      کیا لطف اسے سنبل وریحاں میں ملے گا  
پھر بعد فنا ہوگی اگر اس کی ضرورت  
تاریخ کے اوراق پر نشاں میں ملے گا

## وفات :-

حکیم بادی رضاماتہ جو منیع الطب طبیبہ کالج کے نگران تھے اور ہمیشہ کے  
علاج کے ماہر۔ بسلسلہ منیع الطب طبیبہ کالج رام پور گئے تھے۔ ہیضہ کا خود شکار  
ہو کر بریلی شریف اپنے برادر خورد حکیم حبیب رضا کے پاس گئے۔ مرض بڑھتا  
گیا۔ جوں جوں دواہکی۔ آخر ۲۰ جون ۱۹۴۲ء کو داغ مفارقت دے کر معبودِ حقیقی  
سے جا ملے۔ میت لکھنؤ لاکر حیدر گنج کے شہر خموشاں جو ان کی ننہالی قبرستان  
ہے۔ تدفین ہوئی۔

انھوں نے خود عرض کیا تھا۔

ماہر فن بادی راہ طبابت چل دیا

در حقیقت معنی لفظ محبت چل دیا

ان کے انتقال پر ان کی طب کی درسگاہ کے شاگرد رشید حکیم مشتاق احمد  
خاں غبار بارہ بنکوی نے نذرانہ عقیدت کے جو پھول اشعار کی شکل میں نذر  
کئے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

زندہ جاوید ہے ایثار تیرا مرہب  
خدمت اقدس میں تیری عرض کرتا ہوں  
ہر ادا میں پارہ ہوں ایک جذب مستقل  
کر رہا ہوں قلب میں محسوس لطف بے بیبا  
اللہ اللہ کس قدر منہ بولتی تصویر ہے  
مرگ میں بھی تیری گویا زیست کے آثار ہیں  
ہر قدم پر دیکھتا ہوں تیرے آثار بقا  
کا کل شب میں بوجہ افشاں ستاروں کی ضیا

اے ستی فن طب اے مولوی بادی رضا  
اے ہمہ معصومیت اے ساکن دارالسلام  
دیکھ کر تیری شبیبہ پاک بھرا تا ہے دل  
دور رس ہوتی ہے یہ عامی سے شاعر کی نگاہ  
مرگ تیری اک مقدس زیست کی تفسیر ہے  
شاہکار زندگانی تیرے یوں بیدار ہیں  
اے مقیم خلد ہاں اے جاوہ پیمائی فنا  
نظمتیں جب ہوں مواد شام میں پرچم کشا

شرق سے ہونے لگے نورِ سحر جب صوفشاں  
 جب کہ آنکھوں میں ستاروں کے خمار آنے لگے  
 خوشہ انگور کا ہو جب ثریا پر گمساں  
 کروٹیں لیتی ہو جب سبزے پہ موج آب جو  
 لمحہ لمحہ یوں ہی ہستی کا تغیرِ خیز ہے  
 اس کشاکش سے مگر برتر ہے اب تیرا مقام  
 نورِ عالم سے یکساںے روز و شب صبح و شام  
 وہ تیرا روئے منور وہ تیرا حسنِ جبیں  
 زیبِ پیشانی ہیں یونہی داغہائے صوفشاں  
 وہ خمِ محرابِ ابرو اور وہ مگالِ دراز  
 کون کہہ سکتا ہے وہ تصویر اب بے جان ہے  
 منبعِ الطب تیرے جو بھی فیض سے سیراب تھا  
 تیرے امکانی مساعی ہر طرح تھے آبِ حیات  
 چل بسا ہاں چل بسا لیکن کچھ ایسا کر دیا  
 اے خوشا و قتیکہ ہو اس پر نگاہِ لطف بار

پیمانہ گان :-

جب ہوائے صبح سے مر جھائے شامِ اہلساں  
 تاکر جب شب کی زلف مشکبار آنے لگے  
 چاندنی کا کھیت جب بن جائے کشتِ زلفاں  
 جب شعاعیں چوس لیں سبزے کی نبضوں کا ہو  
 انقلابِ تازہ ہر شے کے لئے مہمیز ہے  
 تیری فطرت اب نہیں ہے اس تغیر کی غلام  
 آ رہی ہے قلب کے اعماق تک تیری ضیاء  
 آرزو کی انجمن میں گویا ہے شمعِ مہربان  
 جس طرح اوراقِ مصحف پر ہوں سجد و کشتاں  
 ترک ہوں جس طرح سے صدف بستہ از بہر نماز  
 ہر ادا میں جس کی تازہ زندگی کی شان ہے  
 اس کا گوشہ گوشہ رشکِ جنت شاداب تھا  
 دمِ قدم سے تیرے یہ کالج رہا رشکِ بہار  
 طبِ یونانی کو اعجازِ مسیحا کر دیا  
 خاکِ پانی رہا وہاں ہے جب کہ یہ مشتِ غبار

ان کی شادی ۱۹۱۳ء میں خواجہ امیر شاہ تحصیلدار کی دختر رزاقی بیگم سے  
 ہوئی تھی۔ جس سے تین صاحبزادیاں (۱) آفاق جہاں بیگم۔ (۲) جہاں آرا بیگم  
 (۳) عصمت جہاں بیگم اور دو صاحبزادے حکیم صابر رضا ادیب اور ہرگیڈیر  
 محمد شاہد رضا تولد ہوئے۔

تصانیف :-

ذیل کی کتب آپ کی وسعتِ معلومات زورِ قلم اور کثیر تجرباتِ تحریری و تاریخی ہیں۔  
 جن کو اطباء نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور بعض تو دو بارہ و سہ بارہ شائع ہوئی ہیں۔

## قرا بادین رضائی فارسی :-

یہ قرا بادین آپ نے ۱۹۰۷ء میں مرتب کی تھی جس میں بہترین ۵۰۰ پانچ سو مرکبات مع حل لغات موجود و صانع اول مرکب کا نام اور اس کی وجہ تسمیہ بحوالہ کتب طبیبہ بحروف تہجی درج کئے گئے ہیں۔ اوزان بجائے عربی کے جو مروج تھے اس وقت مثقال و رطل کے رتی و ماشہ کے لکھے ہیں اور آخر میں اوزان طبیبی عربی فارسی ہندی۔ ایرانی۔ ترکی یونانی۔ وئیدی۔ ڈاکٹری وغیرہ تفصیل سے تحریر کئے ہیں۔

یہ کتاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے مثل ہے۔

## ۲۔ القانون فی علاج الطاعون :-

حکیم ہادی رضاماتہ نے یہ رسالہ اپنے والد ماجد کی خواہش پر ترتیب دیا تھا۔ مرض طاعون کے تمام متعلقات کو اس حسن و خوبی سے قلمبند کیا ہے جس کی کوئی دیگر نظیر نہیں ملتی ہے۔

آل انڈیا یونانی و وئیدی کانفرنس منعقدہ رام پور ۱۹۱۶ء اس کو نہ صرف اجمل خاں بلکہ دیگر مشاہیر فن طب نے پسندیدگی کی سند دی تھی۔ اور شفاء الملک حکیم اجمل خاں کے اس سند پر دستخط بھی ہیں۔

## ۳۔ القول الکامل فی ذخیر الحق والباطل :-

اس رسالہ میں زخیر (پیش) کے تمام اختلافی مسائل مع فنی نکات اسباب و علاج و علامات با محاورہ سلیس عربی میں تحریر کیا ہے۔

## ۴۔ قانون مطب :-

اس رسالہ میں تمام قوانین مطب و اصول طب کو جن کا تعلق خاص کر مطب سے ہے بڑی قابلیت سے تحریر فرمایا ہے۔

## ۵۔ اصطلاحات الاطباء :-

جس میں اطباء قدیم کے تمام اصطلاحات بڑی خوش اسلوبی سے تحریر فرمائے ہیں۔

## ۶۔ عجائب المفردات :-

اس میں ان بڑی بوٹیوں کا ذکر ہے جن کا موجودہ کتب میں پتہ نہیں چلتا ہے اور جو اپنے اثرات میں تیر بہدف ہیں۔

## ۷۔ الحیات :-

ایک زمانے میں لکھنؤ میں طاعون کا بڑا زور تھا۔ سینکڑوں موتیں اس موذی مرض میں ہو گئی تھیں۔ حکیم صاحب نے الحیات نام کی ایک ڈبہ ایجاد کی تھی اس ڈبہ کی خوبی یہ تھی کہ جو شخص اس ڈبہ کو اپنے پاس رکھ لیتا تھا وہ طاعون سے محفوظ رہتا تھا۔

جون ۱۹۳۳ء میں الطیب کے نام سے لکھنؤ سے ایک رسالہ بھی نکالا تھا۔ اور جو چند سال جاری و ساری رہا۔

غرضکہ آج جبکہ نہ وہ خود ہیں نہ وہ زمانہ اور نہ وہ ارباب زمانہ تاہم ان کی یاد ان کے کلام ان کی تصانیف سے باقی ہے اور جب کبھی ان کا ذکر آتا ہے تو ان کے مذکورہ اشعار بھی یاد کو تازہ بنا دیتے ہیں۔

## قومی و ملی خدمات نیز تحریک آزادی میں تعاون :-

ملک کی جدوجہد آزادی سے بھی حکیم بادی رضاماتہر کا قومی تعلق رہا تھا۔ ”دہندوستان چھوڑو“ تحریک کے زمانے میں ایک موقع پر پنڈت جواہر لال نہرو جب لکھنؤ آئے تو حکیم بادی رضانے ان کا والہانہ استقبال کیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ ان کی ایک تصویر نہ صرف جنگ آزادی کے مجاہدین

کی یاد دلاتی ہے بلکہ روز روشن کی طرح اس حقیقت کی ترجمانی کرتی ہے کہ جنگِ آزادی میں اطباء کا کردار بہت اہم رہا ہے۔

صوبہ پنجاب میں مجاہدینِ آزادی پر ہو رہے، مظالم سے متاثر ہو کر انھوں نے جو اشعار کہے تھے وہ اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ ان کے دل میں تحریکِ آزادی کی تڑپ کتنی شدید تر تھی۔

وہ نظم جو انھوں نے پنجاب کے مجاہدین کے لئے کہی تھی درج ذیل ہے۔

باز آیا دیکھ لی حالت تری سرکار کی  
گر یہی حالت رہی اس شوخی رفتار کی  
شامی و قید خانے بازوئے سوراخ ہیں  
جوڑے پنجاب سے مجروح سارا ہندوستان  
معتدل فتویٰ کی ضبطی کم نہیں قرآن سے  
گو لہ باری یاد ہے ظلم و ستم بھولے نہیں  
جان دینے قید ہونے کو تو خود حاضر ہیں ہم  
مارشل لا کی ضرورت کیا کہ اہل ہند کی

حق طلب کرنے پہ جس نے قید کی بھاری  
جوش میں آجائے گی رحمتِ میرے غفار کی  
کیا ضرورت توپ کی بندوق کی تلوار کی  
ہے دو سوراخ ہی اس وقت کجیما کی  
جان ہی لیوا ہے جو ہے بات دل آزار کی  
کیا قیامت خیز ہے حالت مری سرکار کی  
دین و ایماں چھین لیں یہ کب مجال انبیاء کی  
گردنیں مشتاق ہیں خود آج کل تلوار کی

سر سے اب اب مظالم بڑھ چلا ہے اس قدر

کوئی دن میں ڈوبتی ہے آبرو سرکار کی

جوشِ تحریکِ آزادی ہند سے اس وقت شاید ہی کوئی فرد ایسا ہوگا جو متاثر نہ  
ہوا ہو تحریکِ خلافتِ تحریکِ ترکِ موالات غرضکہ کوئی بھی تحریک رہی ہو اطباء  
کبھی بھی پیچھے نہیں رہے تھے۔ اسی طرح تحریکِ خلافت میں بھی حکیم صاحب نے  
صرف زبانی حصہ نہیں لیا بلکہ بڑھ چڑھ کر تعاون دیا۔ سلطنتِ عثمانیہ پر حملہ کے دنوں  
میں مندرجہ ذیل قطعہ کہا تھا۔

یارب کرم کہ حد سے فزوں ہے غم والم

بدنام و خوار امتِ خیر الانام ہے

اسلام درد مند مسلمان ہیں مضطرب

نزعہ میں دشمنوں کے ہمارا امام ہے

بے تیرے ہاتھ دولت عثمانیہ کی لاج  
دشمن یہ کہہ رہے ہیں کہ ہستی تمام ہے

طلبا، طب سے شفقت :-

حکیم ہادی رضا اپنے شاگردوں سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے اور اس قدر دل لگا کر محنت و محبت سے ان کو درس دیتے تھے کہ طلباء ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔

۱۹۴۰ء کی بات ہے کہ حکیم ہادی رضا خاں منبع الطب کالج میں قانون شیخ کا ایک اہم مسئلہ طلباء کو سمجھا رہے تھے۔ ۲ گھنٹہ مسلسل کتاب میں موجود ایک مسئلہ پر لیکچر دیا۔ دوسرے دن پھر وہی بحث چھیڑ دی اور تیسرے دن اس مسئلہ پر پھر تقریر شروع کر دی۔ جب سب طلباء چلے گئے تو ان کے صاحبزادے حکیم صابر رضا ادیب جو تینوں دن کی بحث پر موجود تھے۔ اپنے والد محترم سے دریافت کیا کہ قبلہ ایک مسئلہ کو سمجھانے میں آپ نے تین دن لے لئے۔ حکیم ہادی رضا نے فرمایا کہ بیٹا یہ طلباء بہت دور دور سے تحصیل علم طب کے لئے میرے پاس آئے ہیں میرا فرض ہے کہ میری جو ناقص معلومات اس مسئلہ سے متعلق ہیں ان کو سمجھا دوں۔ اگر درس دینے میں میں بخل کروں گا تو یہ بیچارے کس سے اور کہاں سے علم حاصل کریں گے۔ اس محبت اور خلوص کا یہ نتیجہ ہے کہ آپ کے پڑھائے ہوئے تقریباً ڈیڑھ ہزار اطباء نہ صرف یوپی میں بلکہ بنگال اڑیسہ مدارس۔ آندھرا پردیش صوبہ سرحد افعال تان قندھار اور خاراٹک موجود ہیں جن میں سے بعض تصنیفی اور معالجاتی حیثیت سے ملک میں ممتاز مقام کے حامل ہیں۔

حکیم ہادی رضا اپنی فنی مہارت بہترین تشخیص علاج و معالجہ نیز خداداد ذہانت کی وجہ سے لکھنؤ کے اطباء میں حاذق طبیب مشہور ہو گئے تھے آپ ایک بہترین مقرر تھے اور بڑے بڑے جلسوں میں آپ کی جامع اور مدلل تقریریں سن کر لوگ حیرت زدہ رہ جاتے تھے آپ لکھنؤ کی تقریریں کرتے مگر زبان پر لغزش نہیں ہوتی تھی۔ آپ فارسی اور پشتو زبانیں بہت روانی سے بولتے تھے۔ چنانچہ افغانستان

کی جانب سے بہت سے افغانی طلبہ آپ سے طب کی تعلیم حاصل کرنے لکھنؤ آتے تھے۔  
 طبّی و غیر طبّی معرکے :-

لکھنؤ حاذق اطباء کا مرکز رہا ہے۔ لیکن ایسے طبیوں کی تعداد بہت کم رہی ہے جن میں طبّی حذاقت اور جراحی کا کمال دونوں جمع ہوں خاندان عزیز کی اہم رکن حکیم عبدالعزیز نے اس کمی کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا اور ثناء الملک حکیم عبدالرشید اور ثناء الملک حکیم عبدالحمید کو باقاعدہ سرجری کی تعلیم دلوائی۔ ان دونوں نے سینکڑوں چھوٹے بڑے آپریشن کئے اور سرجری کو مستقل اپنی پریکٹس کا جز بنا کر رکھا۔ خاندان رضائی اور حکیم عبدالحمید کے کالج میں بھی یہ امتیاز قائم رہا۔

حکیم صاحب ایک ماہر سرجن بھی تھے :-

حکیم بادی رضا کو معالجہ کے علاوہ سرجری سے خاص دلچسپی تھی۔ لکھنؤ میں اپنا مطب شروع کرنے کے بعد انھوں نے سرجری کی جانب کافی توجہ دی تھی لکھنؤ میڈیکل کالج میں انھوں نے ایک انگریز سرجن ڈاکٹر کے ساتھ کافی آپریشن کر کے کافی مہارت حاصل کر لی تھی۔

اپنے مطب میں سرجری کا ایک شعبہ بھی قائم کیا تھا اس میں آپ روزانہ کئی کئی آپریشن کیا کرتے تھے۔ اور منجہ الطب کالج کے طلباء کو عملی طور پر سرجری کی تعلیم بھی دے دیتے تھے۔ آج بھی یونانی اسپتال میں ایک فوٹو موجود ہے جس میں حکیم بادی رضا ایک مریض کی آنکھ کا آپریشن کر رہے ہیں۔ حکیم صاحب رضا اور دیگر طلباء طب اس فوٹو میں آپریشن دیکھتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔

حکیم صاحب کو آنکھ کے آپریشن کا خاصہ تجربہ تھا اور دور دورت مریض آنکھ کے آپریشن کے لیے آتے تھے۔

ٹانگے والے کا ہاتھ کاٹا گیا :-

ایک دن ایک ٹانگہ والا خون میں لت پت حکیم بادی رضا کے دو خانہ لایا گیا اور حکیم صاحب کو بتایا گیا کہ اس کے گھوڑے نے غصہ میں آکر اس کا ہاتھ چبا لیا



حکیم صاحب نے ٹانگے والے کا ہاتھ بغور دیکھا اور پایا کہ اب ہاتھ کام کا نہیں رہا اگر اس کو جلدی بدن سے الگ نہیں کیا گیا تو ٹانگے والے کے بدن میں زہر پھیل جائے گا اندیشہ ہے۔ گھر والوں کی مرضی سے حکیم صاحب نے اسی وقت ٹانگے والے کو بیہوش کر کے بہت صفائی سے اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔ یہ کٹا ہوا ہاتھ بہت دنوں تک ایک شیشہ کے بڑے کنسٹرین حکیم صاحب کے مطب میں رکھا رہا۔ اور اس کو دیکھنے کے لئے دور دور سے لوگ آتے رہتے تھے۔ حکیم صاحب کے آپریشن روم میں ہزاروں روپے کے قیمتی جرمنی کے بنے ہوئے سرجرمی کے اوزار تھے حکیم صاحب کو انگریز اعلیٰ حکام کی جانب سے کوکین۔ مارفیا۔ کلوروفارم جیسی خطرناک دواؤں کے رکھنے کی باقاعدہ اجازت تھی۔ آج بھی ان کے ورثاء کے پاس یہ سارٹیفکیٹ جو انگریز سول سرجن نے دیا تھا اور مذکورہ دوا میں استعمال کرنے کی اجازت دی تھی محفوظ ہے۔

### مرضاہ سے ہمدردی اور محبت :-

۱۹۳۵ء کی بات ہے کہ ایک دن حکیم محمد ہادی رضا خاں مطب میں مریضوں میں بہت مشغول تھے ان کے ایک پرانے مریض مرزا صاحب حیران و پریشان آئے اور حکیم صاحب سے عرض کیا۔ قبلہ میری بچی کی طبیعت بہت خراب ہے اس کو آپ ابھی ملاحظہ کر لیں۔ تھوڑی دیر میں حکیم صاحب مرزا صاحب کے ساتھ پہنچے۔ مرزا صاحب کا مکان مطب سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ حکیم ہادی رضا صاحب نے واپس آ کر اپنے صاحبزادے حکیم محمد صابر رضا سے جو اس وقت مطب میں موجود تھے کہا کہ بیٹا ایک پیالہ بکری کے شوربے کا جلد انتظام کر کے مرزا صاحب کو دے دو۔ حسب حکم والد صاحب کے حکیم محمد صابر رضا ادیب نے اس کا انتظام کر دیا۔ جب مطب سے مرزا اور طلباء چلے گئے تو حکیم محمد ہادی رضا کے استفسار پر کہ مریض کے گھر کھانا بھجوانے کی کیا ضرورت پیش آئی تو انھوں نے فرمایا بیٹا تم نہیں جانتے۔ میں مرزا صاحب کی جس لڑکی کو دیکھ کر ابھی آیا ہوں وہ ٹی بی کی مریضہ ہے اور چند گھنٹوں کی مہمان۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ حکیم صاحب میں کیا کھاؤں تو میں نے اس کو بکری کا شوربہ

چباتی کھانے کو بتایا۔ اس نے کہا کہ حکیم صاحب میں بکری کا شوربہ آپ کے گھر کا کھانا چاہتی ہوں۔

اگر آخری وقت میں اس کی خواہش پوری کر دوں تو میرا کیا نقصان ہے۔ اسی طرح حکیم ہادی رضا خان اکثر و بیشتر غریب غرباء کی فیس تک واپس کر دیا کرتے تھے۔  
تذکرہ حاضر دماغی کا:-

حکیم صاحب مزاجاً انتہائی خلیق اور جبری واقع ہوئے تھے۔ ایک دفعہ یونی کے آخری انگریز گورنر مسٹر ہیلیٹ نے ۱۹۴۲ء میں طب کو درپیش مسائل پر گفتگو کے لئے بلایا۔ حکیم ہادی رضا وقت مقررہ پر گورنمنٹ ہاؤس تشریف لے گئے۔ گورنر صاحب نے دیر تک حکیم ہادی رضا سے خوشگوار ماحول میں بات چیت کی۔ دوران گفتگو حکیم صاحب کو گورنر صاحب کو انگریزی میں کچھ سمجھانے کی ضرورت پیش آگئی۔ حکیم صاحب کے انگریزی بولنے پر گورنر صاحب نے حکیم صاحب سے دریافت کیا۔

”ول حکیم صاحب آپ کتنی انگریزی جانتا ہے۔“ حکیم صاحب نے برجستہ

جواب دیا۔

”ول صاحب آپ جتنی اردو جانتا ہے۔“

حکیم صاحب کا یہ جواب سن کر گورنر صاحب بہت خوش ہوئے اور حکیم صاحب سے ہاتھ ملا کر دیر تک ہنستے رہے۔

# علامہ حکیم احمد حسین عثمانی

۶۱۹۳۳

۶۱۸۹۵

## بانی طہتی درس گاہ

دنیا میں ایسے لوگ گنتی کے ہیں جنہوں نے اپنی راہ خود بنائی ہو۔ جس طرح دنیا میں ۳ طرح کی اولادیں پائی جاتی ہیں۔ سپوت۔ پوت۔ اور کپوت۔ سپوت وہ جو اپنے والدین سے زیادہ نام کمائے۔ پوت وہ جو اپنے والدین جیسا ہی ہو۔ کپوت وہ جو اپنے والدین سے کمتر حیثیت کا ہے۔ حکیم احمد حسین کا شمار درجہ اول یعنی سپوت کے زمرہ میں آتا ہے۔

خاندان :-

آپ کے اجداد کسی وقت میں ہندوستان آکر آباد ہو گئے تھے اور بعد میں الہ آباد کے قریب سیدسراواں جو طبقہ سادات اور شرفاء کی بستی ہے وہاں قیام کیا۔

آپ نسباً عثمانی خاندان میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار مولوی بدرالدین سیدسراواں کے جانے و مانے رئیس تھے لیکن گردش زمانہ اور حالات وقت کا شکار ہو کر بسلسلہ ملازمت الہ آباد آکر مقیم ہو گئے تھے۔



بانی کالج الہ آباد۔ علامہ حکیم احمد حسین عثمانی صاحب مرحوم

## پیدائش :-

آپ کی پیدائش الہ آباد کے مشہور مردم خیز قصبہ جو پچھلے ادوار میں علم و ادب کے میدان میں خصوصی اہمیت کا حامل تھا کے ایک معزز گھرانے میں ۱۸۲۵ء کو ہوئی تھی۔

## تعلیم و تربیت :-

حسب دستور زمانہ آپ کی تعلیم و تربیت کا آغاز اپنے والد کے سایہ عاطفت میں ہوا گھر کی ابتدائی تعلیم کے بعد قصبہ مذکور میں اردو و فارسی کی تعلیم کی ابتدا کی۔ بعد فراغت تعلیم قصبہ والد ماجد کے نقل مکانی کے ساتھ ساتھ خود بھی ان کے ہمراہ الہ آباد منتقل ہو گئے۔ اور مدرسہ اسلامیہ عربیہ جوان کے زمانہ میں تعلیم کا ایک بڑا مرکز تھا اس داخل نصاب تعلیم ہو گئے۔ بعد فراغت تعلیم مدرسہ آپ نے اپنے وقت کے ماہر تعلیم اور جید بزرگ مشہور عالم و فاضل خان بہادر حاجی حافظ مولوی حکیم صوفی محمد حسین کی خدمت میں حاضر ہو کر زانوئے ادب تہہ کیا۔ اور ایک عرصہ تک اصول فقہ۔ حدیث۔ بیان۔ منطق۔ ریاضی وغیرہ درسی کتب دیکھتے رہے۔ مولانا کی مصروفیت بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے آپ کی تعلیم میں حرج واقع ہوتا تھا اس لئے آپ اپنے والد قبلہ کو اطلاع دیتے بغیر بے سرو سامانی کی حالت میں کان پور جا پہنچے۔ اور مولوی حاجی حافظ احمد حسین صاحب مدرسہ مدرس دارالعلوم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چونکہ آپ کی طبیعت ذہین واقع ہوئی تھی اور تکمیل فنون کا شوق تھا۔ اس لئے آپ کی خاص توجہ سے حکیم صاحب مستفید ہوئے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں تکمیل فنون کر کے بغرض حصول تعلیم طب لکھنؤ چلے گئے اور اس الطباءہ خیل اطباء و حاذق طبیب حکیم حیدر حسین طبیب دارالشفاء شاہی سے تین سال تک طبی کتابیں پڑھیں اور مطلب سیکھا۔ اور نسخہ نویسی کی خوب مشق کی۔ ۱۷-۱۸ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر کلکتہ چلے گئے وہاں مطلب کیا اور کامیاب بھی ہوئے لیکن والد ماجد کی علالت

کی بنا پر جب الہ آباد آئے تو واپس جانے کو دل نہ چاہا۔ اور الہ آباد میں ہی مطب شروع کر دیا۔ چونکہ یہ اپنے والدین کے دوسرے اور آخری صاحبزادے تھے اس لئے گھر کے ساتھ دیگر ذمہ داریاں بھی کاندھوں پر آن پڑیں تھیں۔ چونکہ صاحب ذوق تھے اور علم و فہم کے ماہر۔ ذکاوت اور سلیم الطبع بھی تھے۔ طبع نکتہ رس تھی۔ لہذا بہت تھوڑے ہی عرصہ میں مطب چل نکلا اور گرد و نواح کے امیر و غریب آپ کے علاج اور حسن تدبیر سے فیضیاب ہونے لگے اور چہار سو آپ کی حداقت بلاغت اور ماہر طبیب ہونے کا شہرہ ہو گیا۔

ہندوستان میں جب طاعون کا زور ہوا تو جہاں دوسرے شہر و قصبے محفوظ نہ رہے وہاں الہ آباد بھی لپیٹ میں آ گیا اور الہ آباد کے بہت سے ڈاکٹر اور حکیم شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تو آپ نے وہاں مقیم رہ کر مرضار کی بہت خدمت کی جس سے آپ وہاں عوام کیا خواص سب میں مقبول ہو گئے اور مطب بہت کامیاب ہوا۔

نہایت ذہین اور باصلاحیت اوصاف کی بدولت دستِ شفا بامِ عروج پر پہنچ کر شہرہ آفاق بنی۔ آپ کو تحقیق اور تدوین فنِ طب سے کافی لگاؤ اور خصوصی دلچسپی کے باعث علاج و معالجہ میں آپ کی معجزہ نمائیاں اکثر و بیشتر لوگوں کے زبان زد تھیں اور سینکڑوں اطباء کرام کو بھی شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ فجر کے بعد سے ظہر تک آپ کا مطب نہایت ہی کامیابی سے جاری اور مریضوں سے بھرا رہتا تھا۔ آپ کے زمانہ طبابت میں مریضوں کی قسمت کا فیصلہ عموماً کم فہم عطاروں کے ہاتھ میں تھا اور غرباء کے علاج کا کوئی طریقہ نہ تھا چنانچہ اس نظریے کے تحت علامہ موصوف نے یونانی دواخانہ الہ آباد کی داغ بیل ۱۹۱۲ء میں ڈالی۔ اس دواخانہ نے آپ کی حیات میں ہی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی اس کے ساتھ ساتھ یونانی دواخانہ پر لیس الہ آباد بھی قائم کیا تھا جس کے قیام کا مقصد صرف تدوینِ طب اور ترجمہ ابن خلدون جنگ بائے صلیبی وغیرہ کی اشاعت تھی۔ اس پر لیس کا کارنامہ ہے کہ علم القابلہ میں قبالا کی چارٹ ابتدائے زمانہ حمل سے انتہا تک شائع کر کے طبقاتی اداروں کو سپلائی کیا جس کا ایک نسخہ یونانی میڈیکل کالج الہ آباد میں آج بھی موجود ہے۔

حکیم مولوی احمد حسین نے ۱۹۰۴ء میں طب یونانی کی ترویج و ترقی کے لئے اپنے آبائی مکان واقع محلہ سبزی الہ آباد میں ایک طبی مدرسہ قائم کیا جو مختلف ادارت سے گزر کر اس وقت یونانی میڈیکل کالج کی حیثیت سے اپنی زمین اور اپنی بلڈنگ محلہ ہمت گنج الہ آباد میں موجود ہے۔ یہ ادارہ بلا شرکت غیرے موصوف نے اپنی ذاتی بیس سے قائم کیا تھا موصوف نے فن طب کی تدریس کے لئے ہندوستان کے مشابہ اطباء پر مشتمل ایک جماعت جمعیتہ الاطباء کی تشکیل بھی کی تھی۔ جس کے زیر نگرانی مدرسہ طبیبہ بعد از یونانی میڈیکل اسکول کے امتحانات اور نصاب جاری اور قائم کیا تھا۔ عربی دان کے لئے تعلیم خالص عربی زبان میں ہوتی تھی اور چار سال کی فراغت کے بعد ان فارغین کو ماہر الطب والجرحت اور اردو زبان میں طب کی تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کو چار سال کی مدت کے بعد معتمد الطب والجرحت اسناد عطا کی جاتی تھی۔

یونانی دواخانہ الہ آباد میں موصوف کے زمانہ حیات سے ہی ایک طرف امر اور مستطیع حضرات کو اصول طبیبیہ کے متعلق اصلی دوائیں قیمتا دی جاتی تھیں۔ دوسری جانب وہی دوائیں نادار اور غریب مریضوں کو مفت دی جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے بے مثال علاج و معالجہ کے کارنامے اور ایثار سے لوگوں کا خیال تھا کہ باری تعالیٰ نے نبی نوح انسانی کے فائدہ اور فن طب کی ترقی کے لئے خاص طور پر موصوف کو مبعوث کیا تھا۔ غریب کی طبی امداد اور فن طب کی ترقی کو علامہ مرحوم کے مقصد حیات بنا رکھا تھا۔ ان کی دیرینہ اور ۲۳ سالہ مسلسل فنی خدمات کے عوض میونسپل کارپوریشن نے اس سڑک کا نام جس پر یونانی دواخانہ حکیم احمد حسین رہا رکھ دیا ہے۔

۱۹۲۱ء کو موصوف نے خود زمین خرید کر طبیہ کالج کو اس کی زمین میں منتقل کر دیا اور ایک سال بعد اس زمین پر تعمیر کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کالج کے فارغین کی بہت بڑی تعداد تقریباً ہر صوبے میں پھیلی ہوئی ہے اور کامیابی کے ساتھ طب کر رہے ہیں۔ اس کالج میں طب قدیم کے ساتھ ساتھ انکشافات جدیدہ سے بھی استفادہ ورت واقعیت کرائی جاتی رہے۔

## وفات :-

ابھی طبیہ کالج میں تعمیر کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ ۳ جنوری ۱۹۳۲ء کو موصوف نے ملک عدم کی راہ لی۔ کالج کے احاطے میں ہی بصد احترام و اعزاز دفن کیا گیا۔ حکیم حسین احمد عثمانی کو فن طب سے اس قدر لگاؤ اور رجحان تھا کہ اپنے بعد اپنے دونوں بیٹے اس فن کی جانب لگائے اور دونوں فرزندوں کو طب کی تعلیم سے مالا مال کیا۔

آپ کی وصیت کے مطابق ۱۹۶۱ء تک طبیہ کالج میں تعلیم کی فیس نہیں لی جاتی تھی بلکہ غیر مستطیع طلباء کے لئے وظائف بھی مقرر تھے۔ ان کے زمانہ حیات میں یونانی میڈیکل اسکول میں بڑے بڑے عالم اور جید حضرات جیسے شمس العلماء، امجد علی فیلیو آف الہ آباد یونیورسٹی، ڈاکٹر محمد عظیم فیلیو آف پٹنہ یونیورسٹی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری صدر کل ہند کانگریس، ڈاکٹر عنایت اللہ بیٹ آئی۔ سی۔ ایس۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں، جسٹس گوکھرن ناتھ مسرا، ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا، ڈاکٹر سر محمد سلیمان چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ نے معائنہ فرمایا۔ اور موصوف کی خدمات کو سراہا۔

## پسماندگان :-

آپ نے اپنے بعد اپنے لگائے ہوئے درخت کی آبیاری کے لئے دو بیٹے شفاء الملک حکیم احمد عثمانی اور حکیم محمد صفوان عثمانی کو چھوڑا۔

## ادبی خدمات :-

اگر آپ نے ایک جانب طبی خدمات علاج و معالجہ و طبی درسگاہ کی حیثیت سے کی ہے تو دوسری جانب تاریخ میں ترجمہ ابن خلدون جو ۱۴ جلدوں پر مشتمل ہے یہ نہ صرف ایک دستاویز ہے بلکہ تاریخی حیثیت سے ایک شاہکار ہے۔ جس میں جلد اول - جواز قبل ولادت نبوی تا شہادت حضرت علی کے بیان میں ہے۔ جلد دوم - جو حالات ملوک فارس و یونان وغیرہ کے بیان میں ہے۔



جلد سوم۔ عرب قبل اسلام۔ رسول اللہ کی ولادت تا عہد خلافت کے بیان میں ہے۔  
 جلد چہارم۔ فتوحات فاروق اعظم کے بیان میں ہے۔  
 جلد پنجم۔ خلفائے بنی امیہ۔ امیر معاویہ مزید تا واقعات کربلا کے بیان میں ہے۔  
 جلد ششم۔  
 جلد ہفتہ۔

جلد ہشتہ۔ خلافت عباسیہ کے زمانہ انحطاط کے تاجدار کے بیان میں ہے۔  
 جلد نہم۔ خلافت عباسیہ کے آخری دور کے گیارہ تاجدار کے بیان میں ہے۔  
 جلد دہم۔ حاکم یا امر اللہ کی خلافت سے بنو امیہ کے بیان میں ہے۔  
 جلد یازدہم۔ اندلس کا آخری دور کے بیان میں۔  
 جلد دوازدہم۔ علاوہ دیگر حکمرانان اسلام جاپان۔ ہند۔ نیپال۔ گوالیر وغیرہ کے بیان میں۔

جلد سیزدہم۔ سلاطین غوریہ کے انساب و حالات فتوحیات دہلی۔ بنارس۔ میرٹھ۔ کالپی۔ بدایوں۔ مقابلہ بھیم دیو جے چند۔  
 جلد چہار دہم۔ سلاطین سلجوقیہ۔ چنگیز خان کا خروج تاتاریوں کا ٹوفان ممالک اسلامیہ کی بربادی۔

ان کی دیگر تصانیف ہیں۔

صلاح الدین۔ سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس کی سوانح عمری۔  
 حیات نور الدین محمود زنگی۔ فاتح شام و جزیرہ مصر کی سوانح عمری۔  
 ان کی طبی حذاقت۔ علمی لیاقت فن طب کے لئے ایشیا قربانی سے متاثر ہو کر  
 کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

نہد مت طب کے لئے سب کچھ خدا ارادے دیا  
 حصول طب کی خاطر اپنا ادارہ دے دیا

بحر طب میں آپ نے گویا کنارے دیا  
 ڈوبتی کشتی کو ساحل کا سہارا دے دیا

آپ کی رائے تھی کہ:

(۱) حصاة الکلیہ کے متعلق مخربات اور منقنات عام طور پر درسی کتب میں مندرج ہیں۔ یا قرابادینوں میں لکھے ہیں۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ منع تخر اور تولد مصاة کا کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ آپ کی رائے میں مادہ مجرہ جگر سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا انسداد یہیں سے ہونا چاہیئے۔ پہلے مضمیح استعمال کرائیں۔ بعدہ مسہل دے کر مقویات جگر و گردہ و مثانہ استعمال کرائیں۔ اس طرح کے علاج سے انشاء اللہ تعالیٰ تولد حصاه و رمل رک جائے گا۔

(۲) ماء اللحم نیز عرفیات میں ثعلب مصری، شقاق مصری، طباشیر کبود کا استعمال قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ عرفیات میں ان دواؤں کا استعمال فضول ہے اس لئے کہ جب ادویہ پر غور کیا جاتا ہے تو تین طرح کی دوائیں پائی جاتی ہیں۔ ایک وہ کہ جن کے افعال اجزائے ارضیہ کے ساتھ ہیں یعنی وہ اجزائے ارضیہ اجزائے لطیفہ ہوائیہ، ناریہ سے اس طرح مثبت ہیں کہ ان کا اڑانا اور جدا کرنا ممکن نہیں۔ منتفع ہونے کے لئے استادوں نے معاجین وغیرہ کی ایجاد کی ہیں نہ کہ عرفیات۔

دوسری وہ دوائیں ہیں جن کے اجزائے لطیفہ اجزائے ارضیہ سے اس طرح اڑانے اور جدا کئے جاسکتے ہیں کہ ان کے اجزائے ارضیہ محض ثقل کی صورت میں رہ جائیں جو مایہ مقصد نہیں۔ ایسی دواؤں کا عرفیات میں استعمال کرنا ادنیٰ و نسب ہے۔ (۳) تیسری وہ دوائیں جن کے اجزائے ارضیہ و لطیفہ دونوں نفع میں تقریباً برابر ہیں۔ ایسی دوائیں ہر طرح سے کام میں لائی جاسکتی ہیں؛ پس جن ادویہ کے محض جرم میں تاثیر موجود ہے اور جن کے اجزائے لطیفہ ان کے اجرام سے منفک نہیں ہو سکتے۔ ان کا عرفیات میں استعمال کرنا بے معنی ہے۔

طبی معرکے :-

ایک بار کا ذکر ہے کہ فیض آباد کے ایک سول سرجن کی اکلوتی لڑکی تھی جو عرصے سے قویخ گردہ بوجہ حصاة الکلیہ میں مبتلا تھی۔ آپریشن سے بہت گھبراتی تھی۔ ایک زمانہ تک مختلف معالجین کا علاج ہوتا رہا مگر آرام نہ ملا۔ درد کا دورہ برابر پڑتا

آخر کار اس قدر کمزور اور نحیف بلغم ہو گئی کہ گھرو لے نا امید ہو گئے۔ درد کا دورہ ختم ہوا اور نہ پتھری نکلی۔ اس سلسلہ میں موصوف کو الہ آباد میں رجوع کیا گیا۔ حکیم صاحب نے حوالیہ گزردہ کا سب سے پہلے علاج شروع کیا۔ شروع میں تین دنوں تک عرق بادیان دن بھر پلاتے رہے۔ پھر اس کے بعد جوارش شہر پاران ایک تولہ کی مقدار میں رات کو سوتے وقت دی گئی۔ تین دن کے بعد اپنا سنگ گزردہ کا مجرب نسخہ شروع کیا۔ نسخہ تخم ترب حجر الیہود سنگ سراہی۔ ہر ایک ایک ماشہ خوب باریک پسی شہ بہت کثوث ایک تولہ میں ملا کر چٹائیں۔ اس کے اوپر حب کا کچھ ۶ ماشہ تخم حنارین ۳ ماشہ۔ پندرہ تولہ پانی میں جوش دیکر چھان کر گل قدر آفتابی ۱/۲ تولہ ملا کر برابر پلاتے رہیں۔ پندرہ روز کے بعد درد کا شدید دورہ ہوا۔ یہاں تک کہ مریضہ بے ہوش ہو گئی۔ حکیم صاحب طلب کئے گئے۔ موصوف نے کوکنار مسلم ۵ عدد عرق کلاب خالص ایک پاؤ میں جوش دے کر فلاہین کے کپڑے کو تیر کر کے نچوڑنے کے بعد ٹکڑے کرانا شروع کیا مریضہ کو بستر پر پیشاب ہو گیا جس میں بڑی مقدار میں ریزے تھے۔ مریضہ کی آنکھ کھل گئی یہ علاج اس وقت جاری رہا جب تک کہ پتھری بالکل نہیں گئی۔ لوگوں کو اور خصوصاً سولہ جن صاحب کو اس علاج سے بڑی حیرت ہوئی۔ علاج تقریباً چھ ماہ چلتا رہا۔ مریضہ دن بدن صحتیاب ہوتی گئی۔

اسی طرح ایک بار صوبہ یوپی میں مرض طاعون بہت شدت سے پھیلا۔ ہزاروں انسان لقمہ اجل ہو گئے۔ الہ آباد بھی اس مرض کی لپیٹ میں آ گیا۔ حکیم صاحب نے ایسے ہی موقع پر الہ آباد ہی میں رہ کر جب کہ شہر کے بہت سے ڈاکٹر حکیم اس خوفناک مرض کے خون سے الہ آباد چھوڑ چکے تھے مریضوں کا علاج شروع کیا۔

ایسے ہی حالات میں ایک جوان العم مریضہ جو طاعون میں مبتلا تھی اس کے لئے موصوف نے جوار حطائی ۹ ماشہ درونج عقیقی ایک تولہ مرزنجوش ۳ تولہ کافور ۶ ماشہ زرشک ۹ ماشہ کو کوٹ کر پیس کر چنے کے برابر گولیاں تیار کرائیں اور مریضہ کو شروع میں ۲ عدد دن میں ۳ بار پھر چار دن کے بعد تین کے بجائے دو۔ دو گولیاں دن میں تین بار استعمال کرائیں مریضہ کو شفا ہوئی اور صحت یاب ہو کر بقیہ زندگی اچھی گزاری۔

شہنشاہ تصنیفات - نازش طب

علامہ حکیم کبیر الدین

۱۹۷۶ء

۱۸۹۲ء

تاریخ میں ہمیشہ وہ یادگار ہستیاں باقی رہیں ہیں جو اپنی مساعیٰ جمیلہ سے ایسے کام کر گزری ہیں جو نمایاں رہے ہوں۔ ان قابل ذکر ہستیوں میں حکیم علامہ کبیر الدین کا نام بھی داخل ہے۔ طبی دنیا میں ان کا نام نامی واسم گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔

اجداد :-

آپ کے جد امجد شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور کاٹھیاواڑ سے صوبہ بہار منتقل ہو گئے تھے۔ بعد شہنشاہ اکبر ان کے اجداد کو ایک بڑی جاگیر صلہ خدمت کے عوض ملی تھی۔ ان کے والد جمال الدین ایک جانے دمانے ہوئے بزرگ و عالم دین تھے۔

پیدائش :-

علامہ حکیم کبیر الدین کی پیدائش صوبہ بہار کے مردم نیر ضلع مونگیر کے قصبہ شیخ پورہ محلہ یچی پور میں ۱۸۹۲ء کو ہوئی تھی۔

تعلیم :- تعلیم کی ابتدا قاعدہ بغدادی سے وطن کے ہی مکتب میں ہوئی۔ ۱۹۰۵ء

ہیں گیارہ برس کی عمر میں اپنے منجملے جہانی حکیم محمد ظہور الدین کے ساتھ کان پور میں پہنچے جہاں حضرت مولانا عبدالقدیر کان پوری جیسی بے نظیر بستی کا بچپن ہی میں سایہ نصیب ہو گیا۔ مولانا کو مدرسہ دارالعلوم کان پور کے صدر مدرس تھے۔ مگر ازراہ شفقت بزرگانہ گھر پر نام حق۔ پندنامہ۔ عطار۔ گلستاں جیسی چھوٹی چھوٹی کتابوں کا درس بھی دیتے تھے جس میں ایک گیارہ سالہ بچے کے ساتھ منتہی طلباء بھی شریک درس ہونا باعث فخر تصور کرتے۔

عربی تعلیم :-

اس کے ساتھ ہی جلد ہی میزان مشعب۔ پنج گنج جیسی کتب بھی شروع ہو گئیں۔ اور صرف انہی کی مشق اور ابتدائی منطلق کی تعلیم کان پور ہی میں مولانا کے زیر سایہ ہونے لگی۔ ۱۹۰۰ء میں دونوں جہانی لکھنؤ پہنچے۔ جہاں منجملہ جہانی تو تکمیل الطب طبیہ کالج میں طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل ہو گئے اور برادر خورد یعنی امیر الدین کو شمس العلماء مولانا عبدالمجیب فرنگی محلی کی شاگردی نصیب ہوئی جو عربی کی اور پور کی درسی کتب کے نہ صرف قابل ترین استاد تھے بلکہ کنگ کالج ارقیہ ہاشمی میں شعبہ علوم و مشرقیات کے اساتذہ میں شامل تھے۔ محنتی و ذہین شاگرد نے اپنے لائق استاد کی توجہ سے درسی کتب پر بہت جلد عبور حاصل کر لیا۔

طبی تعلیم :-

۱۹۰۹ء میں جب کہ آپ کی عمر تقریباً سولہ برس تھی آپ علم طب کی تحصیل کے لئے مدرسہ طبیہ (عربی) دہلی پہنچے جو اس زمانے میں گلی قاسم جان میں واقع تھا۔ اور دہلی میں مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں دہلوی کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا اس وقت اس طبی مدرسہ میں جو اساتذہ تعلیم دے رہے تھے وہ سب کے سب اپنے فن میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ مولانا حکیم عبدالرشید صاحب رامپوری "کلیات" مولانا حکیم عبدالرحمن صاحب پنجابی "معالجات" مولانا حکیم عبدالرزاق

صاحب پیر جی تشریح اور ڈاکٹر امیر چند صاحب جدید مضامین کا درس دیا کرتے تھے۔ ان مستقل اساتذہ کے علاوہ حکیم محمد احمد خاں اور حکیم غلام کبریا خاں عرف بھومے میاں صاحب بھی وقتاً فوقتاً بعض مضامین پڑھایا کرتے تھے۔

استاذ کبیر استاذ الا اساتذہ حاذق الملک مسیح الملک شفاء الملک حکیم محمد اجل خاں بھی اساتذہ میں شامل تھے مگر شعبہ عمل کی حد تک کہ مدرسہ کے طلباء و نظمی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ان کے مطب میں بیٹھ کر اصول علاج سیکھتے تھے۔ استاذ کبیر اس زمانہ میں کتابی درس نہیں دیتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی دیگر اساتذہ کی طرح مدرسہ میں آکر درس دیتے تھے۔

چند ہی روز میں اس بچہ یا سولہ سال کے نوجوان نے ہم جماعت طلباء اور اساتذہ کے قلوب میں اپنا مقام حاصل کر لیا۔ طلباء عزت کرنے لگے اور اساتذہ محبت۔ پیر جی عبدالرزاق صاحب ازراہ شفقت اکثر اوقات کبیر الفلاسفہ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

امتحان کے نتائج ایسے شاندار رہے کہ مشکل سے اس کی نظیہ مل سکے۔ ہر سال دونوں مضامین (یونانی و ڈاکٹری) میں برابر اول رہے اور کبھی ہمراہی کو پیش روی کا موقع نہیں دیا۔ اس طرح مدرسہ طبیبہ دہلی سے اول درجہ کے دونوں تمنغے حاصل کئے۔

تمغہ شیو پرشاد بہادر (اول۔ یونانی)

تمغہ شمس الاطباء (اول ڈاکٹری)

رفعت اوج کی تمنا اس نوجوان کو لاہور لے گئی۔ ”دور کے ڈھول سہلے“

زبدۃ الحکماء آخری امتحان کا لقب کتنا شاندار ہے۔ سادہ نام کے ساتھ جب اتنا بڑا لفظ لکھا جائے گا تو کتنا بھلا معلوم ہوگا۔ اسی قسم کے جذبات نوجوان نے ان کو اس امتحان کی شرکت کے لئے آمادہ کیا۔

اس وقت لاہور کے اس بڑے طبی کالج میں بد عنوانیاں انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ حسن اتفاق کہ ان کے زمانہ طالب علمی میں امتحانات میں اچھی طرح سختی برتی گئی اور نگران اعلیٰ پروفیسر خواجہ ولی محمد صاحب نے اپنی خداداد جدت نظر

اور قوتِ نظم کے پورے جوہر دکھائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زبیرۃ الحکماء اور عمدۃ الحکماء کے امتحانات میں صرف حکیم کبیر الدین کے کوئی بھی حکیم کامیاب نہ ہو سکا۔ درجات میں یہ نہ صرف اکیلے رہے بلکہ اول بھی رہے۔ اس وقت مذکورہ امتحانات کی حیثیت ایسی بھی جیسی کہ آج کل کی طبی تعلیم ایڈمی ہے۔

اس کامیابی میں سر یونی ڈین کا تمنہ حاصل کیا اور جب یہ تہ دہلی پہنچی تو حکیم اجمل خان اعظم اتنے محظوظ ہوئے کہ مدرسہ طبیہ دہلی کی سند اور تمنہ پر نام کے ساتھ زبیرۃ الحکماء لکھوانے کی اجازت محنت فرمائی۔ حسن اتفاق سے امسال حکیم حادق اجمل خاں امتحان "زبیرۃ الحکماء" کے ممتحن بھی تھے۔

دیگر علوم :-

زمانہ قیام ۱۹۰۷ء لکھنؤ میں کبیر الدین نے فنِ خطاطی کی تعلیم اپنے زمانہ کے نامور اور فن کے ماہر شمس الدین انجاء رقم سے حاصل کی۔ اور کیننگ کالج میں تعلیم بھی۔

لاہور میں ۱۹۱۲ء میں مندرجہ بالا امتحانات پاس کرنے تھے اور یہ زمانہ حکیم کبیر الدین کی دو تعلیمی کے ختم ہونے کا ہے وہاں یہ کچھ عہدہ شمس الاطباء، حکیم غلام جیلانی کے ساتھ بھی وابستہ رہے۔ یہاں پر تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ترجمہ و تالیف کا مشغلہ مل گیا۔ جو طبعام خوب بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ جو تقریباً ڈیڑھ سال جاری رہا۔ کہ آپ نے لاہور ہی میں مطب اور طبی درس کا اعلان کر دیا یعنی استاد ہی کا درجہ لاہور ہی میں استاد محترم حکیم غلام جیلانی کی رفاقت میں مل گیا تھا۔

ترجمہ کی ابتدا۔ ۱۹۱۶ء :-

لیکن قدرت کو چونکہ کچھ اور منظور تھا اور خدمتِ فن کا بڑا کام ان سے لینا چاہتی تھی۔ سلسلہ مطب کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ آپ کو شرح اسباب کے ترجمہ کا خیال پیدا ہوا۔ چار جلدوں میں سے دو جلدوں کا برق رفتاری سے

ترجمہ کر کے اور چھپوا کر استاذ کبیر و محسن طب حکیم اجمل خاں کی خدمت میں پیش کیا۔ جو حکیم اجمل خاں کے نام سے منسوب تھا۔ اس طرح طبع اول جو ۱۹۱۶ء کا ہے حکیم صاحب سے منسوب ہے۔

اسی زمانہ میں مدرسہ طبیہ کالج کے معیار پر لانے کی کوششیں تیزی سے ہو رہی تھیں۔ اور اجمل اعظم کے دماغ میں کالج کی ترقی کے منصوبہ جوش و خروش پر تھے۔ جب رام پور سے واپس آ کر جہاں بدیہ سعید و حقیہ پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ دہلی میں دوبارہ حکیم کبیر الدین کو حکیم اجمل خاں کے نیاز حاصل ہوئے تو استاذ کبیر حکیم اجمل اعظم کا ارشاد ہوا۔

”جدید تنظیم کے تحت تصنیف و تالیفات کا ایک شعبہ کھولا جا

جا رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مولف اول کی جگہ کام کرو۔“

کیونکہ سعادت مند اور لائق و فائق شاگرد کے اندر چھپی ہوئی طاقت کو استاد محترم کی دور بین و دور رس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا۔

یہ ارشاد نہ صرف واجب التعمیل اور واجب الاحتمام بھی تھا بلکہ ایک شاندار اعزاز اور کھلا اعلان کہ اجمل اعظم کی جوہر شناس نگاہ میں جوہر کبیر کی کیا قدر و قیمت ہے۔

شعبہ تصنیف و تالیفات حسبِ مشاکھلا۔ کھلنے والے کالج کے لئے اگر ایک طرف قول باغ میں اینٹ اور پتھر سے عمارتیں بن رہی تھیں تو دوسری جانب علمی بنیادیں بھری جا رہی تھیں۔ یعنی عربی زبان میں نصاب کی کتب تحریر کی اور کرائی جا رہی تھیں۔

علامہ حکیم کبیر الدین کے ذمہ سب سے پہلا تحریری و تصنیفی کام جو دیا گیا تھا وہ کام ایک کتاب فنِ تمریض یعنی تیمارداری تفویض ہوا تھا جو حکیم کبیر الدین نے اپنی سخت جاں فشانی محنت سے دس ماہ ہی میں پایہ تکمیل کو پہنچا دیا تھا۔ اس کے بعد حکم ملا کہ نصاب تشریح کے لئے ایک جامع کتاب عربی ہی میں معلوم تالیف کی جائے چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں تشریح کا بہت بڑا حصہ لکھا گیا۔ تشریح کا یہ مسودہ تو زبورِ طباعت سے سچ نہ سکا۔ وقت کے تقاضوں کے تحت



نصاب تعلیم اور حکیم اجمل خاں کے خیالات اردو زبان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور اور سرکاری زبان اردو ہونے کی بنا پر اردو کی جانب راغب ہو گئی لہذا یہ عربی کا مسودہ آگے چل کر اردو قالب میں ڈھل کر تشریح کبیر کا بنیادی مواد بن گیا۔

### خدمتِ تعلیم:

شیخ الشیوخ پیر جی عبدالرزاق صاحب کے انتقال پر ملال پر اجمل اعظم خاں مناسب اسناد کی تقرری کے لئے از حد فکر مند تھے آخر اس مشکل مرحلے کے لئے قرعہ فال علامہ حکیم کبیر الدین صاحب کا انتخاب صحیح تھا۔

پیر جی شیخ عبدالرزاق سے پہلے تشریح کا مضمون ڈاکٹروں کے ذمہ پڑھانے کی ذمہ داری تھی۔ یہ پہلے طبیب تھے جنہوں نے نہ صرف خود اس کالج میں علم تشریح پڑھائی بلکہ ایسے شاگردان رشید کی ایسی پوری ٹیم تیار کر دی جو آج بھی مختلف کالجوں میں نہ صرف علم تشریح پڑھاتے بلکہ تشریح کی کتابیں بھی تحریر کر رہے ہیں۔ اس زمانے میں تشریح کی دوسری کتب پڑھائی جاتی تھیں۔

تشریحِ قدیم (عربی زبان میں)

تشریحِ جدید (اردو زبان میں)

اس پڑھائی سے طلباء کے دماغ میں کیسی کیسی الجھنیں، وسوسے اور خیالات پیدا ہوتے ہوں گے اس تلخی اور بد مزگی کا اندازہ صرف پڑھنے اور پڑھانے والوں کو ہی ہو سکتا ہے۔ حکیم کبیر الدین نے اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے تشریحِ کبیر جیسی کتاب کی تصنیف کی۔ تشریحِ کبیر کے چھپنے کے بعد جدید و قدیم تشریحِ الگ الگ پڑھانے کی ضرورت نہیں رہی اور جدید و قدیم تشریح کا فرق مٹ گیا کیونکہ اس کے قبل ایسی کوئی کتب بازار میں نہ تھی۔

تشریحِ جدید مضمون کا تمامہ اپنی اصطلاحات میں پیش کرنا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس زمانے میں آسانی سے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اس کام نے ترجمہ کے فن کو نیا قالب دے دیا اور طبی دنیا کو یہ احساس پیدا کر دیا کہ ڈاکٹری کتب کے تراجم اپنی اصطلاحات کے ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔ صرف شہ ط محنت اور بہت کی ہے۔

ان کی علم تشریح پڑھانے کی کامیابی سے متاثر ہو کر ذمہ دارانِ طبیہ کالج نے کچھ عرصہ کے بعد علامہ کو علم فزیالوجی (منافع الاعضاء) کی تعلیم طلباءِ طبیہ کالج کو پڑھانے کی سپرد کر دی۔ درس و تدریس میں علامہ نے وہ جوہر دکھائے کہ تمام طلباء آپ کے گرویدہ ہو گئے۔ علم تشریح میں کامیاب تصنیف و تالیف کے بعد اسی عہد و پابندی کے ساتھ انوکھے اور نئے مضمون منافع الاعضاء پر قلم اٹھایا اور شاہکار تصنیف منافع کبیر کے نام سے ترتیب دی۔

اب وہ مبارک ساعت آگئی جو طبی دنیا کے لئے بشارتِ کبریٰ کا درجہ رکھتی تھی یعنی مدرسہ طبیہ کبیرا یہ کے بوسیدہ مکان سے نکل کر قولِ باغ کی عالیشان عمارت میں منتقل ہو گیا۔ اور حکیم اجمل خاں جو قومی یکجہتی کی علامت تھے ان کی وسعتِ قلبی سے ایسے کالج کی بنیاد پڑی جہاں آیور ویدک اور یونانی طب کی تعلیم کے لئے مخلوط درسگاہ آیور ویدک ”یونانی طبی کالج“ کے نام سے کھولا گیا جس کی اگر بنیاد لارڈ ہارڈنگ کے ہاتھوں رکھی گئی تو افتتاح باپو مہاتما گاندھی کے ہاتھوں انجام پایا تھا۔ دہلی کا مشہور طبی رسالہ ”مجلہ طبیہ“ جس میں مدرسہ طبیہ کی ترقی نیز معلوماتِ طب کا ذخیرہ ہوتا تھا۔ یہ جی عبدالرزاق کے انتقال کے بعد بند ہو گیا تھا۔ لہذا پھر ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک رسالہ جاری کیا جائے جس میں نہ صرف طبی خبریں ہوں بلکہ طبی کالج کا ترجمان بھی ہو۔

۱۹۲۱ء میں ”المسیح“ کے نام سے ایک طبی جریدہ نکالنا شروع کیا جو آٹھ سال تک شائع ہو جانے کے بعد چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر بند ہو گیا۔ ان کے ادارہ المسیح سے بعد میں بہت سی نصابی کتب بھی شائع ہوئیں جس نے ہماری نصابی ضرورتوں کو بڑی حد تک پورا کر دیا۔ طبیہ کالج کے سند یافتہ اس تعلق کی بنا پر حکیم کبیر الدین کے نام سے بخوبی واقف اور کتب کی فراہمی کے لئے ان کی خدمات کے معترف بھی ہیں۔

طبیہ کالج کی شکل میں مدرسہ طبیہ کے منتقل ہونے اور قولِ باغ کی نئی عمارت میں آ جانے کے بعد عملی قوتوں میں نفاذ ہے کہ ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔ تشریح و منافع کی کتب تیار ہو چکی تھیں کہ اسی طرز پر جراحات کی کتاب بھی لکھی جائے جس کے

ذمہ دار ارکان ادارہ نے حکیم کبیر الدین ہی کا انتخاب کیا۔ جراحات کی کتاب کی تدوین و تالیف میں حکیم کبیر الدین نے اپنے مخلص دوست ڈاکٹر محمد عثمان خاں ایم او ریاست بڑوالی جو بعد میں والدہ جہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں داخل ہو گئے تھے، کو بھی اپنے اس کام میں شریک کر لیا تھا۔ گو اس کتاب کا بڑا حصہ جدید علم جراحات کا ترجمہ ہے مگر اصطلاحات کے طویل و عریض مرحلہ خازنہ کو جس انداز میں پہلی بار کامیابی سے طے کیا تھا وہ صاحب تصنیف و تالیف کے لئے قابل توجہ ہے۔ تشریح منافع اور جراحات کی کتب کیا تیار کریں کہ میدان کھل گیا اور ترجمہ تصنیف و تالیف کے لئے ایک صاف ستھری اور سیدھی شاہراہ بن گئی۔

تشریح منافع اور جراحات جیسے موضوعات پر اس کے قبل بھی آگرہ اور اردو کمز لاہور میں کتب تحریر کی گئی تھیں لیکن حکیم کبیر الدین جیسی تیار کردہ آسان و عام فہم کتابیں نہ تو کسی نے تحریر کی تھیں نہ ترجمہ اور نہ ہی مرتب کی تھیں۔ ۱۹۲۵ء تک طبیہ کالج کے لئے نصابِ تعلیم تیار ہو چکا تھا۔ جس میں قدیم و جدید دونوں طرح کے مضامین شامل ہیں۔

اس عظیم کام سے فواعت کر کے اس سے بھی زیادہ اہم کام اصلاح نصاب کی جانب توجہ دی گئی جس کی جانب المسیح روزِ اول ہی سے زور دے رہا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں اس علمی مجلس کی تشکیل ہوئی اور دس دنوں و منصوری کے درمیان واقع قصبہ راج پور میں طب یونانی کے عظیم رہنما حکیم اجمل خان کی نگرانی میں اس کام کی ابتدا کی گئی۔ جو طب یونانی کی تاریخ کے لئے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کام شروع کرنے سے پہلے اجمل خان نے ایک تحریر اپنے خود ہاتھ سے تحریر کی جو معاہدہ اجمل کے نام سے منسوب ہے۔

اس عہد نامہ کے الفاظ یہ ہیں۔

ہم نے آج ۲ جولائی ۱۹۲۶ء کو جمعہ کے دن "اصلاح طب" کا کام جو حقیقت میں یونانی طب کے لئے بمنزلہ اساس کے ہے شروع کیا اور ہم خداوند تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے اس نیک کام میں مدد دے اور ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس جلیل القدر خدمت کو اپنی استطاعت کے مطابق برابر انجام دیتے رہیں

رہیں۔

اجمل

فضل الرحمن محمد الیاس خاں محمد کبیر الدین

عبدالحفیظ

سیدناصہ عباس

اس معاہدہ نامہ پر نہ صرف اپنے دستخط ثبت کئے۔ بلکہ پہلے ثبت کئے۔ اس کے بعد دوسرے اراکین مجلس سے ارشاد ہوا کہ وہ وصیت اجملی پر دستخط کر کے حیات کے آخری لمحات تک اس علمی عہد و پیمان کے پابند ہو جائیں۔

۱۹۱۶ء میں حکیم کبیر الدین نے المسیح نام کا جو ادارہ طبی کتب کی فراہمی کے لئے قائم کیا تھا، اس میں حکیم محمد عبدالواحد حکیم محمد صدیق۔ حکیم سید محمد یوسف نیر حکیم حبیب اللہ شامل تھے جنہوں نے المسیح سے کئی کتب شائع کرائیں لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ ان کتب میں ایک تاریخی غلطی یہ کی گئی ہے کہ صرف ناشر کا نام ہے مصنف مرتب یا مؤلف کا نام نہیں ہے۔

مذکورہ معزز عہد نامہ جو حکیم اجمل خان سے ہوا تھا ان قوتوں کو تیز تر کر دیا جو پہلے ہی سے محرک تھیں۔ اب حکیم کبیر الدین کے تراجم و تالیفات میں اصطلاح فن اور تجدید و احیاء کے عناصر نمایاں ہونے لگے۔ تھوڑے تھوڑے دنوں میں انھوں نے تصنیفی میدان میں ان گم گشتہ رازوں کو آشکار کرنا شروع کر دیا جو مخفی تھے۔ مگر اہل فن کی نظروں سے اوجھل اور دور تھے لیکن اہل نظر اسے سن کر یا پڑھ کر اسے نئے انکشافات کا نام دیتے اور بہ نظر استحسان اس کا استقبال کرتے جیسے اخلاط کا نظریہ۔ دورانِ خون کا مسئلہ قلب کی کوڑیاں یا کان کی بڈیوں و عظیبات المسیح کا بیان وغیرہ وغیرہ۔

اس طرزِ خدمت سے فن میں ایک نئی شان پیدا ہو گئی۔ اطباء کی مرعوب ذہنیت کا خاتمہ ہونے لگا فن کو ایک نئی شان ملنے لگی اور اس طب پر جو چہار جانب سے جاوہیا حملہ ہونے لگے تھے ان سے محفوظیت ہونے لگی۔

حکیم اجمل خان کے انتقال کے بعد شریف منزل میں اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی جس کی بنا پر طبیہ کالج بھی اس زد میں آ گیا اور خاندان شریفی کی ہر چیز تباہ ہونے لگی۔

اس دور میں حکیم کبیر الدین جیسے قدیم خدمت گزاروں کی خدمت سے طبیہ کالج محروم ہو گیا۔

جن لوگوں نے حکیم اجمل خاں سے اصلاح طب کا عہد و پیمان کیا تھا ان کو ہی طبیہ کالج میں داخلہ سے محروم کر دیا گیا تھا۔

ان حالات میں مجبور ہو کر ۱۹۳۵ء میں خدمت خلاق اور فلاح و بہبود طب کی خاطر ایک دوسرا ادارہ جامعہ طبیہ قائم کر لیا۔ اس جامعہ طبیہ کو گلی تو اسم جان (موجودہ حیدر علی کالج) میں حکیم محمد کبیر الدین حکیم محمود الیاس خاں اور حکیم محمد فضل الرحمن خاں نے قائم کیا تھا اور حسن اتفاق دیکھئے کہ یہ تینوں حضرات شیوخ جامعہ کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ جامعہ طبیہ نے اپنے اعلیٰ تعلیمی نظام کی وجہ سے بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ لیکن اسی دوران حیدرآباد کے ناظم طبابت حکیم نواب مقصود جنگ بہادر نے نظامیہ طبیہ کالج کے لئے جامعہ طبیہ کے اساتذہ کو دعوت دی کہ وہ جامعہ طبیہ چھوڑ کر نظامیہ طبیہ کالج میں درس و تدریس دیں۔ اس دعوت شاہی نے بیشتر اساتذہ کو بہتر تنخواہ و مشاہرہ کے عوض حیدرآباد کا سفر کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن حکیم الیاس خاں نہ گئے اور انہوں نے بحسن و خوبی ادارہ طبیہ کالج کی دیکھ ریکھ کرنی شروع کر دی۔ شاید قدرت کی یہ مشیت ایڑوی تھی کہ اس طور پر جامعہ طبیہ قائم رہے۔ ۱۹۳۹ء میں حکیم کبیر الدین کو نظامیہ طبیہ کالج کا وائس پرنسپل بنا کر تعلیمی نظام حکیم صاحب کو سونپ دیا گیا۔

اس کالج میں حکیم کبیر الدین نے اپنے حسن اخلاق سے اور تعلیمی تجربہ کی بنیاد پر چند اصلاحات کیں جیسے معیار داخلہ و نصاب تعلیم میں اس طور پر تبدیلی کی کہ طب قدیم کے ساتھ طب جدید کے ان مضامین کی تعلیم بھی دی جانے لگی جن کا حاصل کرنا دورِ حاضرہ اور مستقبل میں اطباء یونانی کے لئے ضروری ہوتا۔ حکیم صاحب ایک انتہائی حساس دل اور صاحب فن طبیب تھے اس لئے حکیم صاحب کی بعض ایسی تحریکات کی جو بعد کے غیر فنی ناظم طبابت کی جانب سے کی گئی تھیں مخالفت کر کے حکیم کبیر الدین کے خلاف محاذ تیار کیا گیا۔ حکیم صاحب نے استعفیٰ دیا جو نواب صاحب نے منظور نہ کیا حکم سلطانی کے طور پر یہ استعفا بعد میں حکیم صاحب نے واپس لے لیا

لیکن جڑیں مخالفت کی تیز تر ہو گئی تھیں۔ سازش کا نیچے سے اوپر تک جال بچھا دیا گیا کہ اب کالج کو حکیم صاحب کی خدمات کی ضرورت نہیں رہی۔ آخر حکیم صاحب کو کالج کو خیر باد کہہ کر تصنیف و تالیف کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ اور وہ اپنی قدیمی شائع شدہ کتب کی از سر نو ترتیب و تدوین میں لگ گئے چنانچہ مباحث اخلاط پر ایک عالمانہ کتب شائع کرنے کے علاوہ شرح اسباب کے ضمیمے پر نظر ثانی کی اور بہت سے فوائد کے اضافہ کے ساتھ قدیم و جدید علاج میں موازنہ ثابت کیا۔

نظام حیدر آباد نے آپ کو شہنشاہ تصنیفات کے خطاب سے نوازا اور کلیات ادویہ کی تصنیف پر توصیفی نوٹ تحریر کیا۔

تخریر و تصنیف کے علمی دور اور پیشے کے سلسلے میں (۹) نو تمغے حاصل کئے تھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی طبیہ کالج کے پرنسپل حکیم عبداللطیف فلسفی کے اصرار اور والس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین کی فرمائش پر موصوف کا تقرر طبیہ کالج میں بحیثیت ریڈر کے ہوا۔ اور امور طبیہ کی تعلیم حکیم کبیر الدین کے ذمہ سپرد کی گئی۔ یہ تو ان کا اصل موضوع تھا دل کھول کر پڑھایا اور خوب داد تحسین حاصل کی۔ طلباء اور اساتذہ دونوں مستفید ہوئے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد حیدر آباد کی طرح یہاں کی فضا بھی راس نہیں آئی۔ بوجہ مجبوری ۱۹۶۰ء میں علی گڑھ سے رخصت ہو کر دہلی آگئے اور ۱۹۶۵ء تک مشیر محکمہ ترجمہ ہمدرد دو خانہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں جامعہ طبیہ دہلی کی انتظامی کمیٹی کے رکن بنائے گئے اور آخر تک دونوں کے ممبر رہے۔

## مرض الموت وفات :-

آخر دنوں میں عرق النساء کی تکلیف میں مبتلا ہو گئے تھے۔ کچھ دن موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہ کر نہ صرف طب کے بلکہ ہندوستان کے پایہ تخت میں حرکت قلب بند ہو جانے کی بنا پر ۹ جنوری ۱۹۷۶ء کو سات بجے بعد نماز مغرب بیاسی (۱۲) سال کی عمر میں مالک معبود سے جا ملے اور طب کا یہ منور ستارہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ ان کی آخری آرام گاہ قبرستان چیلیان نزد دہلی عید گاہ ہے۔

## پسماندگان :-

آپ کی اہلیہ آمنہ خاتون جن کا حکیم صاحب کی حیات میں انتقال ہو گیا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں ۴ صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔ جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ ڈاکٹر صلاح الدین بی۔ ایچ ڈی۔ کیمسٹری۔ پہلے پنجاب یونیورسٹی میں لیکچرر تھے پھر سندھ یونیورسٹی میں تبادلہ کر لیا۔ پھر ریٹائرڈ ہو گئے۔

۲۔ ڈاکٹر علاء الدین صاحب۔ پی۔ ایچ ڈی۔ فارسی۔ پہلے انھوں نے بی فارما پھر ایم فارما کے لئے انگلینڈ گئے پھر ایم کیو اے چلے گئے اب وہاں ملازم ہیں۔

۳۔ ڈاکٹر محمد جمال الدین۔ ایم۔ ڈی۔ یہ حیدرآباد دکن میں عثمانیہ اسپتال میں ڈاکٹر ہیں۔

۴۔ جلال الدین۔ ایم۔ ایس۔ سی۔ انھوں نے علی گڑھ سے ENTOMOLOGY میں پاس کی تھی۔

صدیقہ خاتون سب میں بڑی تھیں بھائیوں سے بھی۔ ماہ شعبان میں حکیم کبیر الدین صاحب کے انتقال سے کچھ پہلے انتقال ہوا۔

حکیم کبیر الدین صاحب نے اپنی تصنیفات و تالیفات کے ذریعہ طب تصنیفات :- یونانی اور اردو زبان و ترجمہ کے فن کو ایک نئی زندگی دیا۔ اس فن کو اس قابل بنا دیا ہے کہ آج وہ دوسرے فنون کے مقابل علوم کے برابر کھڑی ہے۔

آپ نے ۸۲ سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور قریب قریب بیاسی ہی کتب تحریر کیں

## معالجات :-

اکبیر اعظم۔ جلد اول دوم  
ترجمہ کبیر۔ شرح اسباب و علامات جلد اول دوم

تشریحی تصاویر۔

تشریح۔

حصہ اول دوم  
" "

تشریح کبیر  
تشریح صغیر

منافع الاعضا۔

منافع کبیر۔

کلیات۔

مخازن التعليم۔ علاج الامراض۔ القراپارین۔ بیاض کبیر دہلی کا مطب۔ حصہ اول  
دوم۔ دہلی کے مرکبات۔ سوم۔ دہلی کی دوا سازی۔ قانونچہ۔  
کلیات قانون۔ اول۔ دوم  
کلیات نفسی۔ اول۔ دوم

ادویہ دوا سازی۔

صدیہ۔ کلیات ادویہ۔ علم الادویہ۔ کتاب الادویہ۔ کتاب انگلیس۔ مجموعہ کبیر۔

علم الجراحت۔

کتاب الجراحت حصہ اول دوم

علم الامراض۔

کتاب تشخیص حصہ اول دوم  
رسالہ جات۔

رسالہ حمیات۔ رسالہ حاشیہ وغائبہ۔ رسالہ امراض صبیان۔ رسالہ جدی۔



(چیک)

- رسالہ مساع الصدور۔  
 رسالہ مقياس الحارث۔  
 رسالہ قبض و بوا سیر۔ (حاصور و با سوز)  
 آتشک۔  
 سوزاک۔  
 اوزان الادویہ۔ رسالہ اذران طئی۔  
 بجان۔  
 اخلاط۔  
 وبال و نکال یعنی آتشک و سوزک  
 سم الفار۔ رسالہ کچلہ۔ رسالہ مدار بوٹی۔ رسالہ اذراقی۔  
 قارورہ۔ نبض۔

### لغات الادویہ :-

- لغات کبیر۔ طبی فرہنگ۔ القابلہ۔ معالجات امراض نسواں۔ الاکسیر  
 تجربات قسطن۔ آسان نسخ۔ عمل احتقان۔  
 رسالہ جراثیم اور طبیعت۔  
 دوران خون۔  
 طاعون۔ رسالہ ہیضہ۔  
 سل و دق۔  
 دیدان امعاء۔  
 صدوری مجربات۔ اصول حیات۔  
 تشریح تصاویر کلاں۔ تصاویر احشاء۔ تشریح اعضاء نسوانی۔ کلیات کے  
 مباحث ضروری۔  
 ارمغان وغیہ وغیہ۔

غرضکہ حکیم کبیر الدین مرحوم کا یہ کارنامہ سنہرے حروفوں میں لکھنے کے قابل ہے کہ انہوں نے فن طب کی نصاب کی ان کتب کی فراہمی کی جو آج تک کوئی دوسرا ان کے حصہ کا عشرِ عشیر بھی نہیں کر سکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جتنے سال ان کی عمر تھی اتنی ہی انہوں نے کتب تحریر کی تھیں۔ ان کی تصانیف کو اگر اوپر نیچے رکھا جائے تو اتنی لمبی لائن لگے گی جتنا ان کا قد تھا اور اگر ان کی تصنیف کردہ کتب کا وزن کیا جائے تو ان کے وزن کے برابر ان کی تصانیف کی ایک ایک جلدیں ہیں۔

# حکیم محمد اسحاق

۱۹۷۵ء

۱۸۹۵ء

## مجاہد تحریک آزادی اور کانگریسی رہنما

اعظم گڑھ جس کی بنیاد کبرماجیت نامی سورج بنسی خاندان کے نو مسلم بیٹے اعظم خان ۱۶۶۵ء میں رکھی تھی کئی خصوصیات کا حامل ہے۔ پہلی تو یہ کہ قومی یکجہتی یا سبند و مسلم اتحاد کا عملی نمونہ یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ دوسری تحریک آزادی میں سب سے پہلی پنجابیت عدالت یہیں قائم ہوئی۔ تیسری شبلی کالج جو ایک اقلیتی تعلیمی ادارہ ہے اور یوپی کا علی گڑھ کے بعد سب سے بڑا علمی تاریخی گہوارہ ہے۔ چوتھی خصوصیت جو سب سے بڑھ کر بے دار المصنفین شبلی اکاڈمی ہے۔ جسے ۱۹۱۴ء میں حضرت علامہ شبلی نعمانی نے اپنے نوجوانوں کی تعبیر سمجھا تھا اور اپنی زندگی کا حاصل خیال کیا تھا۔ شبلی اکاڈمی ایک ایسا فائوس تھا جس کی روشنی میں اس ضلع میں علم، ادب، تہذیب و تمدن سیاست اور معیشت جگمگا اٹھی تھی۔

خاندان :-

ان کا خاندان اعظم گڑھ کے علمی و ادبی خانوادے کا ایک مشہور و معروف گھرانہ تھا جو معاشی میدان میں کمزوری لیکن اخلاقی تہذیبی اور معاشرتی طور پر مضبوط اور علمی دولت سے مالا مال تھا۔ حکیم محمد اسحاق کے دادا حافظ محمد منیہ جو کچھری میں ایک جانب مہر تھے تو دوسری جانب اپنے پیشے کی بنا پر ہر خاص و عام میں بے پناہ مقبول اور

شہر کے وکلاء، مختاروں، حکاموں سے نہ صرف روابط بلکہ قریبی شناسائی بھی تھی۔ ان کے والد شہر کے اچھے حفاظ میں شمار ہوتے تھے اور اعظم گڑھ شہر کی شاید ہی کوئی ایسی مسجد ہو جس میں انھوں نے قرآن کا ختم نہ کیا ہو۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ عید کا چاند نہیں ہوا اور ان کے والد چند مخصوص نمازی احباب کو لے کر ایسی مسجد کا رخ کرتے جہاں رمضان شریف میں قرآن نہ ختم ہوا ہو۔ رات بھر میں قرآن ختم کرتے روپیہ آٹھ آنے کی مٹھائی تقسیم ہوتی اور سحر سے قبل سب لوگ گھر واپس آجاتے بغرض کہ ان کا خاندان اپنے وقتوں کا گہوارہ ادب اور علم کی دولت سے مالا مال تھا۔ ان کے دادا کے انتقال کے بعد ان کے ایک معتقد نشی معین الدین نے جو اشعار کہے تھے وہ ذیل میں درج ہیں۔

حافظ نامور مسیر احمد	کامل عصر و نیک نام طبیب
کرتے تھے جب تلاوت قرآن	لطف ملتا تھا اک عجیب و غریب
دور سے لوگ سُننے آتے تھے	خوش نوا ایسے تھے امام و خطیب
تھے وہ مسکین نواز بھی ایسے	ساتھ کھاتے تھے روز چند غریب
حیف اکیس ماہ مارچ کو	یعنی منگل کی نصف شب کے قریب
سوئے جنت ہوئے روانہ وہ	با عنایات سمیع و مجیب

بہر سال وفات لکھ دو حنیف

ہائے حافظ منیر پاک طبیب

ان کا انتقال مارچ کی ۲۱، ۱۹۳۳ء کو ہوا تھا۔

## پیدائش :-

اعظم گڑھ کے مشہور محلہ کوٹ میں ۱۸۹۵ء ان کی پیدائش ہوئی اور وقفہ دورانِ تعلیم کے سوا قریب قریب سارا وقت محمد اسحاق کا اعظم گڑھ میں گذرا۔

## تعلیم :-

ابتدائی تعلیم حسب دستور دادانیر والدین کے سایہ عاطفت میں ہوئی اور مزید

تعلیم کے لئے مدرسہ اسلامیہ باغ میہ ٹیٹو میں مولوی خدایت بخش سے رجوع ہوئی و فارسی کے اچھے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی میں کلام موزوں کہتے تھے، شرح ملا جامی اور منطق کی حاصل کی۔ ۱۹۰۷ء میں بعد ارسال مشہور استاد القریٰ حافظ حبیبی سے قرآن پاک کا حفظ کر کے محلہ کی مسجد میں پہلی تراویح پڑھائی۔

طبی تعلیم :-

۱۹۱۲ء میں ان کے والد نے انھیں طب کی تعلیم کے لئے دہلی مولانا حالی کے ایک عزیز قاری عبدالحلیم انصاری کے ساتھ حکیم اجمل خاں کے ایک شاگرد عبدالغفور وکیل کے ایک سفارشی خط کے ہمراہ روانہ کیا۔ چنانچہ ان کا داخلہ مدرسہ طبیہ دہلی میں ہو گیا اور تعلیم طب شہ و شہ ہو گئی۔

جہاں داخلہ کے لئے مزید عربی کی تعلیم بھی حاصل کی۔

تاریخی سہوا اور غصہ :-

دوران تعلیم مدرسہ طبیہ دہلی میں ایک واقعہ ہو جانے کی بنا پر ان کا نام مدرسہ سے خارج کر دیا گیا۔

جب یہ اعلیٰ درجہ کا امتحان دے چکے تھے اور درجہ سوم والوں کا امتحان ہو رہا تھا کہ ہم جماعتوں کو خیال گزرا کہ نیچے درجات والوں کو امتحان میں مدد دی جائے امتحان کا قاعدہ یہ تھا کہ پہلے پرچہ تقسیم ہو جاتا تھا۔ پھر آواز بلند پڑھا جاتا تھا۔ ان کے ساتھ جو طلباء مدد پر آمادہ تھے انھوں نے یہ سوالات سن لئے اور پاس کی مسجریں بیٹھ کر کتابوں کی مدد سے وہ سوالات حل کرنے لگے۔ محمد اسحاق بھی ان سوالات حل کرنے والے طلباء میں شامل تھے۔ شامت اعمال کہ کسی طرح یہ خبر پہنچی حکیم سید عبدالرشاق جو معلم تشریح الاعضاء تھے کومل گئی تھی وہ مسجد میں داخل ہوئے اور تمام موجود طلباء کے نام لکھ کر حکیم اجمل خاں کے سامنے پیش کر دیئے۔ اس واقعہ کی جانچ کے لئے حکیم اجمل خاں نے ایک تحقیقاتی کمیشن پر سالہ رفیق کے ایڈیٹ اور سابق جج پیر زادہ صاحبین کی سربراہی میں مقرر کر دیا۔ تحقیقی

رپورٹ کی بنیاد پر دیگر طلباء کے ساتھ ان کو کالج سے اخراج کا حکم سنایا گیا اور مزید امتحان میں شرکت سے محروم کر دیا گیا۔ اس دوران حکیم اجمل خان شملہ چلے گئے۔ طلباء کی جانب سے حکیم صاحب کو متعدد تار دیئے گئے کہ ہاسٹل میں رہنے اور امتحان میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ حکیم اجمل خان کی شملہ سے واپسی پر تمام طلباء ان کی خدمت میں حاضر ہوئے حکیم صاحب نے شرف باریابی بخشا۔ اس موقع پر حکیم اجمل خان کے پاس مدرسہ طبیبہ کے مشیر اعلیٰ پیرزادہ محمد حسین بھی تشریف رکھتے تھے۔ حکیم اجمل خان نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ دیکھئے اگر میں ان کو معاف کر دیتا ہوں تو دوسرے طلباء کو شے ملتی ہے اور اگر سزا دیتا ہوں تو ان کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ حکیم صاحب کے سامنے تمام طلباء نے اپنی غلطی کا اعتراف اور توبہ کی تو حکیم صاحب نے ازراہ شفقت معافی اور ضمنی امتحان میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمادی۔

دورانِ تعلیم انھوں نے طب کے اُن اساتذہ سے کسب فیض حاصل کیا۔ جو نہ صرف اپنے وقت کے جید طبیب تھے بلکہ ان کو شفاء الملک۔ مسیح الملک حکیم اجمل خان کے خاص شاگردِ رشید ہونے کا بھی موقع ملا۔ ایک بار حکیم اجمل خان نے ان سے کہا کہ ”آج تم مرضاء کی تعداد کا شمار کرو۔ گرمیوں کے دن تھے اور ۱۲ بجے تک مریضوں کی تعداد پانچ سو کے قریب ہو چکی تھی۔ حکیم اجمل خان کا مریض کی نبض پر دو ایک ثانیے کے لئے ہاتھ ہوتا اس کے بعد سیٹھے ہوئے طالب علموں کو نسخہ لکھنے کا اشارہ ہوتا اور جو طالب علم سب سے پہلے ان کی خدمت میں نسخہ پیش کر دیتا اس میں بقدر ترمیم و اصلاح کر کے نسخہ مریضوں کے حوالے کر دیتے۔ حکیم صاحب کے وہاں نسخہ لکھنے والے شاگردوں کی تعداد بارہ کے قریب تھی اس طور پر ان کو پانچ سو مریض یومیہ کے حساب سے ۲ سال تک حکیم اجمل خان کی شاگردی اور مریضوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔

حکیم اجمل خان کی سربراہی میں طب یونانی کو فروغ دینے اور نصاب تیار کرنے کے لئے اصلاح طب کے نام سے جو ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی اس میں حکیم کبیر الدین جیسے نازِ طبیبی کتب کے مصنف، پروفیسر حکیم فضل الرحمن صدر الاطباء حکیم محمد

الیاس خاں۔ حکیم سید نامہ عباس اور حکیم عبدالحمفیظ جیسے شیوخ جامعہ کے ساتھ یہ بھی شریک تھے۔

اعظم گڑھ جو اس وقت مشاہیر اطباء کا مرکز اور ان مشاہیر اطباء کے علاج و معالجہ کا چہار جانب شہرہ تھا ان اطباء میں حکیم الہی بخش، حکیم علی منقید زنگی پوری، حکیم کرامت حسین، حکیم سید بدلو، حکیم عبدالواحد غازی پوری، حکیم محمد نبی جہاچوری، حکیم شاہ دیوبند، حکیم سرستیہ قابل ذکر ہیں۔ ایسے ہی حالات میں انہوں نے اعظم گڑھ کے محلہ کوٹ میں دواخانہ کھولا۔ شروع شروع میں مرضاء کی تعداد دس پندرہ رہی۔

### سیاسی و سماجی خدمات :-

ابھی حکیم مہاراسحاق کی عملی زندگی یعنی طبابت کی پرنکلیس شروع ہی ہوئی تھی کہ ملک میں رولٹ ایکٹ کی مخالفت کا آغاز ہو گیا اور پورے ملک میں ایکٹ کی مخالفت کل ہند پیمانے پر شروع ہو گئی۔ اسی موقع پر اتحادیوں نے ترکی کے حصے بننے پر بھی شروع کر دیتے جس کی بنا پر سارے ہندوستان میں ایک عام بے چینی چیل گئی اور کل ہند پیمانے پر مندرجہ ذیل مطالبات کی مانگ ہوئی۔

۱۔ سرکاری خطابات چھوڑے جائیں۔

۲۔ سرکاری اسکول چھوڑے جائیں۔

۳۔ شراب چھوڑی جائے اور شراب خانوں پر پکٹنگ کی جائے۔

۴۔ سرکاری عدالتوں کا بائیکاٹ کیا جائے اور وکیل و کالت چھوڑیں۔

۵۔ ودیشی کپڑوں کا استعمال ترک کیا جائے اور غیر ملکی کپڑوں کی دوکانوں پر پڑتال کی جائے۔

غرضکہ سارے ملک میں قومی بیداری کی تحریک پیدا ہو گئی تھی اور اس تحریک کے اثرات سے اعظم گڑھ بھی نہ محفوظ رہ سکا۔

اساتذہ سے سرکاری اسکولوں کو چھوڑنے اور عوام سے کھڈر کا بنا کپڑا اور سوت کا تنے کو کھیا گیا

اسی زمانے میں خلافت تحریک نے اپنا زور دکھانا شروع کر دیا ۱۹۱۹ء میں

گاندھی جی تحریکِ خلافت کے صدر پہلے ہی چنے جا چکے تھے سہ ماہی ۱۹۲۰ء کو کلکتہ اجلاس نے ملک گیر پیمانے پر بیداری کی لہر پیدا کر دی تھی اور ۲ ستمبر ۱۹۲۰ء کو جب غیر ملکی کپڑوں کا مکمل بائیکاٹ کیا گیا تو ہندو اور مسلمان متفقہ طور پر ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر آگئے اور گاندھی جی کی قیادت میں سب نے مل جل کر کام کرنا شروع کیا اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں یہ تحریک پھیل گئی۔

## بدیشی بائیکاٹ :-

۱۹۲۱ء میں جب غیر ملکی کپڑوں کے مکمل بائیکاٹ کا سلسلہ شروع ہوا تو پورے اعظم گڑھ میں یہ تحریک زور پکڑ گئی اور خلافت کمیٹی و کانگریس پارٹی کے ممبروں کے ساتھ حکیم محمد اسحاق بھی شہر و قصبات کا دورہ کر کے غیر ملکی کپڑوں کی گانٹھوں کو مہر بند کرنے اور ایسا نہ کرنے والوں کی دوکان پر ٹہرتال کی جاتی جس سے خریداروں کی آمد کم ہوتی گئی چونکہ اعظم گڑھ کا قصبہ مٹھو کو کپڑے کا صنعتی مرکز ہونے کا فخر حاصل تھا اس لئے کانگریس اور خلافت کمیٹی کے چوٹی کے لیڈران موتی لال نہرو اور مولانا محمد علی و شوکت علی برادران برابر آتے رہے۔ اسی زمانے کا ایک واقعہ یہ ہوا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کو پاپا سے مٹھو آرہے تھے کہ ٹرین چھوٹ گئی۔ موسم سخت تھا اور دوسری کوئی سواری نہ تھی۔ ریلوے اسٹیشن کے اور سیئر امجد علی غزنوی کے والد نے ریلوے سے ٹرالی میں نہرو کو مٹھو پہنچایا جس کی پاداش میں اور سیئر امجد علی کو ملازمت سے معطل کر دیا گیا۔

دینی مدارس خصوصاً اعظم گڑھ کا دینی مرکز درسگاہ مدرسۃ الاصلاح کے طلباء اور اساتذہ خصوصاً مولوی شبلی منکلم مولانا امین احسن اصلاحی۔ اختر احسن اصلاحی اور مولوی عبدالجلیل اصلاحی نے تحریکِ آزادی میں بہت تعاون دیا۔ ان کے ساتھ تحریک میں دیگر جن لوگوں نے تعاون دیا ان میں ان کی اہلیہ محترمہ نے نہ صرف تعاون دیا بلکہ حکیم محمد اسحاق کی بڑی بہن نے مٹھو کی لٹری ساری بہیا کئی کے دوپٹے اور دوسرے غیر ملکی کپڑوں کی بھولی جلائی۔ مستورات میں تقابیر



کیں اور دیگر خواتین کو ترغیب دلائی۔

ان کے ان کارناموں پر اچھا اثر مرتب ہوا۔ شہر میں تو اس تحریک نے اس قدر نمایاں کامیابی حاصل کر لی کہ مولوی مستود علی ندوی اور سید سلیمان کی کوششوں سے ایک سودیشی کمپنی کی دوکان کھول دی گئی۔ عبدالرؤف ساکن پھاؤں اور شاہد یالین اس کے نگران اور فونٹ کنڈرگان مقرر ہوئے اس کے ساتھ ساتھ حکیم محمد اسحاق نے اپنے دیگر ہندو مسلم ساتھیوں بھوانی پرشاد وکیل حاجی عبدالغفور رحمت۔ عبدالشکور دفتر ہی بدرالدین خاں۔ ظہیر خان مولوی اسلم انصاری۔ یاسین مرحوم و حافظ احمد اور پرشوتم کھار وغیرہ کے ساتھ تحریک کے دوسرے رشتہ جیس کا مقصد شراب اور سگریٹ کی دوکانوں نیز آب کاری کے دفاتر پر پکٹنگ کی جس کی وجہ سے بہت سے ساتھی انگریزی مظالم کے شکار بھی ہوئے۔ جن میں پرشوتم نہ فہرست ان مظالم کا شکار رہا۔

تحریک کے تیسرے رشتہ کے طور پر ضلع کے مختلف قصبات میں عدالتی پنچائیں قائم کی گئیں والنتیہ بھرتی کیے گئے اس تحریک کے تیسرے جز کا سب سے اچھا نتیجہ ٹوئیں دیکھنے کو ملا۔ جہاں والنتیس کی باقاعدہ تربیت اور بھرتی ہوئی تھی۔

تحریک کے دوسرے رشتہ اساتذہ سے اسکول چھوڑنے کی اپیل پر جہاں اساتذہ اسکولوں میں پڑھانا چھوڑ دیا لہذا تحریک کی کامیابی اور ایک سے مجاہد کی طرح انھوں نے بھی اپنی مادر علمی مدرسہ اسلامیاہ باغ میں پیٹو میں پڑھانے کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لی۔ دس بجے تک مطلب میں رہے، پھر اسکول پڑھانے چلے جاتے وہاں سے گاندھی جی کے قائم کردہ اسکول جو دھی پور میں چلے جاتے اور وہاں چرخ چلاتے اور سوت کاتتے۔ اس طرح انھوں نے دو تین سالوں کے اور خود اپنے ہاتھ سے کاتے سوت کا ایک پا جامہ بنوایا۔

تحریک کی دوسری کڑی خود اپنے اسکولوں کو کھولنا اور ان اساتذہ سے جو سرکاری اسکولوں کو چھوڑ چکے تھے یا جو طلباء اسکولوں میں تحریک کے زیر اثر تعلیم کو خیر باد کہہ چکے تھے یا جن کا نام اسکول سے خارج ہو چکا تھا اس مقصد کے تحت محلہ پہاڑ پور میں گاندھی جی کے نام پر ایک اسکول مولانا شبلی کے والد صاحب اللہ

کے مکان میں کھولا گیا۔ شاہ علاؤ الحق وکیل اس مدرسہ کے اہم سرگرم کارکن اور مدرس تھے۔ ذریعہ تعلیم انگریزی اور اردو تھا۔ طالب علموں میں مہاراج گنج کے شفیع صاحب رفیق صاحب اور رام آسرے قابل ذکر تھے۔

یہ رام آسرے وہی ہیں جنہوں نے اسی زمانے میں قصبہ سرائے میں مسلمانوں کے ایک عام جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے دعائے قنوت پڑھی کہ آپ و نشکرک ولا نکفرک و نخلع و نترک من یفجرک پڑھتے ہیں پھر آج آپ باطل کا مقابلہ کرتے ہوئے کیوں گھبراتے ہیں۔

الگورہ فنڈ:-

حکیم محمد اسحاق کی قومی خدمات میں ایک بڑی خدمت ترکی کی نئی حکومت کے لئے فنڈ کی فراہمی تھی۔ اس کے لئے انہوں نے اپنے ہمعصر اور تحریک آزادی کے متوالے مولوی مسعود علی کے ساتھ ساتھ روزانہ پچاس پچاس میل کا سفر کیا تھا۔ اس اسکیم کے تحت انہوں نے ۱۹۲۱ء میں ایک لاکھ کا فنڈ اکٹھا کیا تھا جس میں شہر کے علاوہ مٹو۔ مبارک پور۔ سرائے پور پھر یہاں اور منڈیار کے لوگوں نے بڑی واغالی سے نہ صرف چندہ بلکہ زیورات تک دے دیئے تھے پھر یہاں کی ایک خاتون ہمیشہ جسٹس اقبال یعنی والد علی نے اپنا طلائی نکلس دے دیا تھا جس کی قیمت اس دور میں پانچ سو روپے تھی۔

تحریک آزادی سے دلچسپی اور شرکت کی بنا پر ان کے خاندان کے زیادہ تر افراد بھی تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ حکیم اسحاق کے والد صاحب نے انجمن کے صدر بنائے گئے جو بازو پر سیاہے لگانے احتجاج میں تیار رہتے تھے۔ اعظم گڑھ میں تحریک آزادی کے زیادہ تر جلسے کربلا کے میدان میں رہتے تھے۔ یاسین اور چھپدو رات رات بھم جھنڈیاں بناتے رہتے تھے حکیم اسحاق کی بیوی اور بڑی بہن بھی شریک جلسہ ہوتیں۔ چنانچہ جب ایک بار بلبل ہند سروجنی نائیڈو جلسہ میں شرکت کے لئے آئیں تو دیگر خواتین کے ساتھ ان کی بیوی اور ہمیشہ سے بھی سروجنی نائیڈو کا تعارف کرایا گیا۔ جہاں کافی دیر تک

تحریک میں جو آئین کی دلچسپی کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ ان کی بڑی بہن نے تحریک میں فنڈ کے لئے ذاتی زیورات بھی دے دیتے تھے۔ یہاں تک کہ جب ناک کی کیل اور کان کے جھکے فنڈ میں دینے تو مولوی مسعود علی نے یہ سب زیورات واپس کر دیئے اور کہا کہ حکیم صاحب کی ہمیشہ سے اس سے زیادہ ملنا چاہیے چنانچہ ان کی بڑی بہن نے ان زیورات کے ساتھ ناک کی نتھ کا اضافہ کر کے تحریک آزادی کے فنڈ میں یہ زیورات دے دیئے۔ ساتھ میں حکیم صاحب کی اہلیہ محترمہ نے بھی اپنے کان ہاتھ اور ناک کے زیورات چندہ میں دیئے۔

چندے کی رقم کا حساب کتاب لاکھوں میں تھا۔ اس وقت کے جلسوں میں عوام کی بے پناہ شرکت ہوتی تھی اور بچہ بچہ کی زبان پر یہ شعر زبان زد تھا۔

بولیں اماں محمد علی کی

جان بیٹا خلافت پہ دیدو

اعظم گڈھ میں جب خلافت کمیٹی اور عدم تعاون تحریک سے مل کر ذیلی خلافت کمیٹی بنی تو اس کمیٹی میں ستاوان ممبر تھے جس میں حکیم اسحاق کا نامہ تیسرا تھا۔ تحریک میں جب گاندھی جی کی شمولیت ہو گئی تو اس موقع پر متعدد نظمیں لکھی جس کا یہ ایک شعر بہت مشہور ہوا تھا۔

حکیم اجمل خاں مسیح الملک ہی کہتے تھے

ہم ہیں گاندھی کے طرفدار ہمارا گاندھی

۱۹۲۱ء میں یہ کانگریس کے باقاعدہ ممبر بن گئے اور پارٹی کی حیثیت اس وقت بہت مستحکم ہو چکی تھی اور نمایاں حیثیت اختیار کر چکی تھی دسمبر ۱۹۲۲ء کو کانگریس کے اجلاس میں انھوں نے شرکت کی تھی۔ یہ ان کی اپنے شہر اعظم گڈھ سے کسی دوسرے شہر کے اجلاس میں پہلی بار شرکت ہوتی تھی۔ گیا میں جب کانگریس دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ تبدیلی کے موافقین اور مخالفین کے نام سے جس کی وجہ سے آپس میں سخت اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ حکیم اسحاق نے تبدیلی کے موافقین کے رہنما تھے اور کونسلوں میں جا کر شرکت کرنے کے بائیکاٹ کے مخالف تھے۔ اسی زمانے میں گیا میں خلافت کمیٹی کا بھی ایک جلسہ ہوا تھا جس میں

ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خان برابر شریک جلسہ رہتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے شہر اعظم گڑھ میں شاندار پولیٹیکل کانفرنس بھی ہوتی تھیں جس میں رات رات بھر جاگ کر پینڈال کی تعمیر ہوتی اور سارا فرش و دیگر سامان کھنڈر کا رکھا جاتا تھا۔ ہندو مسلم مل کر چندہ دیتے تھے۔ جلسہ گاہ میں نظم و نسق کا معیار اتنا بلند ہوتا تھا کہ لیڈروں کا پینڈال، سامعین کے بیٹھنے کی جگہ اور اخبار نویسوں کی گیلریوں کا باقاعدہ انتظام کیا جاتا۔ موتی لال نہرو، مولانا محمد علی، سہو جینی نائیڈو اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری برابر مشترکہ طور پر ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

پنڈت جواہر لال کے والد موتی لال نہرو ان جلسوں میں زیادہ شریک ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ مشرقی کلچر کے دلدادہ اسلامی تہذیب اور زبان کے شیدائی اور مسلمانوں کے دسترخوان اور کھانوں کے عاشق تھے۔ مشرقی اضلاع کے دورے میں اعظم گڑھ کو اہمیت دیتے تھے اور کھانا دار المصنفین میں کھاتے تھے اور مرغ و ماہی و پلاؤ کو بہت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار کا واقعہ ہے کہ مہاراجہ محمود آباد کے گھر ڈنر تھا جس میں انگریزی اسلامی اور ہندوستانی کھانے یکے بعد دیگرے کھلائے گئے۔ موتی لال نہرو اور سرتیج بہادر سہرو تو آخر وقت تک تینوں اقسام کے کھانوں سے لطف اندوز ہوتے رہے جبکہ دیگر شرکاء ڈنر پہلے ہی دور کے کھانے سے عدم واقفیت کی بنا پر پیٹ بھر چکے تھے۔ موتی لال نہرو کی طرح پنڈت جواہر لال نہرو کا بھی دار المصنفین میں قیام رہتا تھا جہاں جواہر لال نہرو، مہمان خانہ کے سامنے بنے ہوئے کنڈیوں پر اپنے کپڑے خود دھوتے تھے۔

حکیم محمد اسحاق اپنی دو خانہ کی مصروفیات کے باوجود برابر شریک جلسہ و میٹنگ رہتے تھے۔ اگرچہ اعظم گڑھ کے باہر قصبات میں بھی اکثر شرکت رہتی لیکن شام یا رات کو کسی پہرہ واپس آجاتے تاکہ صبح کے مطب کا ناغہ نہ ہو۔ کم و بیش برابر شہر سے باہر کے مریضوں کو دیکھنے جانا بھی ہوتا تھا۔ لاہور میں کانگریس کا آل انڈیا اجلاس ہونے کے بعد وہاں کے

ریزولیشن اور ہدایت کے موجب جنوری ۱۹۲۰ء میں اعظم گڑھ کانگریس کمیٹی کی ازسہ نو تنظیم ہوئی تو حکیم اسحاق اس کمیٹی میں نائب صدر مقرر کئے گئے تھے۔

ملک میں آزادی کی تحریک کے سلسلے میں کانگریس پارٹی کی مقبولیت میں اضافہ ہو گیا تھا ۱۹۲۰-۲۱ء میں کان پور میں آل انڈیا کانگریس کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا جس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد کو کرنی تھی۔ یہ اپنے رفقاء کے ساتھ شاہ گنج تک پہنچے تھے کہ ٹرین چھوٹ گئی یہ لوگ شرکت کرنے سے مایوس ہو گئے۔ جلسہ کے صدر مولانا آزاد کو تیار دیا گیا کہ خطبہ صدارت تاخیر سے شروع کیا جائے چنانچہ جب یہ اپنے رفقاء کے ساتھ جلسہ میں پہنچ گئے تو خطبہ صدارت کا آغاز ہوا۔ اسی طرح انھوں نے کلکتہ کے اجلاس میں بھی شرکت کی جس میں اکابرین ملک بھی شریک تھے۔

۲۷ فروری ۱۹۲۰ء کو سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز ہوا اور ۱۳ مارچ کو گاندھی جی نے ڈانڈی مارچ کی شروعات کر کے نمک بنانے کا قانون توڑا۔ ۱۳ تا ۱۶ فروری ۱۹۲۰ء کو واردھا میں منعقدہ اجلاس میں مندوہین کانگریس کی جانب سے عام ستیہ گردہ کا اجازت نامہ لے کر آئے تھے ان کے ساتھ ان کے دیگر رفقاء مولوی مسعود اور حاجی عبدالغفور خستہ وغیرہ نے سزاؤں ساتھیوں کے ساتھ گنی سنگھ باغ میں نمک بنا کر قانون توڑا۔ اس وقت قانون کے مطابق نمک بنانے کی سزا گرفتاری سزا اور جیل خانہ کے نیلام کا حکم تھا اس تحریک میں خاندان کے دیگر افراد میں ان کے چھوٹے بھائی شہناز اللہ۔ نور الہدیٰ۔ محمد وکیع اعظمی بھی پیش پیش رہے۔ نمک سازی کے سلسلہ میں یہ اور تحریک آزادی کے سپاہی و ساتھی سورتج ناتھ سنگھ نظام آباد جا کر عوام کو تحریک کے سلسلہ میں آمادہ کر رہے تھے کہ حکیم محمد اسحاق کو اطلاع ملی کہ شہر میں داخل ہوتے ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ پھر الہ آباد میں تحریک کے سلسلے میں صوبائی پیٹنگ تھی حکیم محمد اسحاق کو بھی شرکت کرنی تھی لیکن عین وقت ایک مریض کو دیکھنے کے لئے شہر سے باہر جانا ہوا جس کی بنا پر یہ الہ آباد نہ جاسکے۔ دیگر شہر کا، جو قریب قریب تعداد میں ۵۲ تھے جب لوٹ کر آئے تو شہر میں داخل ہوتے ہی گرفتار کر لئے گئے۔

اس طرح ان کو صوبائی کانفرنسیوں میں صوبائی ڈپٹی کمیٹی کی حیثیت سے برابر شریک

ہونا پڑتا تھا۔ ایک بار گورکھپور میں صوبائی میٹنگ تھی کھانا فراق گورکھپوری کے مکان پر جس میں مٹی کے پیالوں میں گوشت کھلایا گیا اور چائے پلانے میں کیتلی کی جگہ مٹی کے بنے ہوئے لوٹوں شکر ڈالنے کے لئے آم کے پتوں اور چائے میں شکر چلانے کے لئے آم کی چھوٹی چھوٹی شاخوں سے چمچ کا کام لیا گیا۔ حکیم اسحاق چونکہ کانگریس پارٹی کے عہدے دار ہونے کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی سے بھی وابستہ تھے اس لئے ان کی شرکت لازمی رہی تھی۔

۱۹۳۲ء میں ان کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا جس کے سبب مزید ذمہ داریوں اور تنہائی کا احساس ہونے لگا لیکن اس کے باوجود بھی قومی ملی و سیاسی رجسٹریشن میں کوئی کمی نہ آسکی۔ مطب کی پریکٹس بھی خاصی چل چکی تھی۔ اور شاید ہی کوئی ایسا موقع ہو گا جو انہوں نے مطب چھوڑا ہو ساری ادبی تہذیبی اور سیاسی مشاغل کا مرکز ہی مطب تھا۔ مرزا میں ہندو مسلمان دونوں کی تعداد ہوتی۔ اکثر شہر باہر مریضوں کو دیکھنے جانا بھی ہوتا تھا۔ حسب دستور اور وعدہ استاد طب محترم حکیم اجمل خاں صاحب کے نہ تو کسی سے فیس کا تقاضا کرتے اور نہ ہی لیتے اگر کوئی مریض خوشی خوشی دے دیتا تو عطار کے پاس جمع کرنے کی ہدایت فرما دیتے۔

اعظم گڑھ شہر میں یوں تو تعلیم کی ابتدا مولانا شبلی کے زمانے میں ہی ہو چکی تھی۔ شبلی منزل اور شبلی اسکول کی بدولت ضلع میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن بنیادی طور پر ایسی کوئی انجمن نہ تھی جو لوگوں کے اندر ادبی ثقافتی اور تہذیبی ذوق پیدا کر سکتی ہے چنانچہ اعظم گڑھ کی ایک مشہور شخصیت اسماعیل خان نے ۱۹۰۷ء میں انجمن اصلاح المسلمین کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن کے سالانہ جلسوں میں مشاہیر علماء کی شرکت ہوتی تھی۔ ان جلسوں میں شرکت کی بنا پر اقبال سہیل سے ملاقات ہو گئی اور حکیم صاحب نے پھر یہاں جانا شروع کر دیا۔ پھر یہاں کے سفر میں حکیم محمد اسحاق کئی مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی کے ہم سفر رہے۔ پھر یہاں جانے کا مقصد مولانا حمید الدین فراہی سے نیاز حاصل کرنا ہوتا تھا جو نہ صرف ایک بزرگ تھے۔ بلکہ مدرستہ الاصلاح کے باقی بھی تھے۔ حکیم محمد اسحاق عام طور پر گیارہ بجے تک مطب کرتے پھر پھر یہاں چلے جاتے وہاں سے رات گئے تک لوٹ آتے تھے مولانا

حمید الدین فراہمی کی وجہ سے سرانے میں آمدورفت شروع ہو گئی۔ جہاں مولانا امین اصلاحی اور مولانا انتہا اصلاحی سے بھی گہرے مراسم ہو گئے۔ یہ دونوں عالم تھے اور مولانا حمید الدین فراہمی کے خصوصی شاگرد بھی۔ جو آگے چل کر ان کی تحریک میں بہت معاون بنے۔ اسی درمیان ایک بار جب علامہ شبلی کے پاؤں کو حادثہ پیش آ گیا تھا یہ اپنے والد کے ہمراہ علامہ شبلی کو دیکھنے گئے اس وقت دارالمصنفین کا کتب خانہ کچھ بنگلہ میں تھا۔ اسی کے برآمدے میں مولانا قالین پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے اردگرد کتابوں کا انبار تھا اور ۱۹۱۸ء میں جب تعلیم طب سے فراغت کر کے آنے تو اپنے دوست رشید احمد کے ساتھ مولانا شبلی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے تو وہیں مولانا مسعود علی۔ سید سلیمان ندوی جیسے لوگوں سے ملاقات ہو گئی پھر مراسم بڑھے دارالمصنفین زندگی کا ایک جز بن گیا اور تقریباً ہر روز شام کو وہاں یہ نشست میں جانے لگے۔ دیگر رفقاء ادارہ سے شناسائی ہو جانے پر علاج و معالجہ کے تعلق سے دارالمصنفین کے ایک فرد بن گئے۔

تحریک خلافت کے دنوں میں ان کے روابط دارالمصنفین میں آنے جانے والے عمائدین سے بہت بڑھے گئے تھے۔ کیونکہ مرضاء آتے تھے اور حکیم محمد اسحاق کو ان سے دارالمصنفین میں ملنے کا موقع ملتا تھا۔ یکم مارچ ۱۹۲۱ء کو جب مولانا محمد علی جوہر آئے تو شاہ گنج سے دارالمصنفین تک ہزار ہا آدمی ان کے استقبال اور ایک جھلک دیکھنے کے منتظر تھے۔ اسی سال جون میں پنڈت مدن موہن مالویہ بھی شبلی منزل میں تشریف لائے اور لائبریری نیز دوسرے شعبے دیکھے اور زبان کے مسئلے پر گفتگو کی۔ فروری ۱۹۲۰ء میں سر سنج بہادر سپرو اور ڈاکٹر ضیاء الدین تشریف لائے۔ سپرو نے فرمائش کر کے صہبائی کا دیوان دیکھا۔ سپرو کے دادا صہبائی کے شاگرد تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے علم ہیئت کی کتب کا معائنہ کیا۔ اسی طرح حبیب الرحمن خاں شیروانی اور صدر یار جنگ بھی تشریف لائے ان کو شبلی اسکول میں ایڈریس دیا گیا۔ اور آخر الذکر نے جوابی تقریر کی۔ ان کے ساتھ آنے والوں میں نواب منزل اللہ خان بھی تھے جنہوں نے دارالمصنفین کی کچی مسجد کو پختہ بنوانے کے اخراجات کی ذمہ داری قبول کی۔

صدریاء جنگ نے سنگ بنیاد رکھا اور مولانا حمید الدین فراہی نے گارا اپنے سر پر رکھ کر ڈھویا۔

حکیم محمد اسحاق کی روزانہ شام کو دارالمصنفین میں حاضری ضرور ہوتی تھی۔ برسہا برس تک ان کے والد نے شبلی منزل کی مسجد میں تراویح پڑھائی تھی۔ اب حکیم اسحاق کی ذمہ داری تراویح پڑھانے کی رہی۔ تراویح پڑھانے کا قاعدہ یہ ہوتا تھا کہ حکیم محمد اسحاق اپنے گھر میں ۱۲ رکعت پڑھا کر کسی سال پیدل کبھی یکے پر اور کبھی محمد علی مختار کی موٹر پر بقیہ نماز پڑھانے چل دیتے تھے۔ اور چودھویں رمضان کو قرآن ختم کر دیتے۔ شبلی منزل یا دارالمصنفین میں حاضری کا یہ سلسلہ ۱۹۴۲ء تک چلتا رہا کہ عصر و مغرب کے درمیان حاضری ضرور ہوتی تھی۔ حکیم اسحاق نے شبلی منزل اور موجودہ دارالمصنفین کے ساتھ ساتھ اپنے مادر علمی مدرسہ باغ پینٹو کی عرصہ تک نظامت بھی کی تھی۔

تحریک کے دوران ان کی ملاقات مشہور انقلابی شاعر انور صابری اور سلام مچھلی شہری سے بھی ہوئی۔ انور صابری سال میں کئی بار مٹو مبارک پور اور سرائے میر کے جلسوں میں آئے تو حکیم محمد اسحاق کے گھر بھی آئے۔ اوقات مطب میں جب یہ شاعران کے دو اخلانے میں آکر بیٹھتے تو انور صابری کو دیکھنے سننے اور ملنے کے لئے لوگ آتے رہتے۔ حکیم محمد اسحاق مریضوں کو دیکھتے رہتے اور نسخے لکھتے رہتے اور احباب کی مجلس گفتگو کے ساتھ ساتھ انور کی نظموں اور انقلابی اشعار سے بھی محفوظ ہوتے رہتے تھے۔

انور صابری کے حسب ذیل اشعار بہت پسند کئے جاتے تھے۔

اکرتے پھرتے ہیں ہم سو جو مغربی بندہ ہم ان کو ایک طمانے میں رام کر لیں گے  
تم اپنا بوجہ یا بستر سنبھال کر بھاگو ہم اپنے ملک کا خود انتظام کر لیں گے  
جس طرح جوش ملیح آبادی کے اشعار نے ایک وقت میں جلتی پرتیل کا کام کیا تھا۔ اسی طرح انور صابری کے اشعار بھی زبان زد رہے۔

سلام اے تاجدارِ جہنمی اے سٹیلر اعظم  
سنا ہی ہو گا تو نے ایک بد بختوں کی لستی ہے  
فدائے قوم شیدائے وطن اے نیر اعظم  
جہاں انسانیت بھی آج جینے کو ترستی ہے



النور صابری نے بھی ایک نظم اسی نظم کے مقابلہ میں ایک جلسہ گاہ میں جب پڑھی۔  
 غلام آباد میں میری تمنا پوچھنے والے  
 دل محکوم کا رنگیں فسانہ پوچھنے والے  
 تمنا ہے کہ لوں بدل کبھی جھانسی کی رانی کا  
 تمنا ہے کہ لوں بدل پشاور کے شہیدوں کا  
 بہادر شاہ کے معصوم بچوں کی امیدوں کا  
 ان اشعار کے نتیجے میں مولانا سعید احمد۔ النور صابری اور رفیع اختر کے نام وارنٹ  
 جاری ہو گیا۔ اور مولانا سعید احمد عین عید سے دو یوم قبل گرفتار ہو کر اعظم گڑھ لائے  
 گئے۔

ہندوستان چھوڑو تحریک کا جب نعرہ اٹکا اور جمعیتہ علماء نے ہندوستان کے پچاس  
 علماء کے فتاویٰ سے ایک اشتہار چھپوا کر شہر میں چسپاں کرانے کے لئے پہلے مبارکپور  
 پھر اعظم گڑھ میں یہ اشتہار لاکر حکیم صاحب کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ شہر میں چسپاں  
 کرادیں۔

حکیم میرا استحاق نے مولوی عبدالحق کو بلوا کر اشتہارات اور لٹی کے لئے کچھ  
 پیسے دیئے اور کہا کہ یہ اشتہارات آج ہی رات چسپاں کرادیں اور کانگریس کے  
 ایک اہم جلسہ میں شرکت کرنے اور تقریر کرنے نظام آباد چلے گئے۔ سی۔ آئی ڈی۔  
 مشتاق نے حکیم محمد استحاق کو آ کر خبر دی کہ ان کی گرفتاری یقینی ہے۔ یہ چند جوڑے  
 کپڑے، قرآن شریف، مطالعہ کے لئے کچھ کتب اور بستر کے ساتھ جیل جانے کو تیار  
 ہو گئے۔ مگر گرفتاری صرف عبدالحق کی ہوئی۔ یہ محمد استحاق کی تیسری گرفتاری کی تہ  
 تھی۔ پہلی سو راج ناتھ سنگھ کے ہمراہ نظام آباد جا کر نمک بنانے کی تحریک کے لئے  
 عوام کو آمادہ کرنے پر دوسری الہ آباد میں صوبائی میٹنگ کے موقع پر۔ جب یہ الہ آباد  
 نہیں گئے تھے بلکہ ایک مریض دیکھنے چلے گئے تھے ہاں ان کے دیگر ساتھی جن کی تعداد  
 ۵۲ کے قریب تھی گرفتار کر لئے گئے تھے یہ گرفتار نہ ہو سکے تھے۔ تیسری یہ پوسٹر کے  
 سلسلے میں تھی جو نہ ہو سکی۔

گاندھی کیپ :-

تحریک میں دن بدن تیزی آرہی تھی۔ انگریزوں سے ہندوستان چھوڑو کی مانگ سے

ہندوستان کا ہر شہر لرز رہا تھا ۱۹۴۲ء کے انہی ہنگاموں سے پولیس نے عوام کو خوفزدہ کر رکھا تھا۔ اور خاص بات یہ تھی کہ جو شخص گاندھی ٹوپی پہن کر نکلتا۔ پولس والے اس کے سر پر سے زبردستی ٹوپی اتار لیتے یا اتر وادیتے۔ حکیم اسحاق کے چند ساتھیوں نے پولیس والوں کی زبردستی کے باوجود گاندھی ٹوپی نہیں اتاری تھی۔ انہی دنوں ایک اہم واقعہ ہوا۔

حکیم محمد اسحاق جن کا ان دنوں اعظم گڑھ میں شہرہ تھا۔ اعظم گڑھ کے ایک جج کی دختر بیمار ہو گئی۔ اس کو جا کر دیکھنے کے لئے جج صاحب نے گاڑی بھجوائی۔ حکیم صاحب نے صرف اس نظریے سے کہ وہاں پر کہیں گاندھی ٹوپی کی بے حرمتی نہ ہو جائے دیکھو کہ حکیم صاحب گاندھی ٹوپی پہنتے تھے، اس خدشہ کا اظہار کیا۔ لیکن جج کی یقین دہانی پر حکیم اسحاق گاندھی ٹوپی پہنے ہوئے اس جج کی لڑکی کو دیکھنے گئے۔ اس دور کی تحریک میں ان کے ساتھ جو ساتھی رہے۔ ان میں بھٹی اعظمی۔

بھوانی پرشاد مختار ڈاکٹر حفیظ اللہ۔ سیتارام استھانا۔ سورج ناتھ سنگھ۔ ناکیشور پرشاد وکیل جن کے لڑکے کی شادی ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی پوتی سے ہوئی تھی۔ مولوی عبدالباری۔ حاجی علی حسن اور شمس الدین خاص تھے۔ لیکن ان سب میں جرات مندانہ ہستی مولوی عبدالحق کی تھی۔ لالہ کنور سین جو دہلی طبیہ کالج میں حکیم اسحاق کے ہم جماعت تھے وہ بھی ۱۹۴۲ء میں تحریک کے سلسلے میں میرٹھ میں گرفتار ہو کر فیض آباد جیل بھیجے گئے تھے۔

۱۹۴۲ء کے اس ہنگامے کے بعد جب آزاد ہند فوج پر مقدمہ چلانے کی بات چلی تو پورے ہندوستان میں ہلچل مچ گئی۔ پھر جب ملکی حالات بدے اور برطانیہ نے صلح و صفائی پر آمادگی ظاہر کی جب کہ چرچل کسی بھی صورت میں ہندوستان کو آزادی دینے کے حق میں نہ تھا۔ برطانیہ میں ہونے والے الیکشن میں لیبر پارٹی کو اکثریت ملنے پر لیبر پارٹی اور اٹلی کی وزارت اعظمی نے ہندوستان کی آزادی کے راستے ہموار کر دیئے۔ چنانچہ لارڈ ڈیلول کی آدکینٹ مشن کی گفتگو نے لوگوں کی امیدیں بڑھادی تھیں لیکن ملکی سیاست پر مسلم لیگ کا اثر بڑھنے لگا تھا۔

۱۹۴۵ء میں عام انتخابات کی دھوم مچی اور کانگریس و مسلم لیگ بڑے فریق کی حیثیت سے میدان سیاست میں آگئیں۔ حکیم اسحاق ابراہان کے سیاسی رفقاء و ہم عصر مسلم پارلیمنٹری بورڈ کی رہنمائی میں ضلع کے الیکشن میں مصروف ہو گئے۔ مسلم پارلیمنٹری بورڈ نے الیکشن کے میدان میں خرچ کرنے کو پانچ ہزار کی رقم دی تھی۔ قاضی مارون رشید کے گھر میں الیکشن کا دفتر قائم ہوا۔ مولوی ریاست علی ندوی کا انتخاب کے نگران مقرر ہوئے۔ ضلع کو مختلف یونٹوں میں بانٹ دیا گیا۔ حکیم اسحاق کے حصہ میں محمد آباد سبکڑی اور صدر کی تحصیل میں آئی تھیں۔ مسلم لیگ کے ساتھ عوامی سہمداریاں زیادہ تھیں ایسے وقت میں جو کارکن کانگریس اور جمعیتہ کے مشترکہ پلیٹ فارم سے کام کر رہے تھے ان کی جرات قابل داد تھی۔ اس لئے کہ نہ صرف عام مسلمان بلکہ اعلیٰ ذات و طبقہ کے کھاتے پتے مسلم افراد نہ صرف پاکستان کے کٹر حامی تھے بلکہ جمعیتہ اور کانگریس کے جلسہ جلوسوں میں شریک ہونے پر ساتھیوں پر مختلف طریقوں سے پابندیاں بھی لگاتے تھے۔ حکیم صاحب نیز ان کے شرکاء و ساتھیوں کی کوششوں سے رہنمایان ملک و ملت کی بار بار اعظم گڑھ آمد ہوتی رہتی تھی جن میں مولانا حفیظ الرحمن۔ مولانا ابوالوفار۔ مولانا قاسم۔ مولانا شاہد فاخری جو راقم کے قریبی عزیز قاضی احمد حسین کے بڑے بھائی ہوتے تھے۔ اور مولانا حسین احمد مدنی کے علاوہ گووند بلجہ پنت رفیع احمد قدوائی کیشو دیو مالویہ اور کیلاش ناتھ کاٹھو قابل ذکر ہیں۔

چونکہ حکیم صاحب ایک باعزت پیشے سے منسلک تھے اور قرب و جوار کے عوام ان کے نام سے واقف تھے اس لئے ہنگاموں اور انتخابی چیلنجوں کے باوجود صرف ایک بار ناخوشگوار واقعہ یہ پیش آیا کہ جب حکیم اسحاق انتخابی مقاصد کے تحت ہیراج پور گئے تو ان کی کار پر عوام نے پتھر اڑا کر دیا اور یہ اور ان کے ساتھی موٹر سے نہ نکل سکے اور اٹلی پیروں ساتھیوں کے ساتھ واپس آ گئے۔ ان حالات میں ۱۹۴۵ء کے ہنگامی انتخابات میں ان کی پارٹی کو نہایت اٹھانی پڑی کیونکہ ایسے پُر آشوب دور میں چہار جانب مسلم لیگ کا غلبہ تھا۔ لیکن یہ عارضی الیکشن کے نتائج ان کے اور ان کے ساتھیوں کے حوصلوں کو پست نہ کر سکے چنانچہ نئے

عزم و حوصلے کے ساتھ یہ اور ان کے ساتھی پھر کانگریس اور جمعیتہ کے لئے کام کرنے میں پوری تندی سے لگ گئے۔

ایسے وقت میں حکیم اسحاق نے اکابرین ملک و ملت سے بہت فیض اٹھایا جن کے نام درج ذیل ہیں۔

مولانا حسین احمد مدنی۔ مولانا مفتی کفایت اللہ۔ مولانا احمد سعید۔ مولانا حفظ الرحمن۔ مولانا شاہد فاخری مولانا ابو الوفا۔ مولانا قاسم۔ عبد الحمید الحریری جو اہل علم تھے اور جدہ میں حکومت ہند کی جانب سے سفارت خانے پر دو تین سال تک کلچرل اتاشی کے فرائض بھی انجام دے چکے تھے اور پنڈت نہرو کے مجموعہ مکاتیب کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ محمد انس خان۔ عبدالکریم خان مولوی فرید الدین وکیل حافظ نصر الحق۔ شاہ اسحاق وکیل حافظ عبد الحمید وکیل۔ شاہ فیضان احمد وکیل ڈاکٹر عبدالرؤف۔ محمد سحی خاں فتح پوری۔ نجم الدین اصلاحی بابو سراج الحق۔ ماسٹر محمد شفیع قابل ذکر ہیں۔

## الیکشن اور مطب :-

۱۹۴۵ء کا الیکشن میں بڑی رنجشیں ہو گئی تھیں۔ ذاتی طور پر کچھ لوگوں نے بیجا الزام تراشیاں اور طعنے دیئے مگر وقت کے ساتھ ساتھ حکیم صاحب اپنے پیشے سے غافل نہ رہے اور مطب کے اوقات میں کسی قسم کی کمی نہ آنے دی اور اب مدت پریکٹس ۲۵ سال ہو چکی تھی۔ شہر کے بیشتر مسلمان اور ہندو خاندانوں کے معالج بن گئے تھے۔ ضلع کے بیشتر قصبات میں ان کی آمد و رفت مرضاء کے دیکھنے کے لئے ہوتی رہتی تھی۔ انھوں نے اپنی طبابت کو کبھی روپیہ پیسہ کا ذریعہ نہیں بنایا اور نہ کسی مریض کو اس کی حیثیت سے باہر نسخہ لکھا۔ ان کا اپنا مطب کے سوا دوا خانہ بھی تھا لیکن کبھی کسی مریض سے یہ نہ کہا کہ دو امیرے دوا خانہ سے لو۔ مطب کی مصروفیت کے بعد جو وقت بچتا اس میں قومی اور مذہبی سرگرمیوں۔ شبلی منزل کی حاضری اور اپنے یہاں مغرب سے لے کر عشاء تک نشست میں پابندی سے شریک ہوتے بعض اوقات ان مصروفیتوں میں بھی مریض آجاتے اور بالابالا باہر مریضوں

کو دیکھنے کے لئے جانا پڑتا۔ ان کی آمدنی کا تمام تر انحصار اس فیس پر ہوتا جو باہر جا کر مریضوں سے ملتی۔ جو نسخہ مطب اور شہر میں لکھتے اس کی قیمت نہ لیتے تھے۔ کبھی کبھی مجربات اور مخصوص امراض کے نسخے بہت قیمتی ہوتے ۱۹۴۰ء یا ۱۹۴۵ء میں ان نسخوں کی قیمت بہت ہوتی تھی لیکن انہوں نے کبھی کسی کمیشن یا معاوضے کے سبب نسخے نہ لکھے۔

## ہوالسانی :-

حسب قاعدہ کبھی کسی مریض کو حتمی فائدہ کا یقین نہ دلایا اور مریض سے صاف بتا دیا کرتے تھے کہ کتنے دنوں علاج کرنا ہوگا۔ خدا کے فضل سے شفا ہو جاتی ان کے اس طریق کار نے مریضوں کو ان کا مطیع بنا دیا۔ حسب دستور مریض تحفے تحائف بھی لاتے تھے۔ مسلم مریضوں کے مقابلے ہندو مرثیاء کی تعداد زیادہ تھی۔ شہر میں کئی ہندو گھرانے ایسے تھے جن کے تمام بچے اور عورتیں عمر بھر ان کی دوائیں کھاتی رہیں اور بعض بے اولاد حضرات نے حسن عقیدت میں ان سے رجوع ہوئے اور ان کے نسخوں کی بدولت وہ صاحب اولاد ہوئے۔

اسی طرح مسلمان گھرانوں میں اعظم گڈھ کا شاید ہی کوئی فرد ہو جو ان کے زیر علاج نہ رہا ہو۔

## مذہبی رجحانات :-

بچپن ہی میں حفظ قرآن کی دولت پالی تھی۔ ان کے والد نے ان کو دین کے راستے پر لگایا۔ ان کے بزرگ مولوی محمد یعقوب نے ان پر دست شفقت رکھ کر دعاؤں سے نوازا ان کے استاد مولوی خدا بخش نے ایک صالح مسلمان کی خصوصیت سے نوازا۔ استاد طب حکیم اجمل خان نے اپنی دینی و دنیاوی سنجیدگی، بردباری اور اخلاق کی خیرات ان کو دی۔ مولوی مسعود علی کی قربت نے ایک مہذب اور صاف ستھرا ماحول بخشا جس کی بدولت اسلام کے اصول ان کی زندگی کے جز بنے رہے۔ اور حالات کی مساعدت باوجود حج جیسے بابرکت فریضہ سے بھی سرفراز ہوئے اور اپنی چچی

دیوبی کے ہمراہ ۲۶ اپریل ۱۹۶۰ء کو کاشی ایکسپریس سے عازم بیت اللہ ہوئے۔

## پابندی مطب :-

مطب کو بہت مشکل سے چھوڑتے تھے۔ کانگریس کے اجلاس میں شرکت پر ناغہ ہوا۔ اپنی دختر سلمیٰ باجی (جو راقم کے زیر علاج بھی رہی ہیں) کی شادی کے سلسلے میں کان پور کا سفر کار سے کیا۔ اور سب سے طویل ناغہ دوران حج بیت اللہ ہوا۔ یہاں تک کہ اپنے خزندگان کی شادی میں بھی دواخانہ کر کے اٹھے یہاں تک کہ ایک صاحبزادے کی شادی میں صرف اس لئے نہ شریک ہوئے کہ مطب کا ناغہ ہوگا اور شادی اپنے بڑے بھائی کے سپرد کر دی۔

## نسخہ :-

مریضوں کو دیکھنے کے بعد مریض تو دوا باہر سے خریدتا تھا لیکن بیشتر نسخے خود ہی لکھتے اور اتنی کثرت سے نسخے لکھتے کہ انگلیاں درد کرنے لگتیں۔ پھر بڑے لڑکے کو نسخے لکھنے بٹھانے لگے۔

## برتاؤ :-

مریضوں سے انتہائی شفقت سے پیش آتے۔ مریض کے حالات گاؤں اور مذہب کو ضرور پوچھتے۔ اور نسخے ہمیشہ حسبِ حیثیت لکھتے اگر کسی مریض کا قارورہ دکھاتے وقت ان کے کپڑوں پر گر گیا۔ یا چھینٹ آگئی تو ان کو ڈانٹا نہیں۔ کبھی کسی مریض کو جھوٹ اور غلط بیانی سے متاثر نہ کرتے اور نہ ہی مطمئن۔

## نذرانے :-

نذر اس کا ایک واقعہ ہے کہ کسی آدمی نے ان کے ایک مریض سے ان کے بارے میں سنا۔ وہ بیچارہ گھٹیا کا پرانا مریض تھا چنانچہ دوست کی وساطت سے خط لکھوا یا حکیم اسحاق صاحب سے نسخے لکھ کر بھیجا اس نے استعمال کیا اور اسے فائدہ ہو گیا۔ لوگ

تحائف بھیجتے اور روپیہ بھی۔ جن میں سے حکیم اسحاق صاحب بعضوں کا جیب خرچ دیتے مستحقین کا حصہ نکالتے دعوتیں کرتے ان کے چھوٹے فرزند کی شادی میں ملایا سے ایک پرانے مریض نے ۵ روپیہ نوید میں بھیجتے تھے۔

ایک بار شہر کے ایک مشہور ڈاکٹر اور وہ ایک مریض کو دیکھنے گئے۔ حکیم اسحاق اور ڈاکٹر صاحب حسن اتفاق کہ ایک ساتھ مریض کے دروازہ پر پہنچے کہ مریض ختم ہو گیا۔ حکیم صاحب لوٹ کر اسی اکہ پر گھر آگئے اور مریض کے گھر جانے اور دو خانہ و مطب تک آنے کا کرایہ خود ہی دیا۔ جب کہ ڈاکٹر صاحب نے فیس لے لی۔

یہی حال مریضوں سے فیس کا ہوتا شہر شہر سے باہر مضافات غرضکہ کہیں جانا ہو وہ کچھ طے نہ کرتے اور جو کچھ ملتا اسے بخوشی و برضا لے لیتے۔ اگر بعض مجبور نصف دیتے اور بقیہ کا وعدہ کرتے مگر وہ قرض حسنہ ہوتا۔

مریض کو دور دور دیکھنے جاتے تو ٹوکری میں ناشتے دان لوٹا مصلیٰ اور پان کی ڈبیہ ساتھ جاتی۔ ایک بار گورکھپور ایک مریض کو دیکھنے گئے اور دوسرے دن دوپہر کو واپسی ہو سکی۔ بہت افسوس کرتے رہے کہ مطب کا ناغہ ہو گیا۔ حالانکہ گورکھپور میں مریض سے پچاس روپیہ فیس ملی تھی۔

خود طبیب تھے مگر دوا کا استعمال شاید و باید کرتے تھے۔ زندگی اتنی پابند گزارتے تھے کہ پرہیز خود بخود علاج ہو جاتا تھا۔

## وضع قطع :-

زمانہ طالب علمی میں چوڑی مہری کا پاجامہ شیروانی اور ترکی ٹوپی لباس تھا۔ لیکن تحریک آزادی میں شامل ہونے کے بعد کھڈر کا کرتا پاجامہ تیلی مہری کا۔ شیروانی اور ٹوپی سردیوں میں پٹو کی گرم صدری اور شیروانی ہوتی گرم چادر بھی دسی ہوتی اور کانوں میں رومال ہوتا۔

## وفات :-

آخری دنوں میں یعنی ماہ فروری ۱۹۷۵ء میں ۱۸ کی صبح کو ان کا ہاتھ منہ دھو کر

لٹا دیا گیا اور بڑی دختر (جو راقم کے اکثر زیر علاج رہی ہیں) سلمیٰ جو ایک دن قبل آگئی تھیں ان کو ناشتہ کرانے گئیں روزانہ کے معمول کی مقدار کو وہ بمشکل حلق سے اتار سکے اور جیسے ہی ان کو دودھ پلایا جانے لگا کہ آنکھیں پھیل گئیں۔ اور بڑی دختر نے ان کو کلمہ لا الہ الا اللہ کے ساتھ قبلہ رخ کر دیا۔ اور ۱۸ جنوری کی منگل کی شب میں ان کے آبائی قبرستان میں ان کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

حکیم محمد اسحاق صاحب کی شخصیت مکارم اخلاق اور محاسن صفات کا ایک عجیب و غریب مرقع ہے۔ ان کی شرافتِ نفس۔ شرافتِ ذوق اصابتِ رائے حذقتِ فن اور استقامتِ علی الحق کا ایسا جامع اور مکمل نمونہ ہمارے اطراف میں مشکل سے ملے گا۔ حضرت مسیح الملک کے تلامذہ میں سے تھے اور نہ صرف فنِ طب میں بلکہ دیگر حیثیات سے استاد کے آئینہ کمال تھے۔

ان کے انتقال پر حکیم صاحب کے دوست منشی معین الدین حنیف نے جو اشعار اور مادہ تاریخ کہلے وہ ذیل میں درج ہے۔

وہ حافظ حکیم آہ اسحاق مرحوم	گلستانِ عالم میں جواب نہیں ہے
بڑے متقی اور بڑے پارسا تھے	جواب ان کا دنیا میں کوئی نہیں ہے
جو اس طرح کمر لے مسخر دلوں کو	طبیب ایسا کوئی جہاں میں نہیں ہے
مریضوں پہ رکھے جو چشمِ عنایت	کوئی نیک اوصاف ایسا نہیں ہے
اٹھارویں وہ فروری کی وہ منگل کا دن	گھڑی جس کی ہر ایک غم آفریں ہے
وہ اب ہو کے بازارِ عالم سے رخصت	پیشِ خداوند جانِ آفریں ہے
وہ انسانِ کامل پرستارِ دین وہ	جواب زیبِ باغِ بہشتِ بریں ہے
جدائی میں دن رات افسوس ان کی	غم آلودہ میرا یہ قلبِ حمزیں ہے
کرے مغفرت ان کی پرورِ دگار	یہی التجائے دلِ کتریں ہے
لکھ از روئے اجد سن عیسوی میں	پریشانِ عبت تو مصنفِ حمزیں ہے

تھا مشہور عالم جو اسحاق نامی

چراغِ ہدایت وہ زیریں ہے



# شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی

۱۳۱۷ھ مطابق ۱۹۰۰ء      ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۹۷۰ء

## خاندانِ عزیزی کا پہلوان حکیم

تاریخِ طب میں خاندانِ عزیزی کا ایک بلند و برتر مقام ہے۔ جب بھی کوئی مؤرخ ہندوستان کی تاریخ مرتب کرے گا تو وہ (خاندانِ عزیزی جس کے بانی حکیم محمد یعقوب تھے اور جو حکیم محمد عبدالعزیزی کے نام سے خاندانِ عزیزی سے منسوب ہوا) خاندانِ عزیزی کی خدمات کو فراموش نہ کر سکے گا۔

دلی کے بعد لکھنؤ کو ملک کی طبعی دنیا میں جو مقام و اہمیت حاصل ہے وہ ملک کے کسی شہر کو حاصل نہیں ہے اور لکھنؤ کے طبعی خانوادوں میں جو مرکزیت شہرت و اہمیت خاندانِ عزیزی کو حاصل ہے وہ مرتبہ کسی دیگر خاندان کو حاصل نہیں ہے۔

عبداللطیف فلسفی خاندانِ عزیزی کے آخری نمائندہ طبیب تھے۔ اگر وہ ایک جانب ظرافت کا نمونہ تھے تو دوسری جانب تحمل بردباری اور سنجیدگی متانت کا پتلا تھے۔ فنِ ورزش کے حلقے ماہر تھے اتنے ہی دیگر علوم و فنون میں قابل تھے۔

خاندان :-

ان کا خاندان جھوانی ٹوڑ لکھنؤ کا مشہور طبعی خانوادہ خاندانِ عزیزی ہے۔ ان کے اجداد کشمیر سے ترک وطن کر کے لکھنؤ آئے تھے۔ ان کے والد کا نام



جناب سفیر المکابیر و فیصلہ علیہ عبد اللطیف فلسفی برائے

حکیم عبدالوحید تھا۔ جو معروف طبیب تھے۔

## پیدائش :-

عبداللطیف کی پیدائش ۱۰ محرم الحرام ۱۳۱۷ھ ہجری مطابق ۲۹ اپریل ۱۹۰۰ء عیسوی بعد نماز جمعہ لکھنؤ میں تولد ہوئے۔ مفتی عبداللطیف ان کے والد کے عزیز ترین دوستوں میں تھے اور اپنے وقت کے جید عالم۔ ان کے نام نامی واسم گرامی پر خاندان نیز گھر کے دیگر افراد نے ان کا نام بھی تبرا عبداللطیف ہی رکھا ابھی ۲ سال کی عمر کے ہی تھے کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور وہ خدا کو پیارے ہو گئے۔

## تعلیم و تربیت :-

والد ماجد کے انتقال کے بعد ان کے چچا حکیم حاجی عبدالعزیز جو اپنے وقت کے نہ صرف لائق و فائق طبیب تھے بلکہ طبی درس گاہ تکمیل الطب کے بانی بھی تھے، نے ان کی پرورش کی ذمہ داری قبول کی ان کے والد ماجد حکیم عبدالوحید کا انتقال مرض طاعون جس نے ایک وقت میں صوبہ اودھ نیز متعلقہ اضلاع میں لاکھوں لوگوں کو لقمہ اجل بنایا تھا میں ایک مریض کو ملا پور دیکھ کر آنے کے بعد ہوا تھا ابھی غم محترم حکیم عبدالعزیز کا سایہ عاطفت گیارہ سال ہی ملا تھا کہ نئے سر پرست بھی خدا کو پیارے ہو گئے۔ چچا کی وفات کے بعد بڑے بھائی شفاء الملک حکیم عبدالعبید نے اپنی سرپرستی میں لیا۔ اور تعلیم و تربیت کی جانب متوجہ ہوئے۔

زمانہ کے دستور اور رواج کے مطابق تعلیم کی ابتدا گھر کے علمی و ادبی ماحول سے شروع ہوئی۔ لکھنؤ میں دوسرے اساتذہ کے علاوہ مولانا عبدالشکور جو مدرسہ فرقانیہ میں مدرس اعلیٰ بھی تھے ان سے اور شمس العلماء مولانا عبدالحمید فرنگی محلی اور مولانا عبدالکریم جو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں فقہ کے استاد اعلیٰ تھے، سے حاصل کی۔ پھر اپنے خاندان کی روایات کے برعکس پہلی بار خاندان کے کسی فرد کا بغرض حصول تعلیم وطن مالوف سے باہر کسی شہر کا سفر کیا۔

۱۹۱۴ء میں رام پور جا کر مولانا فضل حق خیر آبادی سے درسیات کی تکمیل اور خصوصی طور پر استفادہ کر کے فاضل معقولات کی سند حاصل کی۔

طبی تعلیم :-

۱۹۱۷ء میں واپس رام پور سے آکر اور درس نظامی کی تکمیل کے بعد فن طب جو ان کے خاندان کی معراج تھا اس کی تعلیم کی جانب متوجہ ہوئے۔  
۱۹۲۱ء میں طبی تعلیم سے فراغت کے بعد جو اپنے خاندان کے بزرگوں سے حاصل کی تھی۔ لکھنؤ میں ہی مستقل مطب کے ساتھ مادر علمی تکمیل الطب میں درس و تدریس کا شغل شروع کیا۔

دیگر علوم :-

حکیم عبداللطیف فلسفی کو فنون لطیفہ میں خطاطی موسیقی اور مصوری کے ساتھ ساتھ فن کشتی سے بھی بہت دلچسپی تھی اور ہر فن کو باقاعدہ اس فن کے ماہر اور استاد سے حاصل کیا۔ جب طب کی کتاب نبض کی تصنیف و تالیف میں منہمک تھے موسیقی اور نبض کے موضوع پر جب پہنچے تو اپنی موجودہ تعلیم سے مطمئن نہ ہو کر پہلے تو شرح قانون آملی کا مطالعہ کیا وہاں بھی جب تسلی نہ ہوئی تو علی گڑھ میں فن موسیقی کے استاد کامل مولانا بخش شاگرد رشید ظہور حسین خاں نانک خواجہ سے دو سال تک فن موسیقی کی مشق کر کے خواجہ محمد اشعیا سے اس فن کی تکمیل کی۔

پھر علی گڑھ میں ہی فن مصوری کی باقاعدہ مشق سجاد صاحب آرٹسٹ مسلم یونیورسٹی سے سیکھی ان کی چند تصاویر آرٹ کا بیش قیمت نمونہ ہیں۔ اور بطور یادگار آج بھی محفوظ ہیں۔

ورزش اور کثرت ان کا محبوب شغل رہا تھا۔ دوران قیام رام پور استاد سہراب خان کے شاگرد رشید رہے اور علی گڑھ میں جب کہ یہ درس و تدریس جیسے معزز پیشہ سے اور وہ بھی طب کے جیسے فن کے پیشے سے منسلک اور وابستہ

ہو گئے تھے۔ اس شخص کی تکمیل تو لاپرواہوں اور تحفظ پہلو ان سے کی۔ بیوٹ کی تعلیم  
 انہیں اسناد صحیحہ الدین، نام پڑھی اور شاہ روادار میاں کے ایک شاگرد سے  
 ناس۔

خود لکھا ہے۔

اچھے ماہر طبی ہیں، طلب میں درس دتہ ہیں سے جب منسلک ہو گئے تو یہ  
 خدمت ۱۹۲۰ء تک وہاں انجام دینے رہے۔

۱۹۲۰ء میں ایک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طبیہ کالج کی بنیاد پڑی تو  
 شفاء الملک مسیح الملک حلیم اسماعیل خان نے ان کی ذاتی قابلیت اور علمیت  
 سے متاثر ہو کر حکیم عبداللطیف کا تقریر بحیثیت لیکچرار کے کرایا اور آپ نے ۱۲  
 اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بحیثیت استاد کے  
 پرزورہ تقریر کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ طبیہ کالج کے وائس پرنسپل ۱۹۲۹ء  
 میں ہوئے اور اگلے سال ہی انہیں وائس چانسلر اور اسی چھ ماہ کی کتاب کے مصنف  
 مہرجم کے طور پر ہونے کے بعد بحیثیت پرنسپل تقریر ہوئے اور ۲ سال  
 تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طبیہ کالج سے وابستہ رہنے کے بعد اکتوبر  
 ۱۹۶۱ء کو اپنی خدمات سے سبکدوش ہوئے۔

معدومہ سالوں میں فن طب کے میدان میں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو آج  
 تک سب سے زیادہ ترقی پانچ سو سے زائد آپ کی ہی ذمہ سے حکیم عبداللطیف کی  
 کی سرپرستی میں علی گڑھ کے بہت ترقی ملی اور ملک کے طبی اداروں  
 میں حسب روادار اس کالج اور اس وقتہ میں کے میدان میں ایک بلند ممتاز  
 ادارہ قائم اور اس کے علاوہ کی طرح آج بلند سائنس میں طبیہ کالج کو نمایاں حیثیت  
 حاصل ہے۔ ان کی بیاد میں وجہ یہاں اور بہت سی ہیں وہاں حکومت کی سرپرستی  
 بھی ہے کیونکہ ان کے سب سے زیادہ علم و سہروروں کے قدر دان ہوتے ہیں وہیں  
 نکلنا آج ہو جاتے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی میں اس وقت تک میڈیکل کالج کا قیام عمل میں نہیں آیا

تھا فیکلٹی آف میڈیسن کے دوسرے ڈین آپ عرصہ تک رہے۔ حکیم عبداللطیف یونیورسٹی طبیہ کالج کے بہت ذہین اور باصلاحیت اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ آپ اپنی ذاتی شخصیت اور پر وقار حیثیت کی بنا پر یونیورسٹی اور علی گڑھ میں بہت مقبول ہو گئے تھے جس کی بنا پر بہت سے اہم عہدوں پر رہے آپ کی مصروفیت کا اندازہ اس حقیقت سے ہو گا کہ آپ علی گڑھ مندرجہ ذیل متعدد اہم عہدوں پر عرصہ تک فائز رہے۔

- ۱۔ لیکچرار طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
- ۲۔ پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
- ۳۔ پروفیسر طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
- ۴۔ ڈین فیکلٹی آف میڈیسن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
- ۵۔ صدر طبّی سوسائٹی طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
- ۶۔ ممبر مینجنگ کمیٹی دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
- ۷۔ ممبر اکیڈمک کونسل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
- ۸۔ ممبر ایگزیکٹو کونسل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
- ۹۔ ممبر آف کورٹ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
- ۱۰۔ ڈائریکٹر آف ریسرچ ان یونانی میڈیسن۔
- ۱۱۔ ٹرنیچر جامعہ اردو علی گڑھ۔
- ۱۲۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے جوائنٹ سکریٹری۔
- ۱۳۔ ممبر نمائش کمیٹی علی گڑھ۔
- ۱۴۔ وائس پریزیڈنٹ آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس۔

حکیم صاحب یونیورسٹی کے بہت ہی ذمہ دار فرد تصور کئے جاتے تھے وہ یونیورسٹی کی تمام اہم کمیٹیوں میں شریک ہوتے تھے۔ الیکٹرک کونسل اور کورٹ کی میٹنگوں میں ان کی تقاریر بہت زور دار ہوتی تھیں۔

ملک کے تقریباً تمام طبّی تعلیمی اداروں سے شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی کا کسی نہ کسی حیثیت سے تعلق تھا اور وہاں کے معاملات میں ان کے اہم مشوروں کو دخل

رہتا تھا۔ طبیہ کالج علی گڑھ کے علاوہ آپ تکمیل الطب کالج لکھنؤ کی مجلس انتظامیہ کے ممبر معتمد اعزازی اور آخر میں صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ ریڈ کالج قردل باغ دہلی کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے ممبر پٹنہ طبیہ کالج کی مجلس مشاورات کے ممبر جامعہ طبیہ دہلی کے پرنسپل جامعہ طبیہ دیوبند کی مجلس طبی کے صدر نظامیہ طبیہ کالج حیدرآباد کے سلسلے میں قائم کردہ ملکوتی کمیٹی کے ممبر بھی رہے تھے سری نگر (کشمیر) میں طبیہ کالج کا قیام آپ ہی کی کاوشوں کا نتیجہ تھا ۱۹۵۸ء میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی جانب سے مقرر کردہ نصاب کمیٹی کے کنوینر کے ساتھ ساتھ یونانی ایڈوائزری کمیٹی۔ پلاننگ کمیٹی فارما کویا کمیٹی۔ سینٹر کونسل آف انڈین میڈیسن سینٹرل کونسل فار ریسرچ آف یونانی میڈیسن۔ اور میو پی تھی کی گورننگ اور ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبر اور اتر پردیش پبلک سروس کمیشن کی تقرراتی کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔

سرکاری سطح پر ہمیشہ حکیم صاحب کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں حکومت برطانیہ نے آپ کو ”شفاء الملک“ جیسے معزز خطاب سے سرفراز کیا۔  
شفاء الملک کے خطاب پر ملک کے طبی و ادبی حلقوں میں نہایت مسرت کا اظہار کیا گیا۔ ادارہ طبیہ کالج میگزین علی گڑھ نے اپریل ۱۹۴۱ء مندرجہ ذیل الفاظ میں مبارکباد پیش کی تھی۔

ہم بصد فخر و مباہات۔ مبدع قوانین شفا منترع آئین دوا۔ مجمع ملکات قدوسی۔ منبع معالجات جالینوس۔ عالیجناب شفاء الملک حکیم محمد عبداللطیف صاحب فلسفی کی خدمت گرامی میں موصوف کے اعزازی خطاب پر پُر خلوص ہدیہ تبرک پیش کرتے ہیں۔

اعزازی طبیب صدر جمہوریہ ہند :-

حکیم عبداللطیف فلسفی کی گونا گوں مصروفیات و خدمات اور طبی لیاقت اور صداقت کی بنا پر حکومت ہند نے ان کو صدر مملکت جیسے معزز عہدے کا دو بار طبیب خاص مقرر کیا۔

ایک بار ان کے قریبی رفیق ڈاکٹر ذاکر حسین سابق وائس چانسلر کے صدر جمہوریہ منتخب ہونے پر ان کا دوسری بار صدر جمہوریہ عزت مآب وی۔ وی گری کا معالج خاص

خاص مقرر کیا۔

حکیم سید شاہد علی بدایونی کراچی شہید نے ان کو مندرجہ ذیل اشعار میں تہنیت پیش کی۔

صدر بھارت نے طبیب اپنا بنا کے آپ کو  
اس کو کہتے ہیں خداوندِ عالم کا کرم  
طب یونانی کی گویا سرپرستی کی قبول  
اس توجہ کی مبارک آپ کو شانِ نزول  
اس کے ساتھ ساتھ متعدد ادباء و شعراء نے ان کو مبارکبادیں پیش کی تھیں  
جن میں چند خاص خاص اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

بقول حکیم یوسف صدیقی یوسف کے۔

بہارِ خوشی گلشنِ طب میں آئی  
صدادی یہ بلبل کے شاخِ چمن پر  
بنے گل چمن میں کلی مسکرائی  
جگہ فلسفی نے حکومت میں پائی  
مبارک ہو اے ماہرِ فنِ حکمت  
خدا کے کرم سے ملی ہے یہ عظمت

طبابت نہ کیوں آپ پر ہونا زاناں

جو ہاتھوں میں ہے نبضِ صدرِ حکومت

مشہور شاعر محمد میاں افضل کے اشعار جو انھوں نے حکیم عبداللطیف فلسفی کی

خدمت میں پیش کئے۔

خدا دادِ ذہن رسا تم نے پایا  
ہر اک گام پر مرتب تم نے پایا

تمہیں اک عہدہ ملا شانِ والد  
مفادِ ہنر بر ملا تم نے پایا

شفاء الملک مرحوم اطباءِ قدیم کی روایات اور فنی عظمت کا بے مثل نمونہ تھے

قدیم سائنسی موضوعات پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور فنِ طب کے ذخیرہ پر

ان کی نظر بہت گہری تھی۔ وہ ملک کے صنعتی مسئلہ کو طبِ یونانی کے ذریعہ حل ہوتے

دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انھوں نے زندگی بھر جدوجہد کی۔ ان کا کوئی وقت

ذاتی یا گھر کے لئے نہیں تھا۔ وہ ہر لمحہ علمی مباحثہ تعلیمی معاملات اور طب کو درپیش

مسائل کو حل کرنے کے لئے مصروف رہتے تھے۔ وہ نہ صرف قدیم بقراطی طب کے

علمبردار تھے۔ بلکہ انھوں نے فنِ نسخہ نویسی کو باہم عروج پر پہنچایا۔ مریض کے جملہ

حالات اور مزاج کا لحاظ کرتے ہوئے مفردات پر مشتمل نسخہ تجویز کرنا ان کا طرہ امتیاز



تھا۔

## تصانیف :-

آپ کی تصانیف کی فہرست طویل ہے جنہاں میں ادبی مذہبی اور طبی ہیں۔ آپ کے مقالات میگزین طب کا لچ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دیگر طبی رسائل میں شائع ہوتے رہے آپ کے اکثر مضامین ”تجدید طب“ کے موضوع یا ”طب میں ریسرچ“ کے موضوعات پر شائع ہوتے رہے تھے۔ طبی کانفرنسوں کے لئے آپ نے خطبات بھی لکھے ہیں۔ جو طبی تحقیقی نقطہ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ حکیم صاحب کی کاوشوں سے طبیہ کالج علی گڑھ سے ۱۹۲۲ء سے ایک ماہنامہ میگزین کا اجراء ہوا جو جلد ہی ہر ماہی رسالہ میں تبدیل ہو گیا۔ اس رسالہ کا مدیر کوئی استاد ہوتا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں اس رسالہ میں طلباء کو بھی شامل کیا گیا ۱۹۴۲ء میں اس میگزین کو طبی سوسائٹی کے سپرد کیا گیا اور اس رسالہ کا نام طبی سوسائٹی میگزین رکھا گیا۔ مقالات و خطبات کانفرنس کے علاوہ اپنے طبی کتب بھی تصنیف کی ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں۔

## طبی تصانیف :-

- ۱۔ تاریخ طب۔
- ۲۔ ہماری سائنٹفک طب یونانی۔
- ۳۔ تحقیق المقال فی تعریف الاعتدال۔
- ۴۔ التحقیق المطلوب فی الماء المشرب۔
- ۵۔ طبی ڈائری۔
- ۶۔ مختصر تاریخ قدیم تشریح۔ منافع الاعضاء و علم الجراحت۔
- ۷۔ ہماری طب میں ہندوؤں کا سا جھا۔
- ۸۔ طب اور سائنس۔
- ۹۔ نبض۔

۱۔ ترجمہ و شرح ادویہ قلبیہ مصنف شیخ بوعلی سینا۔

## مذہبی تصانیف اور مذہبی رجحانات :-

چونکہ حکیم صاحب گہرے مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے اور ان کی مذہبی معلومات بہت وسیع تھیں قرآن اور حدیث کا مطالعہ آخر عمر تک رہا ان مذہبی معلومات کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعات سے ہو جائے گا۔

مشہور ناقد اور مفسر قرآن مولانا عبد الماجد دریا آبادی کی تفسیر باحدی پر ایک تبصرہ مولانا کے داماد اور بھانجے حکیم عبدالقوی دریا آبادی کے اب کے صدق جدید میں میں حکیم صاحب کے تبصرہ میں مولانا نے پوری وسعت قلبی سے ہاشمیہ میں ان کی صحت کا اعتراف کیا ہے۔

اسی طرح مولانا منظور نعمانی نے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے وہ درک حدیث میں ان کے مرتبہ کا تعین کرنے کے لئے کافی ہیں۔

”اکثر اہم دینی موضوعات پر گفتگو فرماتے۔ کبھی کبھی قرآن مجید کی کسی آیت یا کسی حدیث کے بارے میں تحریری مراسلات بھی فرماتے مولانا منظور نعمانی کی تالیف معارف الحدیث کی جب کوئی نئی جلد تیار ہوتی اور مولانا حکیم صاحب کی خدمت میں بدینا ان کو بھیجتے تو حکیم صاحب اس کتاب کا ہفتہ عشرہ میں ہی مطالعہ کر لیتے اور اس طرح مطالعہ کرتے کہ کتابت و طباعت کی غلطیوں کی جانب بھی متوجہ کر دیتے تھے تاکہ آئندہ کتابت و طباعت کی غلطیوں کا تدارک کیا جاسکے۔“

صوم و صلوٰۃ اور وظائف کا اہتمام فرماتے تھے پہلے حضرت میاں سید راجہ صاحب سے بیعت ہوئے بعد ان کے انتقال کے مولانا مطلوب الرحمن عثمانی دیوبند سے انتقال سے چند سال قبل مولانا شاہ وصی اللہ آباد سے بیعت ہو گئے تھے۔

یہی بنا تھی کہ خالص طہی حیثیت سے معروف ہونے کے بعد بھی مولانا کا مذہب میں عمل دخل بہت تھا اور ساتھ میں مذہبی معلومات بھی۔

مندرجہ ذیل مذہبی تصانیف ہیں۔

۱۔ فلسفہ نبوت

۲۔ راضیہ مرضیہ۔

یہ مذہب اور لائڈہیت۔

اس کے ساتھ ساتھ طبی تحقیقات اور ریسرچ کے خیال سے آپ نے کتب خانے میں متعدد اضافہ کیا۔ اکثر نادرونایاب طبی کتب آپ ہی کی کوشش سے طبئیہ کالج میں فراہم ہوئیں اور یہ کتب خانہ تحقیقی نقطہ نگاہ سے ایک قابل قدر کتب خانہ بن گیا۔ پینسٹھ سال کی عمر میں بھی آپ کی صحت قابل رشک تھی۔ بقول خود حکیم عبداللطیف کے۔

”اس زمانے میں شانوں اور بازوؤں میں لعاب خوب تیاری پر تھا“

اور یہ صحت کا کرشمہ ان کی صحت اور ذوق و شوق و حثہ سے نمایاں تھا۔ نمائش دنگل علی گڑھ کے وہ ہمیشہ جج ہوتے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ کی نمائش میں جرت کے مشہور پہلوان زبکو اور رستم زماں گاما پہلوان کی نمائش گراؤنڈ میں جو تاریخی کشتی ہوتی تھی اور اس کشتی میں بھولو پہلوان کا نمائندہ گاما اس جرمن پہلوان سے ایک گھنٹہ کی زور آزمائی کے بعد جیتا تھا اس تاریخ ساز کشتی کے بھی حکیم صاحب جج تھے۔

چونکہ آپ طب اور فلسفہ میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور آپ کا ہر مضمون و لیکچر طبی فلسفہ میں ڈوبا ہوتا تھا۔ اسی بنا پر آپ فلسفی کے خطاب سے معروف ہوئے۔

## وفات :-

شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی ۱۹۶۱ء میں طبئیہ کالج مسلم یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد ۱۹۶۵ء میں جامعہ طبئیہ دہلی کے پرنسپل مقرر ہوئے ہیں پر آپ پر قلبی امراض شروع ہوئے۔ جس کی بنا پر مستعفی ہو کر اپنے وطن لکھنؤ پہنچے اور اپنا آبائی واجدادی مطب جھوانی ٹولہ میں سنبھالا۔ اسی دوران مرض نے غلبہ کیا اور بالآخر یہ آفتاب علم ۱۳۔ ۱۴۔ نومبر ۱۹۷۰ء مطابق ۱۲۔ ۱۳۔ رمضان ۱۳۹۰ھ کی درمیانی شب میں اپنی گردشِ حیات پوری کر کے دامن لکھنؤ میں غروب ہوا۔

ان کے انتقال کے بعد دنیائے طب میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ شعراء و ادباء و اطباء نے اپنے اپنے طرز پر نذرانہ عقیدت پیش کئے۔  
 قطعات تاریخ وفات۔

از حکیم نور العین حسن رانغب۔  
 عبداللطیف فخر اطباءئے روزگار  
 استاد طب مصنف و ذخار فلسفی  
 افسوس وہ طبیب کہ شیخ الرئیس وقت  
 رانغب سن وفات یہ ایمائے نعیم ہے  
 نازاں تھا جن کی ذات پر سر جوہر و کمال  
 جوہر کمال فن میں تھے یکتا و بے مثال  
 دار بقا کو کر گئے ناگاہ انتقال  
 عبداللطیف واصل درگاہ ذوالکمال

حکمت بناہ وقت مذاقت آب عصر  
 روپوش گشت حیف چو ام و زم زریخاک  
 تاریخ انتقال بگور رانغب حزیں  
 عبداللطیف شد بجواز خدائے پاک

۱۳۹۰ھ

حکیم نثار احمد علیوی نے کراچی سے مندرجہ ذیل اشعار بطور قطعات کہے۔

مچھٹ پڑا سلسلہ کوہ گراں ہے اے دوست  
 کہ نہ دل ہے نہ جگر اور نہ جان ہے اے دوست  
 شیخ دوراں وہ لطیف آہ کہاں ہے اے دوست  
 مضطرب خلق ہے جب سے وہ نہاں ہے اے دوست  
 ہیں پریشان بہراک شہر مریضوں کے گمروہ  
 جس کی چٹکی میں شفا تھی وہ کہاں ہے اے دوست  
 جس کے اخلاص و محبت کی قسم کھاتے تھے  
 اب وہی رونق بزم اور گراں ہے اے دوست  
 اٹھ گیا بائے جو تھا بند میں رازی کی مثال  
 کون عالم میں نہیں گریہ کنناں ہے اے دوست  
 مند علم سے خالی ہے چھوائی ٹولہ  
 ایسا پردے میں گیا شیخ زماں ہے اے دوست

سر سے شاگردوں کے سایہ جو اٹھا ہے اُن کا  
زندگی ان کے لئے بارگراں ہے اے دوست

## پسماندگان و شاگردِ رشید :-

حکیم صاحب کی شادی ۱۹۱۷ء میں ان کی منجھلی خالہ کی چھوٹی صاحبزادی راضیہ بیگم بنت منشی سید محمود حسین سے ہوئی تھی۔  
ایک صاحبزادہ احمد سعید اور دو صاحبزادیاں حمیرہ بیگم اور شاہدہ بیگم ان کی یادگار ہیں۔

اور شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے جو آج بھی ملک کے مختلف مقامات پر متعدد اہم عہدوں پر فائز ہیں۔

## طبعی معرکے :-

حکیم عبداللطیف کے علاج و معالجہ طبعی مشاہدات اور تجربات پر کئی کتب ان کے شاگردوں نے سپرد قلم کی ہیں۔ لیکن چند ایسے واقعات جو مخفی اور تاریخی ہیں ذیل میں تحریر ہیں۔

۱، ایک بار ایک نواب صاحب کی دختر حکیم صاحب کے مطب میں تشریف لائیں۔ ان کے پیر میں ایک سفید داغ تھا حکیم صاحب نے جن کا مطب مزاج خاص و عام تھا ان دختر نواب صاحب کو برص تجویز کر کے مندرجہ ذیل نسخہ لکھوایا۔

بابجی سرسوکہ بلیہ سیاہ۔ گل حنا۔ گل نیم۔ چوب چینی۔ ہر ایک ۶ ماشہ کوٹ کر رات کو گرم پانی میں بھگو دیں۔ صبح مل چھان کر ۲ تولہ خالص شہد ملا کر پلائیں اور ایک لیپ۔ (ضماد)

بابجی بار سنگھار کی ڈنڈی سرمہ اصفہانی تخم پنواڑ۔ کبریت۔ عاقرقرا۔ ہم وزن باریک کر کے سرکہ خالص میں پیس کر ضماد تیار کریں اور داغ پر کئی بار ملیں۔  
تقریباً دو ڈھائی مہینہ یہی نسخہ استعمال میں رہا۔ پھر مریضہ نے مطب میں آکر بتایا کہ اب طبیعت میں بوجھ اور کسل نہیں ہے اور سفید داغ مٹ کر جلد کے مشابہ

ہو گیا ہے۔

ایک مرتبہ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب اپنے بچے کو لے کر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ نہ صرف شہر بلکہ بیرون شہر کے ڈاکٹروں کو بھی دکھا چکے ہیں۔ کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب ڈاکٹروں نے آخری علاج آپریشن تجویز کیا ہے۔ حکیم صاحب نے پروفیسر صاحب کے اس پانچ سالہ بچے کا بغور معائنہ کیا اور مطب میں موجود شاگردوں کو بھی بچے کو دکھا کر ورم نوزین (ٹائلسز) تجویز کیا۔ اور مندرجہ ذیل نسخہ لکھایا۔

لعوق خیاب شنبہ ۵۔ ۵ ماشہ دن میں کئی بار چٹائیں اور مغز املتا س ۵ تولہ کو پانی میں اتنا پکائیں کہ ۱ پاؤ پانی رہ جائے۔ اب پھر ۲ تولہ اس پکائے ہوئے پانی میں ۲ تولہ دو دھدال دیں اور اتنا پکائیں کہ سب ۵ تولہ رہ جائے یعنی سب کا نصف اب اس چھانی ہوئی دوا سے غرارہ کرائیں۔ پروفیسر صاحب کو یہ نسخہ ایک ماہ استعمال کرانے کی ہدایت کی۔

پروفیسر صاحب جاتے جاتے پوچھنے لگے کہ حکیم صاحب ٹھیک ہو جائیگا؟ میں ماہر گلہ کو بچہ کو دکھا چکا ہوں۔ حکیم صاحب نے تسلی اور تشفی دینے کے بعد کہا کہ انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا۔

انشاء اللہ لفظ کی برکت حکیم صاحب کے ہاتھ میں دستِ شفا اور نسخہ کی معقولیت کہ ایک ماہ میں بچہ بالکل ٹھیک ہو گیا۔

## پدم شری حکیم ہمدرد ۱۹۰۸ء حکیم حاجی عبدالحمید دہلوی

بھارت میں کاروانِ طب کا سپہ سالار

آج ہندوستان میں طب یونانی کی اہمیت اور افادیت۔ گہرائی اور گیرائی سے۔  
اگر کوئی واقف ہے تو وہ طب یونانی کی گراں مایہ۔ گراں قدر مایہ ناز ہستی حکیم عبدالحمید  
سے بھی واقف ہوگا۔

تاریخِ طب میں جس طرح نامی گرامی ہستیاں قابلِ قدر شخصیتیں معروف حکماء  
مشہور اطباء ہوئے ہیں اور آج ہمیں ان کی تاریخ پڑھنے کے بعد یہ سوچنے اور  
خیال کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ایسے بھی تھے۔ کیسے ہوں گے یہ ذی علم؟  
ایسے لاتعداد سوالوں کے جواب میں موجودہ دور کے صرف ایک فرد کو سامنے  
اگر کر دیا جائے تو انسانی ذہن خود بخود یہ حقیقت سمجھنے اور ماننے پر مجبور ہو جائیگا۔  
حکیم حاجی عبدالحمید کی ذات گرامی ایسی ہی ہے جیسی تاریخ کے اوراق  
میں قصہ پارینہ بن چکی ہوتی۔ تاریخ حکیم عبدالحمید فرد واحد ہے مگر اپنی ذات میں  
ایک انجمن۔

تاریخ میں ایسی بہت کم ہستیاں ہوئی ہیں جن کو ان کی حیات ہی میں شہرت  
ابدی مل گئی ہو۔ حکیم عبدالحمید بھی ان کمیاب ہستیوں میں ایک ہستی ہے جس نے  
صلہ و ستائش کی تمنا سے بے پرواہ ہو کر طب یونانی اور ہندوستان کے غرباء  
کی خدمت کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔



الحاج حكيم عبد الحميد صاحب



ماضی کے بقراط۔ افلاطون۔ ارسطو۔ جالینوس! بوعلی سینا اور رازی کی مشترکہ مساعیٰ جمیلہ کی اگر کوئی شکل بنتی تو وہ حکیم عبد الحمید کی محنت اور کوششوں کا مجموعہ ہوتی۔

ہندوستان میں طب یونانی کو زندہ و پائندہ رکھنے والا اگر کوئی فرد ہے تو وہ حکیم حاجی عبد الحمید کی شکل میں موجود ہے۔

## خاندان :-

حکیم عبد الحمید صاحب کے اجداد چینی ترکستان کے مشہور شہر کاشغر سے سترھویں صدی کے شروع میں ترک وطن کر کے پشاور شہر کو انتقال کیا۔ یہ مہاجرین اجداد تجارتھے۔

وطنِ اول بھی ترکستان چین اور کاشغر میں ان کے آباؤ اجداد کا فنِ معاش اور قالین سازی تھا۔ کچھ افراد خاندان کپڑوں کی تجارت سے بھی وابستہ تھے۔ پشاور میں ان کے خاندان کے بزرگوں کا قیام قریب قریب پون صدی سے زیادہ رہا۔ جس میں بزرگ قدیمی روایات اور پیشہ سے منسلک رہے اور کچھ نے پیشہ خشک فروٹ کی خرید و فروخت کا اختیار کر لیا تھا تو کچھ پنساری یا دیگر کاروبار سے منسلک ہو گئے۔ اس کے بعد ایک لمبے وقفے تک یہ بزرگ ملتان میں بھی مقیم رہے تھے۔

حکیم عبد الحمید کے پردادا نے صوبہ ملتان اور پنجاب میں سیاسی تغیرات اور اٹھل پٹھل کے بعد اٹھارویں صدی کی دوسری رہائی کے قریب فکرِ معاش اور استحکامِ معاش کی تلاش میں ہندوستان کی سلطنتِ دہلی کا رخ کیا اور دارالسلطنتِ دہلی کے محلِ حوضِ قاضی جیسے تاریخی مقام میں فنِ عطاری اور پنساری ہٹا کی دوکانوں سے خورد و نوش کا انتظام کرنا شروع کیا۔ ہنگامہ غار کی آمد آمد کی خبر سن کر مورثِ اعلیٰ پانی پت منتقل ہو گئے جہاں حکیم عبد الحمید کے دادا حافظ شیخ رحیم بخش کی پیدائش ۱۸۶۳ء میں اور نانا شیخ کریم بخش کی پیدائش ۱۸۶۱ء میں ہوئی۔ حسن اتفاق دونوں عزیز برادر تھے۔ شوقِ ستیاجی اور جہاں گردی

کے سبب شیخ رحیم بخش اودھ کے شہر پٹلی بھیت منتقل ہو گئے ذریعہ اور سلسلہ نسب کے لئے ایک بزرگ کے خاندان اور کاروبار سے منسلک ہو گئے۔

یہیں ان کے والد بزرگوار حکیم عبدالمجید اور چچا حافظ عبدالرشید کی ولادت باسعادت بالترتیب ۱۸۸۳ء اور ۱۸۸۶ء کو ہوئی۔

اور کچھ عرصہ کے بعد دادا اپنی اولادوں کے ساتھ مسکن قدیم حوض قاضی میں آکر مقیم ہو گئے ان کے والد کی تعلیم و تربیت ہونے لگی یہیں انھوں نے فن عطاری اور دوا سازی کی تربیت حکیم اجمل خاں کے ادارہ ہندوستانی دواخانہ میں حاصل کی اور دواخانہ کو ایک نئی شکل انجام دی۔ اس دواخانہ میں ان کے والد کو طب کا گہرائی اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے کا وقت ملا۔ اور بعد میں ایک نیا حوصلہ منگ اور بوش لے کر اپنی تمام دیانت داریوں اور ایمان داریوں کی عظمتوں کے ساتھ ہندوستانی دواخانہ سے الگ ہو کر ایک عظیم کام کے لئے سینہ سپر ہو کر حوض قاضی میں ایک چند فٹ کی دوکان میں دواخانہ کا کام عطاری سے شروع کیا۔

## پیدائش۔

عبدالحمد کی پیدائش بمقام دہلی ۱۳ ستمبر ۱۹۰۸ء مطابق ۱۷ شعبان ۱۳۶۶ھ کو ایک نہایت ماسر و کامل خاندان طب جس کی رگ رگ میں فن طب کا خون رواں درواں تھا آنکھ کھولی۔ اور پروان چڑھتے چڑھتے فن عطاری کے رموز و نکات سے واقف ہو گئے۔ کیونکہ آنکھ کھولتے ہی والد کی ہدایت اور دین کی رغبت کی بنا پر فن میں کامل دستگاہ حاصل کر لی تھی۔

## تعلیم و تربیت۔

بچپن کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور شوق و لگن کے بعد ابھی سن بلوغت کی جانب قدم اٹھا ہی رہے تھے ناگاہ ۱۳ اور ۱۴ سال کی عمر کے درمیان والد ماجد داغ مفارقت دے گئے۔ اور ذمہ داریوں کا بوجھ ناتواں کاندھوں پر آن پڑا۔ آپ نے طبیہ کالج دہلی سے بقول جلال الدین فزند علامہ حکیم کبیر الدین مرحوم

خصوصی شفقت اور مہربانی شیوخ طب حکیم محمد کبیر الدین صدر الاطباء حکیم محمد الیاس خاں و حکیم فضل الرحمان کی خصوصی مہربانی سے سند طب حاصل کی۔

## خدمات :-

دستور زمانہ ہے کہ ہر بڑی ہستی خادم کے بعد مخدوم کے درجہ کمال کو جا پہنچتی ہے لیکن عبد الحمید کی ذات صفات پر یہ کلیہ صادق نہیں آتا ہے لیکن آج بھی پیرانہ سالی کے باوجود وہ مجتہد خدمات کی جتنی جاگتی تصویر ہیں۔

۸۰ سال سے زائد عمر کے باوجود جس تندہی جانفشانی، محنت، لگن اور سب سے بڑھ کر پابندی وقت سے اپنے دل تمام کے تمام کام کاج انجام دیتے ہیں وہ قابل رشک ہے۔

صحیحی اخلاقی، تمدنی اور فنی نقطہ نظر سے آپ نے جہاں بے شمار خدمات انجام دی ہیں وہاں پابندی وقت سے ۱۹۳۰ء سے دہلی میں مطب کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ جاڑا، گرمی بہار اور موسم برسات غرضیکہ کوئی بھی موسم ہو آپ اپنے وقت معینہ پر دواخانہ ایسے حاضر ہوتے ہیں کہ لوگ ان کے آنے جانے پر اپنی گھڑی کو ملا لیتے ہیں۔

ان کی پرورش و پرداخت میں ماں کی تعلیم و تربیت کا بڑا دخل تھا۔ ماں کی خدمت اور محبت کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ آج ان کی محنت کا ثمرہ بشکل بہادر موجود ہے۔ بہادر آج نہ صرف طب کی دنیا میں بلکہ علاج و معالجہ کے میدان میں ایک معتبر و منفرد نام ہے اور حکیم صاحب موصوف تمام ملازمین بہادر کے ساتھ نہایت محبت سے پیش آتے اور ان کی تمام مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بڑی لگن اور مستعدی کے ساتھ رفتہ رفتہ بہادر کی تعمیر اور محنت و دیانتداری کو اپنا فریضہ سمجھا اور یہی وجہ ہے کہ فن دوا سازی میں بہادر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ممالک میں اپنا ایک باوقار مقام حاصل کئے ہوئے ہے۔ اور پرفخر حاصل ہے کہ اس ادارے میں عمدہ خالص اور اصلی ادویات تلاش و جستجو کے بعد تیار کی جاتی ہیں۔

حکیم عبدالحمید آج فنِ طب کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ ان کو اس مقام پر پہنچانے میں چند معاونین نے ہاتھ تو بٹایا لیکن اپنی کوشش۔ عمل پیہم۔ زیادہ معاون رہی۔ والد بزرگوار کے گذرتے ہی حکیم عبدالحمید نے مسلسل محنت بھر پور توجہ۔ وقت کی پابندی اور سب سے بڑھ کر خوش اخلاقی کی بدولت ہمدرد و اخانہ کو ملک میں اس مقام پر لاکھ کھڑا کر دیا ہے کہ طبِ یونانی آج ہمدرد کی ذات سے پہچانی جاتی ہے۔

اس درمیان کاروبار اور فنِ طب پر کئی بار زوال آیا لیکن مسلسل جانفشانی اور مستقل جدوجہد کی بنا پر فن اور دو اخانہ اپنی جگہ پر مستحکم رہا۔ ان کے بھائی حکیم محمد سعید ان کے بارے میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ۔

تعلیمِ طبی ختم کر کے اور فراغت پا کر بھائی جان نے ہمدرد کی باگ ڈور سنبھال لی۔ اور وہ آبا جان کے لگائے ہوئے پودے کو اب پھل دار درخت بنانے کی جدوجہد میں لگ گئے۔ اس حقیقت کا اظہار بید ضروری ہے بھائی جان کو بچپن سے ہوش سنبھالنے تک اور بڑے ہونے تک کھیل کود کے مواقع میسر نہیں آئے۔ انھوں نے آنکھ کھولتے ہی اپنے ماحول کو علمی پایا اور ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے ہاتھ میں کتاب و قلم پکڑ لیا۔

حکیم عبدالحمید کی زندگی سب کے سامنے ہے ہمیشہ ان کے ہاتھ میں کتاب و قلم ہی دیکھے گئے ہیں شاید ہی تاریخ میں ایسی مثالیں ملتی ہوں اور اگر ایسی مثالیں موجود بھی ہوں گی تو صرف اولیاء اللہ ہی کی مثالیں ہوں گی۔ جب بھی غور کیا جاتا ہے کہ کیا ایک کاروباری انسان کی زندگی کا آغاز کتاب و قلم سے بھی ہو سکتا ہے تو سخت حیرت ہوتی ہے۔

حکیم عبدالحمید صاحب ایک کاروباری ماحول میں پیدا ہوئے تھے لیکن مالکِ کونین کی طرف سے ایک فطری دل۔ حساس طبیعت اور نرم گفتار مزاج کے فرد بنے۔

کاروبار کو وسعت دینے اور جسم انسانی کو مرض سے بچانے کے لئے انھوں نے

۱۹۳۲ء میں ایک رسالہ ”بہمدرد صحت“ جاری کیا جس کے خاص نمبر جو جولائی میں منظر عام پر آتے تھے بہر خاص و عام کی توجہ اور مرضاء و امراض کے پیش بہا خزانے سے پر ہوتے تھے۔ مدیرِ اول حکیم خواجہ نیاز احمد جو ان کے دستِ راست تھے مقرر ہوئے پھر یہ ادارت کی ذمہ داری بھی اپنے کاندھوں پر ڈال لی۔ بعد اس کے ۱۹۳۷ء سے حکیم محمد سعید برادرِ خورد مدیر مقرر ہوئے جو تقسیم ملک سے قبل تک رہے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں عارضی طور پر کچھ عرصہ کے لئے بند رہا پھر برادرِ خورد حکیم محمد سعید کی مہربانیوں اور کوششوں سے ۱۹۴۸ء سے کراچی سے دوبارہ اجراء ہو جو آج تک مسلسل پابندی وقت سے برابر شائع ہو رہا ہے۔

کاروبار کو وسعت دینے اور دیگر ممالک میں طب و رفتارِ طب کا جائزہ لینے کے لئے انھوں نے اپنے بھائی کے ساتھ ۱۹۵۲ء میں جنوب مشرقی ایشیا کا سفر ایک دیگر رفقاء ڈاکٹر برکات احمد کے ساتھ کیا۔ اس دورے میں مشرقی پاکستان موجودہ بنگلہ دیش۔ رنگون۔ بنکاک انڈونیشیا وغیرہ میں دسی طبوں کی ترقی کا جائزہ لیا۔ یہ سفر کوئی دو ماہ کے وقفہ کا رہا۔

اس کے بعد ۱۹۵۶ء میں قریب ڈھائی ماہ کے طویل عرصہ تک کا ایک سفر یورپ کے مندرجہ ذیل ملکوں کا کیا۔

ترکی انگلستان فرانس۔ اسپین، جرمنی۔ ہالینڈ۔ سوئٹزر لینڈ وغیرہ کا گھومنے اور سیاحت کرنے کا حکیم عبدالحمید کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد تھا کہ طب اور سائنس کی دنیا میں مغرب نے کسی حد تک ترقی اور پیش رفت کی ہے۔ فنِ صدفہ یا درو سازی میں کیا اصلاحی اور انقلابی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ ارباب علم و دانش و ادب کسی انداز اور شیخ سے کام کر رہے ہیں۔ مذہبی حیثیت کی حامل مقامات کی کیا اہمیت ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

سفر سے لوٹتے ہی حکیم صاحب نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اتنے بڑے و عظیم ادارہ کو ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیا۔ یہ خدمت ہی حکیم صاحب کی اتنی بڑی و گراں قدر خدمت تھی کہ حکیم صاحب کا یہی کارنامہ ان کو حیاتِ جاودانی

بخشنے کے لئے کافی تھا۔

مندرجہ بالا اسفار سے حکیم صاحب نے طب کو نئی شکل اور ایک نیا بانگین عطا کرنے کا عہد کیا۔ تاریخ موجود ہے کہ اتنے بڑے بڑے پروجیکٹ اور پروگرام کسی ایک فرد واحد کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں اور کسی نے آج تک وہ کام نہ کئے جو ان کی اکیلی ذاتِ جمیلہ سے ہو گیا ہے۔

۱۔ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن :-

حکیم صاحب نے اپنے ادارے ہمدرد کی جانب سے انجینئرنگ کی جہاں سے طب ادب اور نمایاں و اعلیٰ تعلیم کے مقاصد کے لئے وظائف دیئے جاتے ہیں۔ یہ ۱۹۶۲ء میں بنا۔

۲۔ ہمدرد ریسرچ کلینک اینڈ نرسنگ ہوم :-

جہاں سے ہندوستان کے لا علاج مرضاء کی تجویز و تشخیص اور اسپتال میں بھرتی ہو کر آپریشن و اکیونکچر کے سٹائے ہوئے مریض علاج کراتے ہیں۔ اس نرسنگ ہوم میں لا تعداد ایم۔ ایس۔ و ایف آر سی ایس ڈاکٹر حکیم صاحب کی ماتحتی میں خدمات انجام دیتے ہیں۔

۳۔ غالب اکاڈمی :-

جہاں اردو ادب کے تحقیقی اور بنیادی کام انجام دیئے جاتے ہیں۔

۴۔ ہمدرد کالج آف فارمیسی :-

اس کالج سے جدید تعلیم سے فارسی کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔

۵۔ ہمدرد طبی کالج :-

جہاں سے طبی تعلیم کی ترویج اور اشاعت ہوتی ہے اس کالج کے سند یافتہ

نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دیگر ممالک تک میں ہیں۔

۶۔ مجید پب گریس اسکول :-

جہاں سے ابتدائی تعلیم سے لے کر اونچے درجات تک کی تعلیم شعبہ نسواں

کے تحت دی جاتی ہے۔

۷۔ ہمدرد پبلک اسکول :- جہاں سے بچے انگریزی ماحول میں پڑھ کر

ملک و قوم کی خدمت کے لئے جاتے ہیں۔

۸۔ مجید یہ اسپتال :- جدید طریقہ علاج کے لئے بھی حکیم عبدالحمید صاحب نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ یہ اسپتال اس کی جتنی جاگتی مثال ہے۔

۹۔ ہمدرد ایجوکیشنل سوسائٹی :-

جہاں سے تعلیمی مسائل سے متعلق بیش بہا خدمات انجام دی جا رہی ہیں۔

۱۰۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز :-

۱۹۵۷ء میں حکیم عبدالحمید صاحب نے یہ شعبہ تعلق آباد میں کھولا تھا جو تیسرا ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں پر اسلامی ادب اور اسلامی مسائل سے متعلق جتنا مواد حکیم صاحب نے فراہم کر دیا ہے شاید پورے خطہ ایشیا میں نہیں ہے۔ یہاں پر برابر سیمینار اور سمپوزیم ہوتے رہتے ہیں۔

۱۱۔ انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ :-

یہ ادارہ جس کا مخفف آئی۔ ایچ۔ ایم۔ آر۔ ہے۔ اس کی بنیاد اور رسم افتتاح ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھوں ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ یہ شعبہ اور اس کے کارکنان خصوصاً مسٹر حبیب احمد خاں صاحب بڑی مستعدی سے فن طب اور محققین کی بڑی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

حکیم عبدالحمید صاحب کے برادر خور د حکیم سعید نے اس خدمت کے بعد حکیم صاحب کو دادِ تحسین دیتے ہوئے کہا ہے کہ :-

”ماضی میں اور آج بھی دنیا کے اسلام میں بڑے عجیب واقعات رونما ہوئے ہیں افراط و تفریط کی کم از کم دو جماعتوں نے اپنی اپنی راہوں کا تعین کیا ہے۔ ایک جماعت ان علماء کی ہے جو دنیا پرست ہیں اور متعصب اور علم سے بہت دور۔ یہ وہ ارباب مذہب ہیں جو اپنی ہوا پرستی یا تعصب و جہالت سے خود مذہب کو بھی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ دوسری جماعت وہ ہے جو ان کے مذہب کے مقابل ہے اور دائمی تحقیق و اجتہادِ فکر ہے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے علم و حکمت و دانشمندی۔ مذہبِ عقلی

کے نام پر الحاد و انکار کا شور برپا کیا ہوا ہے۔ اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نہ مدرسہ میں علم ہے نہ ممبر و محراب میں اخلاق و اخلاص۔ اصحابِ صدق و صفا اور اربابِ فکر و نظر الگ کھڑے ہیں۔۔۔

بھائی جان حکیم عبدالحمید کے بارے میں یقین اور دیانتداری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کا شمار اربابِ صدق و صفا میں ہے۔ وہ بے نیا دنیا اور نیا زمند حق ہیں۔ وہ اپنے بوریائے فقر پر قانع ہیں۔ اور اسی قناعت کے ساتھ علم و حکمت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی جھولی میں حق و صداقت کا بیج ہے جسے انھوں نے تعلق آباد کی سر زمین پر ڈال دیا ہے اور وہ اب اپنی فصل کی کاشت خود کر لیں گے۔“

آج نئی دہلی میں حکیم عبدالحمید صاحب نے سہمردنگر اور اولی سہاڑ کی پڑیچ وادیوں کو کاٹ چھانٹ کر جس طرح بنایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے علم و فن و مہر کا ایک شہر بسا دیا ہے۔

اس سہمردنگر میں ایسی ایسی بلند و بالا عمارتیں جس طرح ایک فردِ واحد کی عظمت کی گواہی دے رہی ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ بقول خواجہ حسن ثنائی نظامی۔

”شاہ جہاں نے اپنی آمدنی کا جتنا حصہ عمارتیں بنانے میں صرف کیا ہوگا حکیم صاحب نے اس سے کہیں زیادہ کیا ہے۔ مگر حکیم صاحب نہ تو کسی ملک کے مطلق العنان بادشاہ ہیں کہ رعایا کی کمائی بے حساب آئے اور بے حساب خرچ کی جائے اور نہ انھیں اس طرح کا ذوق ہے کہ محلِ قلع اور مقبرے بنواتے پھریں تاہم انھوں نے اپنی محنت کی اور حق حلال کی کمائی کو عمارتیں پٹوانے میں بیدریغ خرچ کیا ہے۔ نئے زمانے کی دلی میں کسی فرد کو شاہ جہاں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے تو وہ حکیم صاحب کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔“

اعزازات :-

حکیم عبدالحمید صاحب نے سب کچھ قوم اور ملک و ملت کے لئے کیا ہے۔



اپنے لئے کچھ نہیں رکھا۔ اور کہا۔  
 بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ موجودہ ہمدرد و اخانے کالائیسنس  
 بھی حکیم صاحب نے دوسروں کے نام بنوایا ہے۔  
 حکیم صاحب اب زندگی کے اس موڑ پر جا پہنچے ہیں۔ جہاں نہ تو صلہ کی تمنا  
 ہے اور نہ ہی ستائش کی پرواہ ہے۔

وہ ہندوستان کی متعدد انجمنوں، تعلیم گاہوں، سماجی، ثقافتی، طبی اور ادبی  
 سوسائٹیوں اور کمیٹیوں کے صدر، چیرمین اور ممبر ہیں۔  
 اپنی ان تعلیمی و طبی خدمات کے عوض حکومت ہند نے ان کو ۱۹۶۵ء میں  
 پدم شری جیسے خطاب اور اعزاز سے نوازا۔ اور یہی نہیں۔ ممالک غیر تک نے ان کو  
 ابن سینا جیسے اعزاز و خطاب سے ۱۹۸۳ء میں دنیا کی عظیم حکومت روس نے  
 سرفراز کیا۔

## تصانیف:-

آپ اتنے مصروف بلند حوصلہ، شفیق، سادہ مزاج اور سب سے بڑھ کر بلند اخلاق  
 کی جتنی جاگتی تصویر ہیں، کہ وقت کے یہ تابع نہیں بلکہ وقت ان کا غلام ہے۔  
 ہر بڑے طبیب کی طرح انھوں نے بھی طب کی بہت سی کتب شائع کرائی ہیں  
 جن میں

ہمدرد مطب - ہمدرد عطار قرابادین ہمدرد۔

اور اپنے والد ماجد کے مرکبات، تجربات کے مجموعہ کو قرابادین مجیدی کے نام سے

طبع کرایا ہے۔ نام و نمود سے بچنے کی خاطر ان کتب میں سے کسی پر بحیثیت مصنف۔

مؤلف۔ مرتب یہاں تک کہ ناشر کی حیثیت سے بھی اپنا نام نہیں ڈالا ہے۔

حکیم عبدالحمید صاحب حقیقتاً بڑے آدمی ہیں۔ ان میں وہ تمام تر خوبیاں

موجود ہیں جو ایک بڑے فنکار یا بڑے ادیب یا فصیح و بلیغ فرد میں ہوتی ہیں۔

# حکیم سید علی کوثر چاند پوری

۱۹۰۸ء طبعی اور ادبی ادب کا نقیب

ایسی شخصیت کا نام ہے جو طبعی اور ادبی حلقوں میں یکساں مشہور ہے اردو جاننے والا اور ادب سے دلچسپی رکھنے والا کوئی باذوق شخص اس نام سے ناواقف نہیں ہو سکتا۔ خداداد صلاحیتوں کے مالک بزرگ صنعتی ہندو پاک کے چوٹی کے طبیب اور صفِ اول کے ادیب و افسانہ نگاروں میں آپ کا شمار کیا جاتا ہے۔

حکیم صاحب کا پورا نام سید علی کوثر ہے اور ادبی نام کوثر چاند پوری۔

## پیدائش :-

آپ کی پیدائش ۱۹۰۸ء میں یوپی کے ضلع بجنور کے قصبہ چاند پور میں ہوئی آپ کے والد حکیم سید علی مظفر صاحب خود بھی پایہ کے حکیم تھے اور ضلع بجنور کے علمی اور طبعی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے اور نظم و نثر سے دلچسپی رکھتے تھے۔

## تعلیم و تربیت :-

حکیم کوثر صاحب کی پرورش بھی اس کی نگہداشت میں ہوئی۔ جو خصوصیات ان کو اپنے والد سے ورثہ میں ملی تھیں۔ ان کو انھوں نے اپنی ذاتی کاوشوں اور صلاحیتوں سے جلا دیکر ملک گیر شہرت حاصل کی۔ والد سے اردو فارسی و عربی کی ابتدائی تعلیم



حکیم سید علی کوثر چاند پوری

حاصل کر کے ۱۹۱۷ء میں ریاست بھوپال کے آصفیہ طبیہ اسکول (جو بعد میں آصفیہ طبیہ کالج کہلایا) میں داخلہ حاصل کر کے باقاعدہ طب یونانی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ یہاں کا ماحول کوثر صاحب کی طبی اور ادبی تربیت کے لئے نہایت سازگار ہوا۔ طبی اسکول میں ہر ہفتہ کو مجلس مذاکرہ کا انعقاد ہوتا تھا جس میں کوثر صاحب نے باقاعدہ حصہ لینا شروع کیا اور طبی مضامین پیش کرنا شروع کئے۔ اور رفتہ رفتہ اس عادت نے عادتِ ثانیہ کا رخ اختیار کر لیا۔ اور ان کی تحریروں میں نکھار آتا رہا۔ اور دورانِ تعلیم ہی ان کے مضامین الحکیم لاہور، جامع الطباء لکھنؤ، اور مصباح الحکمت سہارنپور میں باقاعدگی سے شائع ہونا شروع ہو گئے اور ایک طبی کتاب "الدق" کے نام سے اسی زمانے میں شائع ہوئی۔ اس کی ایک جلد اب بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی میں موجود ہے۔ ان تمام مشاغل کے باوجود حکیم صاحب اپنی طبی تعلیم کی جانب یکسوئی سے توجہ دیتے رہے اور امتیازی کامیابی بھی ۱۹۲۲ء میں طبی تعلیم امتیاز کے ساتھ اور سہجری و میڈیسن میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کر کے تقریباً تمغہ کے ساتھ مکمل کی۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد ہی حکیم کوثر صاحب کا تقریباً بحیثیت طبیب محکمہ صحت بھوپال کے زیر اثر تحصیل سلوانی کے یونانی شفاخانہ میں ہو گیا اور اس کے بعد قصبہ بگم گنج۔ رائسین نیز دیگر مقامات پر نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے۔ ان تمام علاقوں میں حکیم صاحب اپنی طبی صلاحیت اور ادبی ذوق کے باعث نہایت مشہور اور ہر دل عزیز ہو گئے۔ ان کا نام اس وقت ادبی اور طبی دنیا میں اجنبی نہیں رہا تھا اور ادبی دنیا میں وہ صفِ اول میں شامل ہو چکے تھے۔ بحیثیت ملازم کوثر صاحب کا آخری تقریباً بھوپال میں رابعہ اسپتال سے ۱۹۵۸ء میں وہ بحیثیت افسر الاطباء ریٹائرڈ ہوئے۔ کوثر صاحب طبی ادبی اور سماجی حلقوں میں یکساں طور پر دل عزیز رہے۔ بھوپال کے اطباء اور ادیب و شعراء ان کو اپنا بزرگ اور قائد تصور کرتے تھے اور وہ بھوپال ہی نہیں بلکہ مدھیہ پردیش میں طب یونانی کے ارتقاء اور اردو زبان کی بقا و ترقی کی مہم کے سب سے سالار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۴ء میں بھوپال چھوڑنے تک وہ مسلسل بلا مقابلہ اتفاق رائے سے مدھیہ پردیش یونانی طبی کانفرنس اور مدھیہ پردیش انجمن ترقی اردو کے صدر رہے۔ اپنے قیام

بھوپال کے دوران کوثر صاحب کی ذات اور شخصیت وہاں کی ادبی اور طبّی زندگی کی جان تھی اور وہ ان حلقوں کے بے تاج بادشاہ تصور کئے جاتے تھے۔ پنشن حاصل کرنے کے بعد کوثر صاحب بھوپال میں ہی اپنا ذاتی مطب نہایت کامیابی سے کرتے رہے۔ جب ۱۹۶۴ میں حکیم عبدالحمید صاحب نے ہمدرد نرسنگ ہوم اینڈ ریسرچ کلینک دہلی کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کے ساتھ یونانی طب کے سربراہ کی حیثیت سے ان کی نظر انتخاب حکیم کوثر صاحب پر ٹھہری۔ حکیم عبدالحمید صاحب سے حکیم کوثر صاحب کے ذاتی اور دیرینہ تعلقات تھے اور انھوں نے اس عہدے کو قبول کرنے میں ہیکچاپٹ کا اظہار کیا۔ لیکن حکیم عبدالحمید صاحب نے یہ نکتہ کر کہ فن طب کو آپ کی ضرورت ہے، کوثر صاحب کو خاموش کر دیا۔ اور انھوں نے ہمدرد نرسنگ ہوم دہلی میں بحیثیت میڈیکل آفیسر یونانی اپنا عہدہ سنبھال لیا اور تقریباً ۱۸ سال اس سے وابستہ رہے۔ اس دوران حکیم صاحب اپنی طبی صلاحیتوں اور نباضی کی بنا پر بہت مشہور ہوئے جس کا اندازہ مریضوں کی بھٹیڑ سے لگایا جاسکتا تھا۔ گردہ کی پتھری ایکڑیما اور برص کے علاج کے لئے حکیم کوثر صاحب خصوصی طور پر مشہور ہیں۔ دہلی کے مشہور سہ جن اور ہمدرد نرسنگ ہوم کے چیف سہ جن ڈاکٹر آرا این کٹاریہ تو ان کی پتھری کے علاج سے اس قدر متاثر تھے کہ اکثر انھوں نے کئی مریض آپریشن کرنے کے بجائے حکیم کوثر صاحب کے پاس بھیجے۔ اور ان کا ہر علاج کامیاب رہا۔ ایکڑیما کی ایک مریضہ جو ہندوستانی افواج کے ایک کور کمانڈر جنرل لکھونت سنگھ کی بہن اور جن کے دونوں پیر نیچے سے اوپر تک اس مرض کا شکار تھے اور وہ مکمل مایوسی کی حالت میں تھیں۔

حکیم صاحب نے جو نکلوں کی مدد سے ان کا کامیاب علاج کیا تھا۔

اسی دوران حکیم صاحب یونین پبلک سروس کمیشن میں طبیب حضرات کے انٹرویوز کی پینل میں ایکسپرٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اور کونسل آف ریسرچ یونانی میڈیسن کی کمیٹی کے ممبر بھی رہے اور اس کے اجلاسوں میں حیدرآباد مدرسہ وغیرہ میں شرکت کی۔ اس کے ساتھ ہی وہ آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔ ۱۹۸۲ میں ہمدرد نرسنگ ہوم کے تغلق آباد میں

منتقل ہو جانے پر حکیم صاحب نے بعد میں ذاتی طور سے سبکدوش ہو کر گھر پر ہی مریضوں کو مشورہ دینے کا سلسلہ شروع کیا جو ہنوز جاری ہے۔

اپنی ان تمام فنی مصروفیات کے باوجود حکیم صاحب نے تحریر و تخلیق و تحقیق کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کی طبی تصانیف گہرے مطالعہ تجربہ اور تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ وہ جس طرح ان پر محنت سے کام کرتے ہیں اس کا اعتراف حکیم عبدالحمید صاحب نے کوثر صاحب کی تصنیف ”اطباءئے عہدِ مغلیہ“ میں اس طرح کیا ہے۔

”تمام کتب تاریخ میں سے طبی مواد کا نکالنا آسان کام نہیں۔ یہ کام وہی شخص بہتر طور پر کر سکتا ہے جو بیک وقت طبیب بھی ہو اور تاریخ کا صحیح ذوق بھی رکھتا ہو اور پھر حاصل شدہ مواد کو دلکش انداز میں پیش کرنے کے لئے ادیب بھی ہو۔ کوثر چاند پوری کی ذات میں یہ صفات ایک خاص امتزاج سے جمع ہیں۔“

حکیم صاحب کی طبی صلاحیتوں سے ہر املکت خیال کے لوگوں نے استفادہ حاصل کیا اور ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اردو کے مشہور شاعر رام کرشن مضطر صاحب بھی حکیم صاحب کے مذاح تھے اور ان کی طبی صلاحیتوں سے بے حد متاثر انھوں نے حکیم صاحب کو منظوم خراجِ تحسین اس طرح پیش کیا ہے۔

طیب نیک سرشت و ادیب نکتہ نواز  
حکیم کامل و عیبی نفس علی کوثر  
وہ خوئے لطف کہ بنیاب دل سکوں پائے  
وہ جن کے سایہ میں ملتا ہے ہر دکھی کو چین  
ہر انجمن میں ہیں جو سر بلند و سرافراز  
شعورِ طب قدیم و جدید کے مظہر  
وہ نرم لہجہ کہ بیمار کو قرار آئے  
وہ جن کا خدمتِ انسانیت ہے نصب العین

حکیم کوثر صاحب کے طبی اور ادبی معرکوں اور تصانیف پر نظر ڈالی جائے تو شاید یہ خود ایک ضخیم کتاب کی شکل میں جمع ہو۔

وہ جسمانی مریضوں کا علاج اپنے نسخوں کے ذریعہ اور سماجی برائیوں کا علاج و مداوا اپنے ادبی شاہ پاروں سے جس طرح کرتے ہیں اس سے ہر آدمی متاثر ہوتا ہے۔ اور دونوں میدانوں میں ان کی مہارت اور شہرت قابل رشک بات ہے۔ ان کی ہمہ رنگ شخصیت کو مشہور ناقد ڈاکٹر سید اعجاز حسین مرحوم اس طرح

خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

”لفظ حکیم اپنے مروجہ مفہوم کے ساتھ کوثر چاند پوری کی قباہت  
شخصیت پر اتنا تنگ ہے کہ باوجود اپنی نمایاں قدر خصوصیات کے  
پوری طرح ان کے جوہر حکمت کو سامنے نہیں آنے دیتا۔“

(مائٹیل کورڈانس و بینش مصنف کوثر چاند پوری)

حکیم صاحب کی طبی تصانیف میں سینکڑوں شائع شدہ طبی مضامین کے علاوہ  
”اطبائے عہد مغلیہ“ ”الدق“ حکیم اجمل خاں۔ طب قدیم میں جدید علوم کی آمیزش  
اور موجز القانون شامل ہیں۔ آخر الذکر نصاب تعلیم میں شامل ہے۔

آپ کا شمار بڑے صغیر ہندوپاک کے چوٹی کے طبیبوں اور صفِ اول کے ادیبوں  
میں ہوتا ہے۔ موصوف ایک سہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ اور ان کو ادبی  
طبی اور ثقافتی حلقوں میں یکساں مقبولیت و شہرت حاصل ہے۔

یہ فیصلہ کرنا از حد مشکل ہے کہ ان کا طبی سہرا یہ زیادہ ہے یا ادبی۔ بہر حال  
یقیناً یہ طب یونانی کی خوش قسمتی اور اردو ادب کی نیک نختی ہے کہ اس کو کوثر صاحب  
کی ملکیت حاصل ہے۔ چاہے ادب کا ذکر ہو یا طب کا۔ حکیم صاحب کی شخصیت پر  
دونوں پہلوؤں سے نظر ڈالے بغیر یہ کام پورا ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ انھوں نے  
اپنے قلم سے بہترین افسانوی ادب کی تخلیق کی ہے۔ برصغیر ہندوپاک کا کوئی  
معیاری جریدہ ایسا نہیں جس میں کوثر چاند پوری کی شمولیت قابلِ فخر نہ سمجھی جاتی  
ہو۔ بلاشبہ ہزاروں افسانے کوثر صاحب کے قلم سے جنم لے چکے ہیں اور ان کی  
بشیرہ کہانیاں لافانی مقام کی مالک ہیں۔ کوثر صاحب نے صرف افسانے ہی نہیں  
بلکہ ناول تحقیقی و تنقیدی کتب رپورٹاژ اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کی شخصیت  
اردو ادب میں قابلِ تعظیم و احترام ہے۔

مشہور طنز نگار فکر تو نسوی مرحوم کوثر صاحب سے تحریری انٹرویو ”ماہنامہ

شاعر کوثر چاند پوری“ میں فرماتے ہیں۔

”وہ آپ ہمیشہ مجھے قابلِ تعظیم ہی لگتے ہیں۔ آپ کا جب بھی تصور آتا تو آپ  
کے ساتھ منشی پریم چند کا تصور بھی آجاتا۔ اسکو میری عقیدت سمجھئے۔ میں آپ کو ہمیشہ

پریم چند سے ایسوسی ایٹ کرتا۔ جب میں آپ کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں تو شرفندہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ آپ کا تو صرف احترام ہی کیا جا سکتا ہے۔“

کوثر صاحب ایک اچھے نباض اور معالج ہیں۔ اپنے مریضوں کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ان کے مرض کو پہچان کر اس کا علاج کرتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ اپنے تلکھے نشتروں سے سماجی ناسوروں کو چیرتے ہیں۔ سماج میں رہنے والوں کے زخموں کا اندازہ کر کے اپنے دل سے ان کی نباضی اور قلم سے ان کا علاج کرتے ہیں۔ ان کے افسانے اور ناول اس کے مظہر ہیں جنہیں انہوں نے بیشتر سماج کی بُرائیوں کو سامنے رکھ کر تصنیف کئے ہیں۔ ان کے افسانے دلوں پر ائمٹ نقوش چھوڑتے ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی سی بات کو دل کی نظر سے دیکھ کر قلم کی زبان عطا کر دیتے ہیں۔ مشہور ادیب حیات اللہ انصاری فرماتے ہیں۔

”کوثر کے اسلوب میں پریم چند کی جھلک ہے عمومی بات میں گہرائی دیکھ لینا۔ ناقابل توجہ حرکتوں میں افسانہ پیدا کر لینا اور بڑی کہانیوں کو اختصار میں سمیٹ لینا ان ہی قلم کاروں کی وجہ سے کوثر کی بعض کہانیاں دماغ میں عرصہ تک گونجا کرتی ہیں“

رات کا سورج مصنفہ کوثر چاند پوری )

کوثر صاحب کے افسانوں کے کردار ہمارے لئے نئے نہیں۔ وہ ہمارے ارد گرد کے لوگ ہی ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں کرداروں میں تصنع یا بناوٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کے افسانے حقیقت سے قریب لگتے ہیں بعض وقت ان میں ہم کو ہماری روزمرہ کی زندگی کا احساس رہتا ہے۔ اردو کے ممتاز نقاد وقار عظیم نے اپنی کتاب ”داستاں سے افسانے تک“ میں کوثر چاند پوری کے افسانوں میں زندگی کی حقیقتوں اور فن کی رعنائیوں کا اعتراف کیا ہے۔ اور جن افسانہ نگاروں نے اردو افسانہ کو معراج عطا کی ان میں کوثر صاحب کو بھی شامل کیا ہے۔

کوثر صاحب نے طب یونانی اور اردو ادب کی انتھک اور خاموش خدمت کی ہے وہ کسی گروہ یا گروپ بندی کا شکار نہیں ہوئے اور نہ ہی کسی صلہ ستائش



یا اعزاز کی خواہش کی۔ اس کے باوجود بھی ان کو مختلف اعزازات اور انعامات سے نوازا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ اب تک شاید کوئی بھی اعزاز یا انعام ان کی بلند پایہ شخصیت کے قابل نہیں ہے۔

ڈاکٹر مجاہد حسینی صدر شعبہ اردو و فارسی ایم ڈی کالج پریل بمبئی۔ کوثر صاحب کی فن اور شخصیت پر ایک کتاب تحریر کر رہے ہیں۔ اور بھوپال میں شفیق اعجاز نے ایم اے کے لئے اپنے تحقیقی مقالے کوثر چاند پوری فن اور شخصیت کو وسعت دیکر اس پر ڈاکٹریٹ آف فلاسفی (P.H.D) کے لئے کام کر رہے ہیں۔

کوثر صاحب کا شمار اردو کے محسنوں میں ہوتا ہے۔ پروفیسر اعجاز حسین صاحب جو ہمارے محترم و مقتدر نقاد ہمیشہ شمار کئے جاتے ہیں، نے اپنے عکس اور آئینہ میں اردو افسانے کا سر بلند کرنے والے جن ۲۱ افسانہ نگاروں کو نامزد کیا ہے ان میں کوثر چاند پوری بھی شامل ہیں۔

کوثر صاحب کی تاریخی تصنیف ”بیرم خان ترکمان“ ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔ اس کے حوالہ سے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام مطبوعہ لندن میں ابوسعید بڑی ایم اے کا مقالہ شائع ہوا ہے۔ اور اسی کتاب کا حوالہ ایک روسی کتاب مصنفہ غضنفر علی یون میں دیا گیا ہے جس میں کتاب کے اقتباسات فارسی رسم الخط میں دیئے گئے ہیں۔

کوثر صاحب پیرانہ سالی کی وجہ سے تھکے نہیں ان کا قلم ابھی بھی رواں دواں ہے۔ ۸۰۵۰ اتنی سالی کی عمر میں بھی اسی انہماک سے اپنے مریضوں کو دیکھتے اور اسی ذوق و شوق و جستجو سے ادبی تخلیق کرتے ہیں اور آج بھی صف اول میں اپنے مقام پر فائز ہیں۔ مشہور پاکستانی ادیب انور سدید رقمطراز ہیں :-

” آج کے بہت سے ادیب جب پالنے میں انگوٹھا چوس رہے تھے کوثر چاند پوری شہرت کے نصف آسمان پر پہنچ چکے تھے۔ پھر کئی نامور افسانہ نگار ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی شہرت کا بوجھ نہ سہار سکے اور آج اتنے گننام ہو گئے ہیں کہ ان کا نام افسانہ نگاروں کی طویل فہرست میں بھی نظر نہیں آتا۔ لیکن کوثر چاند پوری کا قلم نہ صرف

رواں درواں ہے بلکہ ان سے آس رہتی ہے جس کا تذکرہ دل نکل کر  
لبوں تک بھی آجاتا ہے۔“

رسالہ اوراق اپریل ۱۹۷۵ء تبصرہ آوازوں کی صلیب مصنفہ کوثر چاند پوری  
انورت دید کا یہ تبصرہ آج بھی کوثر صاحب کے لئے بالکل موزوں ہے۔ ان کا  
قلم آج بھی اسی طرح جوان ہے اور اپنے سفر پرگامزن ہے۔  
وہ طب یونانی اور اردو ادب کی قابل قدر اور قابل احترام میراث ہیں۔  
۱۶ دسمبر ۱۹۸۶ء کو اردو اکاڈمی دہلی نے کوثر صاحب کے اعزاز میں ایک  
شام منعقد کی۔ انور علی دہلوی نے صدارت کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا ہے۔  
”کوثر صاحب نہ چاند پوری ہیں۔ نہ بھوپالی۔ نہ دہلوی۔ وہ ایک  
ملک گیر شخصیت ہیں۔“

## اعزازات :-

- (۱) میونسپل بورڈ مدھیہ پردیش کا ادبی اعزاز ۱۹۶۲ء۔
- (۲) اردو اکاڈمی یوپی کا مختلف کتابوں پر انعامات۔  
۱۹۴۷ء۔ ۱۹۴۸ء۔ ۱۹۴۹ء۔
- (۳) اردو اکاڈمی مدھیہ پردیش ایوارڈ ۱۹۸۱ء۔
- (۴) میر ایوارڈ۔ میر اکاڈمی۔ لکھنؤ۔

## حکیم کوثر چاند پوری کی چند مطبوعہ تصانیف :-

نمبر	فن	نام کتاب	ناشر	سن اشاعت
۱-	ناول	ویران	انوار احمد پریس الہ آباد	۱۹۴۴ء
۲-	”	داستانیں (باغ و بہار) جدید افسانوی لباس ہیں	”	۱۹۵۵ء
۳-	”	پیاسی جوانی	نیوتاج آفس دہلی	”
۴-	”	بہنی مومن	”	”

-	مکتبہ جمالیستان دہلی	انغوا۔	۵-
-	چندن بکڈپو دہلی	سب کی بیوی۔	۶-
-	بھنکا بکڈپو علی گڑھ	توڑ دو زنجیریں۔	۷-
۶۱۹۸۱	ناولستان گاندھی نگر	راکھ اور کلیاں (دوسرا ایڈیشن)	۸-
۶۱۹۶۴	مکتبہ بیسویں صدی دہلی	فریدہ مومنی کی ڈائری (فینٹی)	۹-
۶۱۹۶۴	مشورہ بکڈپو نئی دہلی	شام نغزل۔	۱۰-
-	" "	مسکرائی زندگی۔	۱۱-
۶۱۹۶۵	اسٹار پبلیکیشنز دہلی۔	عشق نہ دیکھے۔	۱۲-
۶۱۹۶۲	مکتبہ کائنات لاہور۔	محبت اور سلطنت۔	۱۳-
۶۱۹۶۲	مجلس اشاعت ادب دہلی۔	مرجھائی کلیاں۔	۱۴-
۶۱۹۶۸	حلقہ فکر و شعور دہلی۔	پتھر کا گلاب۔	۱۵-
۶۱۹۷۲	مکتبہ جامعہ۔	گونگا ہے بھگوان۔	۱۶-
-	-	مہکتی بہاریں۔	۱۶-
۶۱۹۲۹	مکتبہ جدید لاہور۔	۱۸۔ افسانوی مجموعے دلگداز افسانے۔	
۶۱۹۳۰	آسی پریس لکھنؤ۔	دنیا کی حور۔	۱۹-
۶۱۹۳۷	عالمگیر بکڈپو لاہور۔	ماہ و انجم۔	۲۰-
۶۱۹۳۸	جامعہ پریس دہلی	دلچسپ افسانے۔	۲۱-
۶۱۹۷۶	۱۲۲۱ بلیمارن دہلی	رات کا سورج۔	۲۲-
۶۱۹۳۸	مکتبہ جدید لاہور	دنیا کی حور اور دوسرے افسانے۔	۲۳-
-	انوار احمدی پریس الہ آباد	گل و لالہ۔	۲۴-
۶۱۹۴۱	" "	شب مالمح	۲۵-
-	مکتبہ جدید لاہور۔	عورتوں کے افسانے	۲۶-
-	نفس بکڈپو حیدرآباد۔	رنگین سپنے۔	۲۶-
۶۱۹۴۴	انوار احمدی پریس الہ آباد۔	لیل و نہار (افسانہ عجائب جدید افسانوی لباس میں)	۲۸-

۶۱۹۴۴	دارالبلاغ لاہور	۲۹- اشک و شرر۔
۶۱۹۶۳	سیدر اکڈمی کراچی	۳۰- شعلہ سنگ۔
۶۱۹۷۲	حلقہ فکر و شعور دہلی	۳۱- آوازوں کی صلیب۔
۶۱۹۶۸	نسیم بکڈپو لکھنؤ۔	۳۲- تحقیق و تنقید۔ دیدہ بینا۔
۶۱۹۶۵	مکتبہ کائنات لاہور	۳۳- جہان غالب۔
۶۱۹۶۸	نسیم بکڈپو لکھنؤ۔	۳۴- " " " (ہندوستانی ایشیا)
۶۱۹۸۱	مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی۔	۳۵- فکر و شعور۔
	حلقہ فکر و شعور بلیماران دہلی۔	۳۶- دانش بنیش۔
۶۱۹۴۵	انوار احمدی پریس الہ آباد	۳۷- (انشائیہ) کوثر ستاں۔
۶۱۹۶۶	حلقہ فکر و شعور دہلی۔	۳۸- رپوتاژ۔ کارواں ہمارا۔
۶۱۹۳۱	آگرہ پریس آگرہ۔	۳۹- تاریخ بیرم خاں ترکمان۔
۶۱۹۶۰	سیدر اکڈمی کراچی۔	۴۰- اطلبے عہد مغلیہ۔
۶۱۹۷۲	نسیم بکڈپو لکھنؤ۔	۴۱- حکیم اجمل خان۔
۶۱۹۳۷	مشہور بکڈپو دہلی۔	۴۲- (طنز و مزاح) مسکراہٹیں۔
۶۱۹۳۸	" "	۴۳- موج کوثر۔
۶۱۹۳۹	لاجپت رائے بکڈپو لاہور۔	۴۴- شیخ جی۔
۶۱۹۴۰	عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد۔	۴۵- نونک جھونک۔
۶۱۹۴۲	انوار احمدی پریس الہ آباد۔	۴۶- خندہ دل۔
	الہ آباد۔	۴۷- (الف) بچوں کے لئے (ب) حالی میر سید۔
	" "	۴۸- سیاح لڑکا کو لمبے
	انوار احمدی پریس الہ آباد۔	۴۹- استقلال۔
	" " "	۵۰- رشوت۔
	" " "	۵۱- بادلوں کی ملکہ۔
	" " "	۵۲- بہادر لڑکا۔
	عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد۔	۵۳- چوبہا سلیم۔

- ۵۴- چالاک مرغا۔
- ۵۵- لڑکے کا خواب۔
- ۵۶- ہونہار لڑکا۔
- ۵۷- غرور کا انجام۔
- ۵۸- موتیوں کا انڈا۔
- ۵۹- چوہوں کی بستی۔
- ۶۰- جادو کا خزانہ۔
- ۶۱- (الف) کبڑا جادوگر۔
- ۶۲- خوب صورت محل۔
- ۶۳- وفادار دوست۔
- ۶۴- (طب) موجز القانوں۔
- ۶۵- " محسن اطفال۔
- ۶۶- " الدق۔
- ۶۷- " دستور العمل۔
- ۶۸- " المباحثہ۔ العلائیہ۔
- ۶۹- " قدح کبیری۔
- ۷۰- " رسالہ آتشک۔
- ۷۱- طب قدیم میں جدید علوم کی آمیزش۔ حلقہ فکر و شعور بلجاریان دہلی وغیرہ وغیرہ۔
- ۷۲- دغا باز دوست۔
- ۷۳- سمندر کا شہزادہ۔
- ۷۴- علم و تجارت۔

# حکیم شکیل احمد شمس

۶۱۹۵۸

۶۱۹۱۲

## طبی سیاست کے ترجمان

دہلی و لکھنؤ جس طرح شعر و ادب، تہذیب و تمدن، تاریخی حیثیت سے جداگانہ اہمیت کے حامل ہیں اسی طرح دونوں مقام کے عوام کے خیالات، احساسات و اطباء کے طریقہ علاج بھی جدا جدا ہیں۔ دہلی جو شان و شوکت کا بانگ لے لے لے اگر مرکبات کا شیدائی ہے تو لکھنؤ میں علاج بالمفردات کے طریقہ کا چلن ہے۔ دہلی میں طریقہ علاج کے میدان میں اگر خاندان شریفی کو ملکہ حاصل ہے تو لکھنؤ میں خاندان عزیز کی حکمرانی ہے۔ ان مراکز میں کسی غیر طبی خاندان یا فرد واحد کو کامیابی ملنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

نرزمین ہند جو ہمیشہ سے گہوارہ امن اور صوفی سنتوں و بزرگان دین کا مرکز و مسکن رہی ہے۔ ان صوفی سنتوں و بزرگوں نے اپنے اوصاف حمیدہ سے وہ قابل ذکر کارنامے انجام دیئے ہیں جو تاریخ کا ایک سنہرا باب ہیں۔ ایسے ہی ایک بزرگ شمس تبریز تھے جن سے شمس طبقہ (پنجابی) اپنے کو منسوب کرتے ہیں۔

قوم پنجابی میں فرقہ کھتری کے اجداد کسی دریا میں نہانے جا رہے تھے ادھر سے شمس تبریز جو دعوت تبلیغ اسلام میں منہک تھے انھوں نے جب دیکھا کہ اگر اس قوم کی اصلاح کر دی جائے اور یہ قوم بامشرف اسلام ہو جائے تو خطہ پنجاب میں دین اسلام کی کرنیں بکھر جائیں گی۔

شمس تبریز نے سردار قوم سے کہا کہ اگر وہ ندی جس میں تم نہانے جا رہے ہو



حکیم تشکیل احمد شمسی صاحب مرحوم

یہیں بلا دیں تو کیا قبولِ اسلام کر دے۔ کھتری قوم کے پیشوا راضی ہو گئے۔ شمس تبریزؒ نے کہا کہ آنکھ بند کرو۔ ان کے ایسا کرتے ہی شمس تبریزؒ نے خدا سے دعا کی اور مرضی خدا وہ ندی ان کے پاس اودان کے سامنے آ گئی۔

اس طرح یہ قوم دامنِ اسلام کے آغوش میں آ گئی۔ حکیم شکیں احمد شمس کے اجداد اسی نو مسلم خاندان سے متعلق تھے۔ شمس تبریزؒ جو ایک عالم باعمل صوفی باوصف اور صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ ان کے جاہ و جلالِ علم و فضل اور کرامات کے بہت سے واقعات مشہور ہیں جن میں مندرجہ ذیل واقعہ کی تاریخی اور علمی حیثیت اظہارِ شمس ہے۔

مشہور بزرگ اور ولی کامل و صادق مولانا جلال الدین رومی دریائے دجلہ کے کنارے ایک مقام پر تصنیف و تالیف۔ غور و فکر اور خیالاتِ تصوف میں غلطاں و پچاں سیٹھے تھے کہ ناگاہ نظر کا ٹکراؤ ہوا اور اللہ والے ایک دوسرے کو پہچان گئے۔

مولانا جلال الدین رومی سے شمس تبریزؒ مخاطب ہوئے اور کہا ایسا بھی علم کیا اور عالم کیا جو کتابوں کا محتاج ہو۔ اور مولانا جلال الدین رومی کے ارد گرد پھیلی ہوئی کتب کو جو ایک ذخیرہ کی شکل میں تھیں بیک جنبشِ غرقِ دریا کر دیا۔ مولانا جلال الدین از حد فکر مند اور متحیر تھے کہ سارا علم و ذخیرہ دریا کی نظر ہو گیا۔ یہی کل کائنات اور اثاثہ زندگی تھا۔ مولانا کی اضطراری کیفیت اور پریشانی کو دیکھتے ہوئے حضرت شمس تبریزؒ نے دریائے دجلہ میں ہاتھ ڈالا اور غرق شدہ کتب مولانا کی خدمت میں حسبِ سابق پیش کر دیں۔ تب یہ شعر نذر کیا۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم  
تا غلامِ شمس تبریزی نہ شد

خاندان :-

حکیم شکیں احمد شمس کے اجداد ہندوپاک پر مشتمل پنجاب کے کچھ اضلاع میں مقیم



ایک غیر مسلم طبقہ پر مشتمل تھے۔ یہ طبقہ نو مسلمین میں شمار ہوتا تھا اور حضرت شمس تبریزی کے ہاتھوں مشرف باسلام ہوا۔ تاریخی واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس طبقہ کے افراد حسب معمول کسی ندی میں نہانے جا رہے تھے۔ راستہ میں شمس تبریزی نے ان کو دعوت اسلام دی اور کہا اگر گنگا یا ندی اسی مقام پر منگادیں تو کیا قبول اسلام یہ طبقہ کرے گا۔ شمس تبریزی جن سے اس کے قبل حیران کن واقعات ظہور میں آچکے تھے۔ انھوں نے وعدہ کے بموجب وہ ندی اسی مقام پر نلک جھپکتے ہی جاری و ساری کر دی۔ ان نو مسلمین نے حضرت شمس تبریزی کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔

## پیدائش :-

شکیل احمد یوپی کی مشہور ریاست رام پور کے محلہ گھیر مردان خاں کے ایک تاجر گھرانہ میں ۲ جولائی ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد حاجی حبیب احمد حسب دستور پیشہ تجارت سے منسلک تھے ان کے نانا مولوی منور علی محدث کا شمار مشہور علماء میں ہوتا تھا۔

## تعلیم و تربیت :-

بچپن کے ابتدائی اسباق اپنے نانا منور علی سے حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کی تکمیل مدرسہ عالیہ رام پور و جو رام پور میں ایک نمایاں و قدیمی مرکز علم و ادب ہے سے کی۔ بعد فراغت مدرسہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کر کے حصول طب کے لئے لکھنؤ کا سفر کیا۔ اور طب کی مشہور طبی درس گاہ تکمیل الطب طبیہ کالج میں عوام الناس کی خدمت کرنے کے لئے طب کی تعلیم میں داخلہ لیا۔ ایسے وقت میں سرزمین لکھنؤ پر خاندان عزیزی کے روشن ستاروں شفاء الملک حکیم عبدالحمید شفاء الملک حکیم عبدالمتعبد شفاء الملک حکیم عبدالحمید کا ڈنکان بج رہا تھا۔ شکیل احمد شمس نے مذکورہ بالا صاحب علم و ادب سے نہ صرف فیضان حاصل کیا بلکہ تکمیل الطب کالج کے ماہرین اساتذہ سے استفادہ حاصل کیا۔ شکیل احمد شمس کا طالب علمی کا زمانہ لکھنؤ کا بہترین طبی زمانہ تھا۔ آپ نے نہ صرف طب کی تعلیم حاصل کی

بلکہ لکھنؤ کی علمی و ادبی صحبتوں سے فیضیاب ہو کر شعر و ادب کی جانب بھی مائل ہوئے اور اس شوق کو جلا حاصل ہوئی۔ تکمیل الطب کالج سے طبیب ماہر اور انڈین میڈیسن بورڈ سے ڈی۔ آئی۔ ایم ایس کی اسناد حاصل کیں۔ آپ کا شمار تکمیل الطب کالج کے قابل فخر فرزندوں میں ہوتا تھا۔ تکمیل الطب کالج سے فراغت کے بعد ۱۹۴۳ء میں اپنے آبائی وطن رام پور میں خدمت کی غرض و عنایت سے مطب و دوا خانہ قائم کیا۔ ۱۹۴۲ء میں اپنے استاد محترم اور مربی شفاء الملک حکیم عبدالمتعب کی دعوت پر مادر علمی طب تکمیل الطب طبیہ کالج میں بحیثیت استاد کے مقرر ہوئے۔ کالج میں آپ کے لئے کوئی مخصوص مضمون درس کے لئے نہ تھا۔ آپ کو جو بھی مضمون پڑھانے کے لئے دیا جاتا تھا آپ نے اس کو بحسن و خوبی پڑھایا۔ آپ کے پڑھائے ہوئے اسباق کو طلباء تکمیل الطب کالج طبیہ کالج دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ آپ نے اس کالج میں علم شریح۔ تو کبھی علم کیمیا۔ کبھی علم الولادت اور کبھی معالجات جیسے مضامین پڑھائے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ طبی علوم میں دسترس رکھتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں تکمیل الطب کالج کے پرنسپل حکیم عبدالحسین کے اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلے جانے پر پرنسپل کے عہدہ جلیلہ پر کام شروع کیا۔ ۱۹۶۵ء میں اپنی ہی مادر علمی سے بحیثیت پرنسپل سبکدوش ہو گئے۔

دورانِ ملازمت آپ کو طبیہ کالج کشمیر نیر دہلی طبیہ کالج میں پرنسپل کے عہدہ کی پیش کش ہوئی۔ لیکن آپ نے اپنے مادر علمی تکمیل الطب کالج کو چھوڑنا پسند نہیں کیا۔ تکمیل الطب کالج سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد مینجنگ باڈی نے آپ کو کالج کے سیکریٹری جیسے اہم عہدہ پر مقرر کر دیا۔ انھوں نے اپنے مختلف ادوار میں ادارہ کی تاریخی روایات کا پورا لحاظ رکھا۔ حکیم شکیل احمد شمسی کے دور میں تکمیل الطب طبیہ کالج نے نمایاں ترقی کی۔

آپ تکمیل الطب کالج اور خاندانِ عزیزی کی طبی تحریک کے پیروکار کی حیثیت سے سے نہ صرف یوپی بلکہ پورے ہندوستان میں پہچانے جانے لگے۔ طبی تحریکات سے شکیل احمد شمسی کو ابتدا سے ہی تعلق رہا۔ انجمن طبیہ یوپی اور اس کے بعد آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس میں انھوں نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ وہ برسوں یونانی طبی کانفرنس

صوبہ یوپی کے صدر رہے اور آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کے سینئر نائب صدر کی حیثیت سے مختلف اہم اور نازک مرحلوں پر انھوں نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ طبّی کانفرنس کے عام جلسوں اور اس کی مجلسِ عاملہ کی نشستوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن کے قیام کے بعد وہ اس کی پہلی کونسل کے ممبر مقرر ہوئے۔ سنٹرل کونسل آف ریسرچ ان یونانی میڈیسن کی متعدد سب کمیٹیوں کے ممبر تھے۔

ہندوستان کے بیشتر طبّیہ کالجوں سے کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ تھے اور حکومت ان کے وسیع تعلیمی تجربات سے استفادہ اٹھاتی تھی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالعلیم مرحوم نے ان کو جب طبّیہ کالج علی گڑھ کو بلانا چاہا اور اسی طرح ۱۹۵۵ء میں کرنل بشیر حسین زیدی نے طبّیہ کالج بورڈ دہلی کے جب وہ چیئرمین تھے ان کو پرنسپل کی حیثیت سے بلانا چاہا تو حکیم شکیل احمد شمسی نے لکھنؤ اور ماہرِ علمی صرف اس لئے نہیں چھوڑانا پسند کیا کیونکہ وہاں لکھنؤ کی علمی و ادبی محافل کا فقدان تھا۔

## تصانیف :-

ان کے زیرِ ادارت کئی برس تک تکمیل الطب کالج کامیگزین بطور ماہانہ شائع ہوتا رہا۔ ان میگزینوں کے کئی دقیق نمبر شائع ہوئے تھے اور درودِ خصوصی پیش کش حمیات حصہ اول و دوم نیز بحران پر بھی نمبر نکالے۔

طبّی تصانیف میں حمیات بحران کے ساتھ ایک مختصر رسالہ کتابی شکل میں طبّی کیمیا کے نام سے تحریر کیا تھا ان کی سب سے نمایاں کتاب کتاب الولادت ہے جو آج بھی طبّیہ کالجوں کے درسیات میں مفید خیال کی جاتی ہے۔ اس کتاب کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ سہ ایڈیشن میں طبّیہ جدید کے ساتھ طبّیہ قدیم سے بحث کی گئی ہے۔ مذکورہ بالا کتب کا طبّی دنیا میں بلند معیار ہے۔ حکیم شکیل احمد شمسی صاحب کی شخصیت بحیثیت ایک طبیب کے زیادہ مستحکم ہے۔ لیکن آپ ادب میں بھی ایک بلند مقام کے حامل ہیں۔ آپ نے حج جیسا مقدس و بابرکت

فریضہ ۱۹۶۹ء میں ادا کیا۔ واپسی کے بعد آپ نے اپنا سفرنامہ حج جس کو متعدد اہل قلم پہلے ہی سپرد قلم کر چکے تھے لیکن حکیم شمسٹی کے سفرنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اردو تاریخ میں یہ پہلا سفرنامہ حج ہے جو ہوائی جہاز سے کیا گیا تھا اور اس کے تاثرات قلمبند کئے گئے ہیں۔

حکیم شکیل احمد شمسٹی کا یہ سفرنامہ ”ارض حرم تک“ کے نام سے ۱۹۶۹ء میں چھپا تھا۔ حکیم صاحب شمسٹی نے کتنے اچھے پیرایہ میں کہا ہے سے

الہجی ہوئی یادوں کے صنم لے کے چلے ہیں  
آشفقت خیالات کی شوریدہ سری بھی  
کچھ چاک گریباں نئے رنگ جنوں میں  
جلتا ہوا احساس ہے بہکا ہوا دل ہے  
کبسا رو فلک جس کے سزاوار نہ ٹھہرے  
ناگفتہ خلش بھی ہے مسرت کے جلو میں  
آنکھوں سے پھلکتے ہوئے تقدیر کے ٹکڑے  
اک انجمن ناز سے آیا ہے بلا و ا

دیوانے یہ کیا سوئے حرم لے کے چلے ہیں  
جذب نگہ ناز یہ خم لے کے چلے ہیں  
کیا جانے کہاں دیدہ نم لے کے چلے ہیں  
الہجے ہوئے حالات کے غم لے کے چلے ہیں  
وہ بارگراں دیکھئے ہم لے کے چلے ہیں  
اب کشمکش نیتناہ غم لے کے چلے ہیں  
ہم تیرے تغافل کی قسم لے کے چلے ہیں  
پھر ذوق نظار اس کے قدم لے کے چلے ہیں

ہم گامزن منزل جاناں ہیں جو شمسٹی

سامان خرد ساتھ میں کم لے کے چلے ہیں

مندرجہ بالا اشعار آپ نے حج کے موقع کے لئے کہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ

متعدد عمرے بھی ادا کئے تھے۔

شعر و شاعری :-

حکیم شکیل احمد کا تخلص شمسٹی تھا۔ ان کی آخری تصنیف ان کا شعری مجموعہ کلام جو قید حیات و بند غم کے نام سے ۱۹۸۵ء میں زیور طباعت سے مرتب ہوا سفرنامہ حج ”ارض حرم تک“ اور شعری مجموعہ کلام ”قید حیات و بند غم“ ہندوستان کے مشہور اردو کتب کے ناشر نسیم بک ڈپو کے مالک نسیم انہونومی نے ریو سینکڑوں اصلاحی۔ سماجی۔ معاشرتی نیر ادبی ناویوں کے نہ صرف مصنف ہیں بلکہ ناشر بھی ہیں طبع

کرائی ہیں۔  
 حکیم شکیل احمد شمس نے غزلوں کے اس مجموعہ کا انتساب اپنی دیرینہ مطب کی  
 ساتھی مس نسیم کے نام کیا ہے جو نہ صرف حکیم شمس کی رفیق رہیں بلکہ آخر عمر تک  
 شریک مطب رہیں۔  
 حکیم شمس نے اپنے اس مجموعہ کے انتساب کو مندرجہ ذیل اشعار سے مزین  
 کیا ہے۔

شعروں کو حسن دے کے غزل کو سنوار کے  
 فکر و نظر میں رنگ محبت نکھار کے  
 خود چل دیے تو مر گئے نغمے بہار کے  
 سم رہ گئے متاع سخن تک بھی بار کے

حکیم شمس کا فطری رجحان اگر فنون لطیفہ شعر و ادب، فلسفہ اور ماورائیات میں تھا  
 تو علاج و معالجہ، مطالعہ، طبی و ادبی نوشت و خواندہ محفل آرائی اور خلوت گزینی  
 ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اگر ایک جانب مفکر تھے تو دوسری جانب عظیم شاعر بھی تھے۔  
 حکیم شکیل احمد شمس اپنی عملی مصروفیات کے باعث ہی نہیں بلکہ طبعاً بھی وہ  
 تمام شعرا کی طرح عوامی مشاعروں میں بھی شرکت کرنا پسند نہ فرماتے۔ صرف  
 چیدہ چیدہ محافل شعر و سخن ہی میں اپنے افکار کو اشعار و غزلوں کی شکل میں  
 پیش کرتے اور وافر داد پاتے۔ مشاہیر شعراء، حکیم شمس صاحب کے کلام کو سن کر  
 دنگ رہ جاتے تھے۔ خود حکیم صاحب کے گھر پر برابر شعری نشستیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔  
 مندرجہ ذیل کلام جوان کے جذبات و خیالات کے آئینہ ہیں۔ اندازہ ہو گا کہ حکیم شمس  
 کتنے پائے کے شاعر تھے۔

نہ بزم شوق میں بلچل نہ ولولوں پہ شباب  
 پڑی ہے موت کے چہرے پہ زندگی کی نقاب  
 کہاں سے کیجئے ابام زندگی کا حساب  
 پلٹ گیا ہے ورق بند ہو گئی ہے کتاب

سراب صبح بنا رس فریبِ شام اودھ  
وہ آفتاب کا دھوکا یہ فتنہ مہتاب

تمھاری چشمِ تغافل کی بے رُخی کی قسم  
جہاں پہ چھوڑ گئے تھے ابھی وہیں ہیں ہم  
ہمارے شہرِ نگاراں کا ہے یہ کیا عالم  
بھی بھی ہے محبت تھکے تھکے ہیں قدم

چاہتا ہوں کہ پھر افسانہ دل دہراؤں  
ہو اجازت تو سرِ عام تجھے لے آؤں  
ابھی راہوں میں حرم بھی ہیں صنم خانے بھی  
ان مقاموں سے گذر جاؤں تو منزل پاؤں

جذبات کا اظہار اگر حرکات میں ہو تو رقص۔ رنگ و خطوط میں ہو تو مصوری۔ آواز  
و آہنگ میں ہو تو موسیقی اور الفاظ میں ہو تو شاعری کا نام دیا جاتا ہے۔ حکیم شکیل احمد  
شمسی نے جذبات کا اظہار اپنے احساسات و جذبات کی ترجمانی الفاظ یعنی شعر و شاعری  
میں کی ہے۔

انسان کے ذاتی خیالات و احساسات و جذبات کو جب کوئی ٹھیس لگتی ہے یا جب  
وہ عمل رد عمل شکست۔ مزاحمت۔ سپر اندازی اور ٹکراؤ کی کیفیات سے دوچار ہوتا ہے  
تب یہی عناصر مل کر شعر و نغمہ کا روپ لے لیتے ہیں۔ اشعار گنگنا کر رہا ہے میں موجود  
خلش کی تسکین کرتا ہے۔ دل کی آگ کو ٹھنڈا بھی کرتا ہے تو کوئی بھڑکانا بھی ہے۔ کبھی  
سہر چوٹ پر تلہا کر لاف زنی کرتا ہے تو کبھی ٹوٹ کر اور بکھر کر رہ جاتا ہے تو کبھی کرب  
والم کی لذت کوشی کرتا ہے۔ اس کی غرض تو آسودگی سے ہے۔ حکیم شمس نے بھی اپنے  
جذبات کی تسکین شعر و شاعری میں کی ہے۔

ان کی شاعری میں غمِ ماضی۔ غمِ دوراں۔ غمِ عشق کی جو جھلک بشکل آپ بیتی ہے وہ

جگ بتی معلوم ہوتی ہے۔ ع

(۴)  
جنون عشق میں بے چارگی ایسی بھی ہوتی ہے  
کہ آنکھیں خشک ہوتی ہیں مگر ہر چیز روتی ہے  
تماشا میں ہمارے دل کے ہنگاموں کی راتیں بھی  
محبت جاگتی رہتی ہے اور تقدیر موتی ہے

(۵)  
عشق کے غم نہ چھپے لاکھ چھپانا چاہا  
لب کو روکا تو نگاہوں نے بتانا چاہا  
دل سے کچھ بن نہ پڑا اُن کو بھلانا چاہا  
اُن کی یادوں نے مگر خود ہی نہ جانا چاہا

پھر ایک غزل میں کہتے ہیں۔

بجھا دوں کس طرح تیرے تصور کے چراغوں کو  
خدا جانے کہاں کب زندگی کی شام ہو جائے

شعرو شاعری کے ذوق کے علاوہ حکیم صاحب اُردو کے بہترین ادیب و خطیب  
مصنف اور صحافی بھی رہے اور ایک مدت تک رسالہ تکمیل الطب کے مدیر رہے۔  
حکیم شکیل احمد شمسٹی کو سیاست سے گہری دلچسپی تھی تاہم خود کبھی کسی قسم کی سیاست  
میں نہیں الجھے اور نہ کبھی کسی سیاسی پارٹی کے نظریات کو قبول کیا۔ طبی سیاست پر  
گہری نظر ضرور رہی لیکن گھٹیا قسم کی سیاسی حرکتوں سے اپنے کو آزاد اور پاک  
رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ طبی دنیا کے ہر طبقہ فکر و عمل کے لوگوں میں وہ احترام کی نظر سے  
دیکھے جاتے رہے اور ان کے غیر جانبدارانہ مشورہ اور خیالات کی قدر سب ہی لوگ  
کرتے۔ طبی تنظیموں اور اداروں کی نمائندگی کی پیش کش کو تو بخوبی قبول فرماتے لیکن  
کسی منصب کے لئے الیکشن نہیں لڑے۔ اپنی شخصیت کو متنازعہ نہیں بننے دیا مختلف  
اداروں کے لکھنؤ میں صدر سکریٹری یا نائب صدر بھی رہے۔

حکیم شکیل احمد شمسٹی کو مطالعہ کا شوق حد درجہ تھا۔ کم سے کم دو گھنٹہ اس عظیم الفرستی  
میں بھی مطالعہ ضرور کرتے تھے۔ اخبار کا مطالعہ ان کی عادت میں شامل تھا۔ اس ذوق

کی تسکین کے لئے اپنا کتب خانہ بھی تھا جس میں مختلف موضوعات کی کتب بشمول طب۔ مذہب تاریخ ادب۔ مختلف زبانوں کی لغات رسائل پر مشتمل تھا۔ ان کتب کی تعداد ہزاروں میں ہے۔

غرض حکیم شمسی عظیم شاعر و مفکر اور ادیب ہی نہیں بلکہ عالم دین بھی تھے۔ مذہبی معاملات میں بڑی عالمانہ بحث و تقریر فرماتے تھے۔ ان کے ایسے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے جن میں مذہبی مسائل پر علمی بحث ہوتی تھی۔

اس سلسلہ میں مولانا منظور نعمانی مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب سے اکثر نسبت ہوا کرتی تھی۔

## پسماندگان :-

حکیم شکیل احمد شمسی کے ۳ صاحبزادے مظفر اقبال شمسی جو وکیل ہیں۔ عقیل احمد شمسی جو سعودی عرب میں بسلسلہ ملازمت مقیم ہیں اور طارق شکیل شمسی کے علاوہ ۳ دختران عذرا۔ طلعت اور صبیحہ ہیں۔ ایک ڈاکٹر اکمل شمسی کو نسوب ہیں دو دوہری محکمہ عدلیہ کے جج فضل الباری کو بیابھی ہیں۔

حکیم شکیل کا مطب قلب شہر میں شفا محل عبدالعزیز روڈ پر واقع تھا۔

## وفات :-

۱۲ نومبر ۱۹۸۵ء کو بوقت ۳ بجے سہ پہر لکھنؤ کے کارڈیالوجی سینٹر میں زار و مفارقت دے گئے۔

حکیم شکیل احمد شمسی کے انتقال پر ملال پر متعدد شعرا نے نذرانہ نصیدت پیش کیا لیکن حکیم ظل الرحمن آرگنائزنگ سکریٹری آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس نے حکیم شمسی کے لئے جن جذبات کا اظہار مندرجہ ذیل اشعار میں کیا ہے وہ نہ صرف ان کے بلکہ تمام اطباء کے جذبات کی ترجمانی ہے۔

آہ حکیم شکیل احمد شمسی

زندگی کون سا موڑ ہے یہ جہاں میرے قدموں کی رفتار تھم سی گئی



کوئی شمع سر رہ گذر بھی نہیں  
 میرے ذوقِ طلب میں کمی آگئی  
 وہ نقوشِ قدم ہیں نہ زلفوں کے تم  
 کوئی ایسا نہیں جو مری انجمن  
 آج پھر ایک خبر موت کی ساقیا  
 مسکراتے لبوں کی ہنسی لے گئی  
 پتے پتے کوئی بادہ کش ہو گیا  
 زندگی موت کی میزبان بن گئی  
 کتنے چہروں کی صبحوں کو کھلا گئی  
 کتنی کلیاں امیدوں کی کھلا گئیں  
 ایک غم ایک خلش ایک چھین دے گئی

کوئی رہبر کوئی نقش پا بھی نہیں  
 جانے کیا ان کی ویرانیوں نے کہا  
 زندگی کون سا موڑ ہے یہ جہاں  
 راہ و پیمان سے کس کو آواز دوں  
 غبارِ اوفس کی شہتوں سے روشن کرے  
 ایک غم ایک خلش ایک چھین دے گئی  
 گاتے گاتے غزل کوئی چپ ہو گیا  
 بزم کی خامشی داستاں بن گئی  
 آج پھر ایک خبر موت کی ساقیا  
 کتنی آنکھوں میں ویرانیاں چھا گئیں  
 آج ایک خبر موت کی ساقیا

مسکراتے لبوں کی ہنسی لے گئی  
 آج کم خواب آنکھوں کو نیند آگئی  
 زندگی گوشہ عافیت پا گئی

